اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ
ارمغانِ ابتسام
جولائی ۲۰۱۶ء تا ستمبر ۲۰۱۶ء
مُدیر:
نوید ظفر کیانی

آنکھوں میں سفیدی

ایک مرتبہ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے عرض کیا "میرے خاوند آپ کو بلا رہے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "تمہارے خاوند کون؟ وہی جس کی آنکھ میں سفیدی ہے؟" وہ رضی اللہ عنہا کہنے لگی "اللہ کی قسم! اس کی آنکھ میں کوئی سفیدی نہیں" فرمایا "کیوں نہیں، تمہارے خاوند کی آنکھ میں سفیدی ہے" ام ایمن رضی اللہ عنہا پھر کہنے لگی "اللہ کی قسم! نہیں ہے" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر شخص کی آنکھ میں سفیدی ہوتی ہے"۔

یعنی ہر انسان کی کی آنکھ میں کچھ حصہ سفیدی کا ہوتا ہے اور کچھ میں سیاہی ہوتی ہے، مگر وہ عورت سمجھی کہ اس سے مراد آنکھ کا خراب ہونا ہے۔

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اکتوبر ۲۰۱۶ء تا دسمبر ۲۰۱۶ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

روبینہ شاہین

محمد امین

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری) موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سکین نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں کہاں

غزلیات

قسطور قسط

سفر وسیلۂ ظفر

ولائتی زعفران

چوکے ھی چوکے

مزاحیے

انشائیہ

قلم اور کالم

نظمالوجی

کتابی چہرے

سہ ماہی کی کتاب

لمرک

جستہ جستہ

عظیم خواجہ، خادم حسین مجاہد، سیّد عارف مصطفٰی وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں، قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارہ ہٰذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

کوئی دور تھا جب سب کچھ ہی نیشنل تھا، ٹی وی سے لے کر سب اداروں سمیت سبھی تہوار بھی نیشنل محسوس ہوتے تھے، ایک ہی ٹی وی جو کہ عام حالات سے لے کر خاص حالات میں بھی تلاوت کلام پاک سے شروع ہو کر فرمان الٰہی پر اختتام پذیر ہوتا تھا، رمضان جیسے مقدس مہینے میں تو مزید پاکیزگی کی چادر اوڑھ لیتا تھا۔ چینل کو گھمانے والی ایک پھرکی جو گھمانے پر عجیب سی آواز دیتی ایک سوال بھی ذہنوں میں چھوڑ جاتی تھی کہ جب ایک ہی چینل کی نشریات آتی ہیں تو پھر اسے بارہ دفعہ گھمانے کا کیا فائدہ لیکن اس پھرکی میں جو شیطان قید تھے وہ سب کے سب آزاد ہو گئے۔

وہ مقدس مہینہ جب شیطان کو قید کرنے کی نوید سنائی گئی ہے اس مقدس مہینے میں کسی نہ کسی حوالے سے متنازعہ ”شیطونگڑے“ اپنی اپنی دوکانداری مختلف چینلز پر سجا کر بیٹھ جاتے ہیں اور تو اور نیشنل ٹی وی بھی اب مقابلے کی اس ”اڈاری“ میں شامل ہو گیا ہے۔ ان رمضان نشریات میں رنگین آنچلوں سے لے کر عجیب و غریب مقابلوں تک سب کچھ نظر آتا ہے اگر کچھ نظر نہیں آتا تو وہ رمضان المبارک کی پاکیزگی ہے۔

ڈاکٹر بھائی کے ”فرمودات“ سے لے کر مایا خان کی ”اداکاری“ جے جے کا ”بھولپن“، جگن کی ”ریاکاری“ بادامی کی ”اداکاری“ لودھی کی ”شاہ رخی“ سمیت بہت سے نئے پرانے ”کاریگر“ اپنا اپنا ”سودا“ ان چینلز پر سجے رمضان بازاروں میں بیچنے آ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ندیم جعفری جیسے ”پاپ“ سنگر بھی ایک اسلامی تاریخی پروگرام کی میزبانی کرتے پائے جا رہے ہیں جس میں وہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ اسلامی تاریخ پر عبور حاصل کرتے جا رہے ہیں جبکہ ان کے بار بار اٹکنے پر بیچارا مہمان بار بار ان کی تاریخ ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

پیمرا کے ایک ڈرامہ ”اڈاری“ پر نوٹس لینے کا فائدہ جب رمضان المبارک کے مقدس نام پر ”اڈاریوں“ کا سلسلہ جاری ہے اور ایک بڑے چینل کی ”اڈاری“ پر تو تمام تر ثبوتوں کے باوجود پیمرا نوٹس لینے کے باوجود پابندی نہیں لگا سکا۔ شیطان مردود تو ہر رمضان المبارک ضرور پابند سلاسل ہوتا ہے لیکن یہ جو ہمارے دنیاوی شیطونگڑے ہیں، ان کو شائد پابند کرنا اب پیمرا کے بس کی بھی بات نہیں۔

ڈاکٹر بھائی پیمرا کی لگائی جانے والی تین روزہ پابندی کیسے برداشت کر سکتے تھے ابھی تو انہوں ستائیسویں شب کی خصوصی نشریات میں بغیر عینک کے شرکت کر کے اپنی آنکھوں سے لگی آنسوؤں کی ”جھڑیوں“ کو کیمرے کے کلوز میں دکھانا ہے ابھی تو انہوں نے اپنے چینل پر سجائے گئے میلے کو تمام چینلز سے ریٹنگ کی دوڑ میں ایک نمبر دلوانا ہے۔

”باباجی“ فرماتے ہیں ” افسوس صد افسوس، خدا اور بندے کے انتہائی رازداری کے لمحات کو بھی ہم نے روشنیوں، کیمروں اور ریٹنگ کے حوالے کر دیا ہے“۔

کے ایم خالد

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

کسی فلسفی نے کہا تھا کہ خالی گھر میں بھوتوں، چڑیلوں اور مافوق الفطرت عناصر کا بسیرا ہوتا ہے۔اس قسم کے گھر میں آسیب اور چھل پیری کی ریشہ دوانیاں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ انسانیت کو ناقابل اندمال صدمات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کئی غاصب اور مبہم جو عناصر خانۂ خالی کو دیکھ کر اس پر دھاوا بول دیتے ہیں اور اپنے مفادات کے لیے سب کچھ داؤ پر لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔بس ایک ہی تمنا ان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح خانۂ خالی پر اپنا تسلط قائم کر لیا جائے۔فارسی کی ایک مثل ہے کہ ''خانۂ خالی را دیومی گیرد'' اس پر اب ہر شخص کو یقین ہو چلا ہے۔جس کا عقل کا خانہ خالی ہو وہ بھی کسی نہ کسی خانے کو ہتھیانے، اس پر قبضہ جمانے اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر اپنی دھاک بٹھانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں دکھائی دیتا ہے۔اپنا خالی خانہ بھرنے کے لیے مجبوروں کا خانہ خراب کرنا تو ظالم و سفاک، موذی و مکار استحصالی عناصر کا وتیرہ بن چکا ہے۔مسلسل شکست دل سے اس قدر بے حسی بڑھ گئی ہے کہ سکوں ہی عنقا ہو گیا ہے۔آج کا دور اپنے لیے خانہ بر انداز چمن کی تلاش میں ہے۔اس کارخانۂ قدرت میں کار جہاں اس قدر دراز ہے کہ اس میں الجھ کر انسان اطمینان اور راحت کے حصول کی تمنا میں سرگرداں ہے مگر دہر میں اسے کہیں بھی آسودگی نہیں ملتی۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خانۂ خالی آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ بن گیا ہے۔یہ تمام مسائل کی جڑ ہے۔قبضہ گروپ، انڈر ورلڈ، استحصالی مافیا اور ہوس جاہ و منصب سے مغلوب درندوں نے خانماں برباد انسانوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں ان کے تصور سے نہ صرف رونگٹے بلکہ کان بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔یہ بات طے ہے کہ خرگوش اور خودغرض بھی اپنے کان ہلا ہلا کر مگس رانی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔کئی خان جاناں آج بھی گل کی صباحت اور آرزو کی آرزو میں ہلکان ہوتے پھرتے ہیں۔ان کو امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی امنگوں کا چمن شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔ان کا مہمان خانہ اس قدر خالی ہو گیا ہے کہ اس کے در و دیوار سے حسرت و یاس ٹپک رہی ہے۔ایام گزشتہ کی لٹی محفلوں کی دھول سے ان کا چہرہ دھندلا گیا ہے مگر ان کی سوچ کا خانہ اب بھی اپنی تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرنے میں مصروف ہے۔کئی چرب ساز، خفاش منش، بگلا بھگت اور

جو فروش گندم نما متقفی ہر وقت کسی نہ کسی کا خانہ اپنی غاصبانہ دستبرد سے تلپٹ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوتے ہیں۔اس کے برعکس تصوف کے پیروکار ہر خانے میں توحید کے جلوے دیکھ لیتے ہیں۔ عشق حقیقی کا یہ ارفع معیار نہاں خانہ دل کی تطہیر و تنویر کے امکاں کو یقینی بنا دیتا ہے اور زندگی کی حقیقی معنویت کا احساس اجاگر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

ہر حساس دل کے اندر بھی ایک خاص خانہ ہوتا ہے اس خانے میں کسی کی حسین یادیں رچ بس جاتی ہیں۔محبت کرنے والے اسی خانے کی تعمیر و تزئین پر توجہ دیتے ہیں کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر یہ خانہ مکیں کے لیے شان شان انداز میں تیار واستوار کیا جائے تو مکیں ک اس میں بڑی عجلت کے ساتھ آ کر رین بسیرا کرے گا۔اس کے علاوہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خانہ دل کا مکیں اس کو خالی کر کے اجنبی منزلوں کی جانب رخت سفر باندھ لیتا ہے۔رفتگاں کی یاد کا دکھ اس عبرت سرائے دہر میں پیمان وفا باندھنے والوں کیلئے سوہان روح بن جاتا ہے۔ایسے حادثے کبھی پلک جھپکتے میں نہیں ہوتے بلکہ وقت سالہا سال ان کی نمو کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔دل کی ویرانی کا اب کیا مذکور ہے۔زندگی کا سفر تو جیسے تیسے کٹ ہی جاتا ہے مگر خانہ دل کی ویرانی روح کو زخم زخم اور دل کو کرچی کرچی کر دیتی ہے۔جب دکھی انسان کرچیوں میں بٹ جاتا ہے تو نالہ، فریاد، آہ اور زاری کا جو اعصاب شکن مرحلہ آتا ہے وہ حد درجہ لرزہ خیز ہوتا ہے۔خانہ دل میں ایک کہرام مچ جاتا ہے۔

شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں زندگی کی اقدار عالیہ کو شدید ضعف پہنچا ہے۔وقت کے ایسے حادثات سامنے آ رہے ہیں کہ انھیں کوئی نام دینا بھی ممکن نہیں۔اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہو گا کہ جامۂ ابو جہل میں ملبوس فاتر العقل، مخبوط الحواس، کندہ ناتراش اور مشکوک نسب کا ابلہ بھی روقیت کا داعی بن کر اپنی جہالت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ایسے آستین کے سانپ بھی معاشرے میں عام ہیں جو دوستی کا سوانگ رچا کر رتیں بے ثمر، کلیاں شرر، آہیں بے اثر اور زندگیاں پر خطر کر دیتے ہیں، وہی کردار کرتے ہیں جو برادران یوسف نے کیا تھا۔ایسے نام نہاد رفیق کار جو مجبوروں اور سادہ لوح انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو اہل کوفہ کی روایتی پیمان شکنی کی یاد دلاتا ہے۔ایسے دوست تو دشمن سے بھی زیادہ تباہ کن اور ہولناک کردار ادا کرتے ہیں۔انسانیت کی توہین، تذلیل، تضحیک اور بے توقیری کرنے والے ایسے ننگ انسانیت بے ضمیروں کو معاشرتی زندگی کا ایک ایسا فتنہ سمجھا جاتا ہے جس نے کذب وافترا اور کینہ پروری کے باعث آدمیت کو گہرے چرکے لگائے ہیں۔ان کی خباثت اور قبیح کردار کی وجہ سے امیدوں کی فصل غارت ہو جاتی ہے اور صبح و شام کی محنت اکارت چلی جاتی ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم تھا
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

خانہ ایک ایسا لاحقہ ہے جو آن کی آن میں لفظ کو کثیر المعنویت کی وسیع وادیوں میں پہنچا دیتا ہے۔مثال کے طور پر عقوبت خانہ، قحبہ خانہ، چنڈو خانہ، شراب خانہ، مے خانہ، صنم خانہ، نقار خانہ، بت خانہ، غریب خانہ، پاگل خانہ، دوا خانہ، خم خانہ، عزا خانہ، کتب خانہ، جیل خانہ اور مرغی خانہ وغیرہ۔ہم دیکھتے ہیں کہ خانہ کو جو تکثیریت حاصل ہے وہ کسی اور لاحقے کی قسمت میں نہیں۔گندے جوہڑ کے نواح میں رہنے والا ایک سادیت پسند فلسفہ زدہ شخص (ناصف کھبال) کسی ذہنی عارضے میں مبتلا ہو گیا۔اسے کچھ عرصے کے لیے فاؤنٹین ہاؤس میں منتقل کیا گیا لیکن یار لوگوں کو تو ایک بہانہ چاہیے تھا اس کی تذلیل کا، جب وہ قدرے صحت یاب ہو کر واپس آیا تو ہر طرف سے یہ آواز آتی تھی کہ ناصف کھبال پاگل خانے کی یاترا کر کے واپس آیا ہے۔کم سن بچے اسے دیکھتے ہی پاگل اوئے۔۔۔پاگل ای اوئے۔۔۔کا نعرہ مستانہ لگاتے اور کندہ بھاگ جاتے۔ناصف کھبال قاپنی فلفیانہ موشگافیوں کے باوجود اپنی ذہنی صحت کے بارے میں اپنے حلقۂ احباب کو قائل نہ کر

سکا۔ وہ لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتا، آخر کار اسے مستقل طور پر خانہ زنجیر میں محبوس کر دیا گیا۔ اب تو اس کی تمام سرگرمیاں محض خانہ پری کی ایک صورت بن گئی ہیں۔ خانہ کو جو معنوی تنوع حاصل ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر جگہ خانہ کے معانی دھنک رنگ منظر نامہ پیش کرتے ہیں، ہر خانہ گنجینۂ معانی کا طلسم بن کر فکر و نظر کو مہمیز کر رہا ہے۔ خانہ گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھنے اور اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی ایک حیران کن صورت سامنے لاتا ہے۔ تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہوا کرتا ہے۔ ہم اپنے معاشرے کو مختلف خانوں میں بانٹ کر بہت بڑی کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وسائل کی بندر بانٹ نے عجب گل کھلائے ہیں۔ آج جاہ و منصب پر غاصبانہ طور پر قابض مافیا نے دستیاب وسائل کو اندھے کی ریوڑیوں کی طرح صرف اور صرف اپنوں ہی میں بانٹنے کا وتیرہ اپنا رکھا ہے۔ اغیار کے کاشانوں پر تو انعام و اکرام کی بارش ہو رہی مگر پیمان وفا باندھنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ ان حالات میں انسان ہجوم غم میں دل کو سنبھالنے کی سعیٔ ناکام کے باوجود پکار اٹھتا ہے۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خانہ اپنے تمام کروفر اور انداز حجابانہ کے باوجود معاشرتی زندگی میں اپنا جائز مقام حاصل نہیں کر سکا۔ خانہ کی رنگت در اصل خانہ ساز کی منشا اور نیت پر منحصر ہے۔ آپ جس خانے کو لے لیں وہاں طلسم ہوش ربا کی کیفیت جلوہ گر دیکھیں گے۔ ہر خانے کے اندر ایک جہان معانی آباد ہے۔ یہ دنیا ایک بت خانے کی صورت میں نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ ہمیں بتوں سے تو امیدیں ہیں مگر خدا سے نومیدی ہے اسی کا نام تو بے یقینی اور تشکیک ہے جو کہ غلامی سے بھی بدتر ہے۔ بت خانے میں بتوں کے ناز و انداز دیکھ کر کئی جذباتی لوگ ہوش و خرد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جب بت خانے کے جامد و ساکت بتوں کے ناز برداشت سے باہر ہو جائیں تو سینہ و دل حسرتوں سے چھا جاتا ہے اور ہجوم یاس میں دل گھبرا جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ

آج کے بے حس معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ حساس تخلیق کار کو جانداروں کے لرزہ خیز مسائل کا احوال سنگلاخ چٹانوں اور جامد بتوں کے سامنے بیان کرنا پڑتے ہیں۔ آج تو ریت کے گھروندے بنانے والوں نے اندھیر مچا رکھا ہے۔ صدیوں کے تحیر سے نڈھال فکر انسانی اس سے تڑپ اٹھتی ہے جب اس کے سامنے سد سکندری حائل ہو اور اس کو کاٹنے کے لیے تیشۂ زر کی احتیاج ہو۔ اس تمام صورت حال سے انتہائی ملول اور دل برداشتہ ہو کر وہ پکار اٹھتا ہے کہ وہ تو شیشے کے گھر میں براجمان ہے اس کا بسیرا ایک ایسے گلشن میں ہے جس میں زاغ و زغن اور بوم و شپر نے ہر شاخ کو دبوچ رکھا ہے۔ بقول سید جعفر طاہر

میں نے جو تیرے تصور میں تراشے تھے کبھی

لے گئے وہ بھی میرے گھر سے پجاری پتھر

ناز ہر بت کے اٹھا پائے نہ جعفر طاہر

چوم کر رکھ دیئے ہم نے یہ بھاری پتھر

اس وسیع و عریض عالم آب و گل کے تمام مظاہر دیکھ کر یہ گماں گزرتا ہے کہ یہ کائنات ابھی شاید نا تمام ہے۔ اس کے کئی خانے تو ابھی خالی ہیں۔ اس دنیا میں پائے جانے والے تضادات بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے خانوں میں بٹے ہوئے معاشرے کی وہ کیفیت ہے جو ہر لحظہ اور ہر آن ہمارے سر متضاد خانوں میں بٹ چکا ہے کہیں امیری ہے تو کہیں فقیری ہے۔ کہیں آمریت ہے تو کہیں جمہوریت کی داغ بیل دکھائی دیتی ہے۔ اپنے تمام تر تضادات ،ارتعاشات، بے رنگینیوں، بے ہنگم کیفیات اور کجیوں کے باوجود زندگی کا یہ ساز بھی عجب ساز ہے جو مسلسل بج رہا ہے مگر کسی کے کانو ں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ خالی خانے پر قبضہ ہو جانے کے بعد اسے واگزار کرانا تو اب دیوانے کا خواب بن گیا ہے۔ پولیس کے پاس خانہ تلاشی کے جو اختیارات ہیں، ان سے بعض اوقات ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے متعلقہ اہل کار اہل خانہ کو قیمتی سامان سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ یہاں عجیب افراط و تفریط کا عالم ہے۔ بے شمار خانے ہیں جن میں انسانیت کو بانٹ دیا گیا ہے۔ غریبی میں نام پیدا کرنے کی تمنا رکھنے والے اپنے اپنے جداگانہ خانوں میں

رہتے ہوئے بھی ایک انداز دلبرانہ اور شان استغنا سے کام لیتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں۔ بقول مجید امجد

تیرے فرقِ ناز پہ تاج ہے، میرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تیری داستاں بھی عظیم ہے میری داستاں بھی عظیم ہے

متعدد خانے ایسے بھی ہیں جو اپنی متنوع کیفیات کے باعث اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ یتیم خانوں ہی کو لے لیں جہاں ایک زمانے میں محض فاقہ کش کم سن بچوں کی اکثریت رہتی تھی اور ان کی کفالت مخیّر افراد کیا کرتے تھے۔ آج کے دور میں سیاسی یتیموں کی فوج ظفر موج ہر طرف دندناتی پھرتی ہے اور ان کی نمو اور نشو و ارتقا کی تمام ذمہ داری ووٹروں نے سنبھال رکھی ہے۔ تیسری دنیا کے ناخواندہ ووٹر سیاسی یتیموں کی رسد کو یقینی بنانے میں بڑے انہماک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب جاہ و منصب پر غاصبانہ قبضہ کرتے ہیں تو ہنستے بستے چمن کو کباڑ خانہ میں بدل دیتے ہیں، روم جل رہا ہوتا ہے اور وقت کے یہ نیرو دیپک راگ الاپ کر اپنے ذہنی افلاس کا ثبوت دیتے ہیں۔ تیسری دنیا کے غریب عوام جو غربت کی انتہائی سطح سے بھی نیچے زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہیں بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کے سلسلے میں ایسے لگتا ہے کہ وہ پتھر کے زمانے کے ماحول کے اسیر ہیں۔ ان کے شفاخانوں میں دوا، علاج اور شفا عنقا ہے۔ ان شفاخانوں کے صدر دراوزوں پر کتبہ سازوں کی دکانیں قائم ہیں۔ یہ کتبہ سازان عطائیوں کے پاس علاج کی غرض سے جانے والے مریضوں کی قبروں کے لیے کتبے تیار کرتے ہیں۔ ان عطائیوں کی وجہ سے موت کے سائے آبادیوں پر منڈلا رہے ہیں۔ اہلِ ہوس نے ہر سو دام بکھیرے ہیں۔ اِن عطائیوں کی وجہ سے یہ بے بس افراد زندگی کے خانے سے نکل کر قبر کے خانے میں تہہ ظلمات چلے جاتے ہیں۔

نہ مدعی نہ شکایت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

تیسری دنیا کے ممالک کے عوام کو سپر پاورز نے اپنی آہنی گرفت میں لینے کیلئے اُنہیں صبح و مسا قرض در قرض کی فکر میں الجھا رکھا ہے۔ ان کے گھروں کی دیواروں پر اداسی، مایوسی، محرومی، بے بسی، بے چارگی اور غربت و افلاس بال کھولے گریہ و زاری میں مصروف رہتی ہے۔ ان غریب ممالک کے نام نہاد حکمرانوں کو سپر طاقتیں اپنا خانہ زاد غلام تصور کرتی ہیں اور وہ ان بادشاہ گروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ قرض کی دلدل میں دھنسے تیسری دنیا کے غریب ممالک کے کٹھ پتلی حکمرانوں کی کور مغزی، بے بصری اور عاقبت نااندیشی نے ان ممالک کے بدقسمت اقوام کو اقوام عالم کی صف میں تماشا بنا دیا ہے۔ ان کی آزادی کی بے توقیری کا یہ عالم ہے کہ ان کے سر پر تو تاج ہے مگر ان کے پاؤں بیڑیوں سے فگار ہیں۔ واحسرتا کہ تیسری دنیا کے غریب ممالک کے بے بس ولاچار عوام تو ڈربہ نما جھونپڑوں پر مشتمل عقوبت خانوں میں زندہ درگور ہو گئے ہیں مگر ان ممالک کے مطلق العنان حکمران قیصر و کسریٰ جیسے ٹھاٹھ باٹھ سے اپنی عیاشیوں اور اللوں تللوں میں مصروف ہیں۔

گھریلو خواتین کی زندگی کا کوئی خانہ ایسا نہیں جو کہ خالی رہ جائے۔ خانہ داری کے جھنجھٹ ان کو ہمہ وقت الجھائے رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اگر کسی کو آٹے دال کا حقیقی بھاؤ معلوم ہے تو وہ خانہ دار خواتین ہیں۔ کمانے والے مرد اپنا پیٹ کاٹ کر ضروریات زندگی فراہم کرتے ہیں جب کہ خاتون خانہ تمام کھانے والوں کے لیے مزے مزے کے کھانے تیار کر کے لذت کام و دہن کا بھرپور اہتمام کرتی ہے۔ دراصل پیٹ بھی ایک خانہ ہی تو ہے جس کا خالی رہنا کسی کو گوارا ہے۔ اس دنیا کے تمام گورکھ دھندے اسی پیٹ کے خانے کی خالی جگہ پر کرنے کے لیے جاری و ساری ہیں۔ مطبخ یا باورچی خانہ اس کام کے لیے بہت مفید ہے، جہاں ہمہ وقت انواع و اقسام کے کھانے تیار ہوتے ہیں جن کی مہک سے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ آنتیں جو کہ قل ہو اللہ پڑھ رہی ہوتی ہیں وہ مطبخ سے من و سلویٰ کھا کر الحمدللہ کا ورد شروع کر دیتی ہیں۔ ایسے معجز نما کرشمے دیکھ کر قوت نامیہ کی افادیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ہمارے محلے میں پچھلے چند روز سے ایک بدخط شخص بڑے

بھونڈے انداز میں ہر گھر کے دروازے پر ایک الٹا سیدھا نمبر درج کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ لکھے موسا پڑھے خود آ۔ اس شخص سے جب نمبروں کے اندراج کے اجمال کی تفصیل دریافت کی تو وہ یوں گویا ہوا:

''اب ملک بھر میں خانہ شماری کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس کے بعد مردم شماری کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جب مردم شماری کا تمام کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا تو ووٹوں کے اندراج کا کام شروع ہو گا۔ جب ووٹر لسٹیں مکمل ہو جائیں گی تو ان پر اعتراضات طلب کیے جائیں گے۔ تمام اعتراضات دور کرنے کے بعد یہ ووٹر لسٹیں الیکشن کمیشن کے سپرد کر دی جائیں گی۔ اس کے بعد عام انتخاب ہوں گے اور پھر سلطانیِ جمہور کا زمانہ آ جائے گا۔''

پاس ہی بیٹھے ہوئے نتھو خان نے ٹوکتے ہوئے کہا ''جب جمہوری حکومت آئے گی تو اس کے ساتھ ہی اپنی ناکامی اور نامرادی کے واقعات بھی دہرائے گی۔ اس کے بعد فوری طور پر جمہوریت کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی اور آمریت کے طویل اور صبر آزما دور کا آغاز ہو جائے گا۔ یہی تیسری دنیا کے ممالک کا دستور ہے۔''

میں تو نتھو خان کو ایک جید جاہل سمجھتا تھا لیکن وہ تو رواقیت کے داعی بڑے بڑے نام نہاد دانش وروں سے بھی زیادہ ذکی الحس نکلا ایسے لوگ تو حالات کے نباض ہوتے ہیں۔ ان کی حساسیت کا خانہ تو اس قدر صداقت سے معمور ہے کہ ان کی فکری تونگری پر رشک آتا ہے۔ حبیب جالب نے کہا تھا:

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
وہی اہل وفا کی صورت حال
وارے نیارے ہیں بے ضمیروں کے

میں دیر تک سوچتا رہا کہ ان چھوٹے لوگوں کا دل کتنا بڑا اور سوچ کتنی گہری ہوتی ہے۔ یہی طبقہ اپنے خانۂ دل میں وطن اور اہل وطن کے لیے سچی محبت، خلوص اور دردمندی کے جذبات کی دولت فراواں لیے ہوتا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ وطن محض چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں یہ تو محبِ وطن لوگوں کے جسم اور روح سے عبارت ہے۔ کاش ہم میں نام نہاد خود ساختہ مدبرون کے بجائے اس قسم کے نتھو خان کثرت سے پیدا ہوں جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے سب کی آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سید ضمیر جعفری بے حساب یاد آئے انھوں نے کہا تھا:

بڑی مدت سے کوئی دیدہ ور پیدا نہیں ہوتا
جو ہوتا ہے مسلمانوں کے گھر پیدا نہیں ہوتا

خواتین کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ فیشن اور مغربی تہذیب کی نقالی میں وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ وہ خاتون جو پہلے چراغ خانہ ہوا کرتی تھی اب اسے شمعِ محفل بننے کا خبط ہو گیا ہے۔ اس رجحان کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ہمیں اپنی مٹی پر چلنے کا قرینہ بہ ہر حال سیکھنا ہو گا اگر ہم درآمد شدہ سنگ مرمر پر چلنے پر بہ ضدر ہے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہم پھسل کر منہ کے بل گریں گے اور ہماری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ اس کے بعد ان بھونڈی نقالی کرنے والوں کو خانہ بدوشوں کی طرح در بہ در اور خاک بہ سر جوتیاں چٹخانے کے علاوہ کچھ نہ سوجھے گا۔

جدید دور نے نگار خانے، قمار خانے، نقار خانے اور پتا نہیں کتنی تعداد میں اور خانے اختراع کر لیے ہیں۔ حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے نگار خانے بہت مرغوب ہیں۔ حسن پرست بھی جوق در جوق نگار خانوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رنگ خوشبو اور حسن و خوبی کے تمام استعارے مہ جبینوں کے خورشید جمال کے مرہون منت ہیں۔ ہر لو دینے والی شمع پر جل مرنے والے یہ پروانے اپنا سب کچھ حسن کے جلوؤں کی خاطر داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اور اس طرح ان کے خانماں برباد رہنے کی داستان اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ غربت، افلاس اور بے روزگاری نے قمار خانوں کی چکا چوند کو ماند کر دیا ہے۔ میں نے بارہا کوشش کی ہے کہ اہل درد کو تمام واقعات کے بارے میں کھل کر بتاؤں مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

سید عارف مصطفیٰ

برسات سے پہلے برسات

ہم عرصے سے تقویٰ اختیار کرنے کے چکر میں ہیں لیکن وہ ہمیں نجانے کیوں اختیار نہیں کرتا، حالانکہ ہم ایسا کوئی موقع یوں آسانی سے نہیں جانے دیتے کہ ہمارے زہد و اتقاء کے درجات کے بلند ہونے کا ذرا بھی امکان پیدا ہو اور یہ پاپی دنیا اس کے نظارے سے محروم رہ جائے۔

جب ہمیں کل اطلاع ملی کہ ناظم آباد عیدگاہ میں اتوار کو دس بجے خشک و گرم موسم سے پیدا ہونے والی قلتِ آب کے خاتمے اور بارانِ رحمت کی التجاء کے لئے نمازِ استسقیٰ ادا کی جائے گی تو بھلا کون ایسا تھا ہمارے ملنے والوں میں کہ جسے ہم نے یہ نہ بتایا ہو کہ کل دس بجے ہم سے رابطہ نہ کرنا کیونکہ ہم اس وقت عیدگاہ میں اہلِ ایمان کی معیت میں نمازِ استسقیٰ کی ادائیگی میں مصروف ہوں گے اور ساتھ یہ بھی کہنا ضروری سمجھا کہ "میاں ذرا دیر ہی کے لئے سہی لیکن ان آلائشِ دنیاوی سے جان چھڑانے کی ہمت کر سکو تو تم بھی وہاں پہنچ جانا۔

اس موقع پہ ہم نے اکثر مخاطبین کے چہرے پہ رشک، حسد اور بیچارگی و ناز وغیرہ وغیرہ پہ مبنی کتنے ہی رنگ آتے جاتے دیکھے تاہم کئیوں سے یہ سننے کو بھی ملا کہ یار کتنی ہی بار بتا چکے ہو اب تو یہ سبق پکا یاد ہو چکا ہے لیکن ہم جلنے والوں کی بات کوئی دل پہ تھوڑا ہی لیتے ہیں۔

ایک جذبہ مگر ایک اور بھی تھا جو اس وارفتگی کے پیچھے موجزن تھا جسے میں اپنے ایک دوست کے نام کی نسبت سے یاد کر پاتا ہوں اور وہ ہے سید اشتیاق علی۔۔۔ اوہ، میں پورا نام لے بیٹھا جبکہ یہاں مراد صرف "اشتیاق" تک محدود ہے تو معاملہ یہ بھی تھا کہ ہمیں بہت اشتیاق تھا کہ آخر یہ نماز کیسے پڑھی جاتی ہے کیونکہ باقی اور طرح کی نمازیں تو پڑھتے ہی رہتے ہیں لیکن صلوٰۃ الخوف، کسوف، خسوف اور نمازِ استسقاء پڑھنے کا موقع کبھی نہیں ملا، تاہم یہ بدگمانی ضرور ہے کہ کندھوں پہ سوار کراماً کاتبین نے امتحانات کے زمانے میں "خشوع وخضوع" سے پڑھی جانے والی نمازوں کو "صلوٰۃ الخوف" کے کھاتے میں ہی شمار کیا ہوگا۔

ہفتے کی شب بیگم کو بار بار پُرزور تاکید کر کے سوئے کہ دیکھو صبح دس بجے ہمیں نمازِ استسقیٰ پڑھنی ہے اس لئے ہمیں وقت پر اٹھا دینا۔ اُن کے چہرے پہ حیرت کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھے تو الٹی چڑھائی کر دی "کیا تم نہیں چاہتیں کہ قلتِ آب کا یہ مسئلہ حل ہو، کیا تم کو ابرِ رحمت کے برسنے سے کوئی غرض نہیں؟"

ہمارا یہ بیان دو گھنٹے مزید چل سکتا تھا لیکن ہم کیا کریں، بیگم نے اقرار یہ گردن ہلانے ہی میں عافیت جانی اور ہمارے اندر کے مقرر کو تسکین مزید کا موقع نہ دیا۔

صبح کس ڈھنگ سے اٹھے اور کس دھج سے گئے یہ پوچھنے نہیں اندازہ کرنے کی بات ہے۔ ہم سے زیادہ بیگم میں جذبۂ ایمانی بھڑکا ہوا تھا، یوں بھیجا گویا گھر سے دھکیلا ہو لیکن اِس سے قبل ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کرنا ہرگز نہیں بھلایا اور اس سے قبل یہ طعنے مارنا بھی یاد رکھا۔۔۔ ''واہ! یونہی بھوکا بھیجنے پہ تلی ہو، خالی پیٹ نماز میں خشوع و خضوع کیسے آ سکتا ہے بھلا اور خشوع و خضوع نہ ہو تو کیسی نماز؟''

بیگم نے جلدی جلدی میں نجانے کیا بنا کر دیدیا کہ بہت لذیز لگا اور سمجھ نہیں آیا کہ ایمرجینسی میں چیزوں کے ذائقے بڑھ کیوں جاتے ہیں شاید اس لئے کہ خلش پیدا ہو اور آئندہ از خود کسی ایمرجینسی کو ''دریافت'' کریں۔ بڑے تام جھام سے باہر نکلے۔ اتوار کا دن تھا اور ہر طرف سناٹے کا عالم تھا۔ دنیا داروں کی کی غفلت پہ بہت رنج ہوا کہ پڑے گھروں میں سوتے تھے۔۔۔ یہ رنج اس لئے اور بھی بڑھا ہوا محسوس ہوا کہ کوئی ہمیں دیکھنے والا ہی موجود نہ تھا کہ دیکھ پائیں کہ ایک ہم ہیں کہ ''صبح صبح'' اُن غافلوں کی آبیاری و راحت کا سامان کرنے کا کشٹ اٹھا رہے ہیں تاہم آگے تین چار جو ملے تو ہم نے بہت زور لگا کر سلام کیا اور اُن کو یہ پوچھنے کی زحمت سے بھی بچا لیا کہ ہم اس وقت کہاں جا رہے ہیں اور خود ہی راہ تقویٰ کی اس مسافت کو کھول کر بیان کر دیا۔ اُن میں سے ایک نے تو وفورِ جذبات سے ہمارے کندھے پہ تھپکی بھی دی لیکن نجانے کیوں ہمیں یہ تھپکی ہمیں اس سے مشابہ معلوم ہوئی کہ جو دیر سے رکی کسی پبلک بس کا کوئی بیتاب مسافر اپنی بس کو دیتا ہے اور نعرہ لگاتا ہے ''جانے دوس!''

عیدگاہ ہمارے گھر سے بہت دور ہے اور وہاں پہنچتے پہنچتے ہماری چال میں تمکنت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انجان دیکھتا تو سمجھتا کہ گویا عیدگاہ اپنے نام الاٹ کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور قبضہ لینے کو آئے ہیں۔ وہاں بہت سے اہل ایمان حاضر تھے، جلدی میں جائے نماز ساتھ لانا بھول گئے تھے لیکن وہاں جس طرح اکثر لوگ دوسرے کی جائے نماز پہ براجمان تھے اور مالکان مہمان معلوم تھے، ہم نے بھی ایسی ہی خود اعتمادی سے کام لیا اور پیر پسار لئے۔

کھلی جگہ، گرمی کا موسم اور کسی شامیانے یا سائبان کے نہ ہونے کی بے امانی، پھر مولوی صاحب کی طویل تقریر۔۔۔ مت پوچھیے کہ چند ہی منٹوں میں ہمارے تقویٰ کو کیا کیا خطرات لاحق نہ ہوئے۔ دل کہتا تھا کہ بس مولوی صاحب تقریر موقوف کر کے جلدی سے نماز پڑھا دیں اور پھر جی بھر کے لمبی تقریر کریں، پھر ہم نے کون سا وہاں رکنا ہے لیکن میں نے مولوی صاحبان کو ہمیشہ ہی سامعین سے زیادہ سیانا پایا ہے، شیر اور مولوی کسی کے سامنے آ جائیں تو پھر جو کرتے ہیں، وہی کرتے ہیں، سامنے والا تو صرف صبر ہی کرتا ہے، سو ہم نے بھی کیا اور پھر نماز شروع ہوئی جو دو رکعات کی تھی۔ بلاشبہ ایک ایسا جذبۂ ایمانی وہاں پایا کہ نماز بہت

عاشق اور خاوند

کامیاب عاشق وہ ہوتا ہے جو عشق میں ناکام ہو کیونکہ جو کامیاب ہو جائے وہ ''عاشق'' نہیں ''خاوند'' کہلاتا ہے۔ شادی سے پہلے وہ بڑھ کر محبوبہ کا ہاتھ پکڑتا ہے، اپنی محبت کے لئے، جبکہ شادی کے بعد وہ بڑھ کر بیوی کا ہاتھ پکڑتا ہے، اپنے بچاؤ کے لئے۔ جو شخص یہ کہے کہ اس کی بیوی نے کبھی اُس کی حکم عدولی نہیں کی، یہ وہ شخص ہے جس نے کبھی اپنی بیوی کو حکم ہی نہیں دیا۔ ویسے بھی محبوبہ میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ بندے کو اسے طلاق نہیں دینا پڑتی۔ عورت کا عشق مرد سے ہزار درجے بہتر ہے کیونکہ عورت کو عشق میں کامیابی کی صورت میں کسی عورت کے ساتھ شادی تو نہیں کرنی پڑتی۔

شیطانیاں از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

"جن لوگوں کے اندر شاعری کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ شاعری کر کے اس صلاحیت کو زائل کر لیتے ہیں لیکن جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی انہیں بھی تو بہر حال کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیں، نثری شاعری کر لیں۔ اس میں کسی دوسرے کی گرہ سے کیا جاتا ہے۔ نثری شاعری کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو پڑھنے کی عادت نہیں ہے، وہ اپنی اس عادت کے جواز میں شاعری کو پیش کر کے بہت خوش اسلوبی سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پڑھنے سے نہ پڑھنا بدر جہا بہتر ہے۔"

شگفتہ بیانی یا آشفتہ بیانی از خامہ بگوش

لطف دے گئی اور اس سے زیادہ دعا کہ نماز استسقاء کی دعا کے لئے ہاتھوں کی ہتھیلیاں نیچے کی جانب رکھی جاتی ہیں جو ایک بہت منفرد تجربہ بھی تھا اور تقدیر بنانے والے سے التجاء کر کے خشک موسم کی حالت پلٹ دینے کا استعارہ بھی۔ چھوٹے، بڑے، بوڑھے اور جوان سبھی نہایت عاجزی سے دست بدعا تھے۔ دعا کیا تھی گویا مخلوق اپنے خالق سے کلام کر رہی تھی، فریاد کناں تھی۔

عیدگاہ سے بہت دیر میں نکل سکے محض ایک چھوٹے سے گیٹ کو بس اتنا کھلا رکھا گیا تھا کہ گویا باہر پھرتی کسی گائے بھینس کو اندر آنے سے روکنا مقصود ہے۔ مقام تقویٰ پہ ان کا کیا کام لیکن یہ صاحبان توند کے لئے بہت بڑے امتحان کا وقت تھا جو انہوں نے سانس بھینچ کر، ترچھے ہو ہو کر پاس کیا تاہم باہر آنے کے بعد اُن کے چہروں سے جو سکون ہویدا تھا وہ بتا تا تھا کہ وہ اس مشقت کو پل صراط کے ٹریننگ پروگرام کے طور پہ لے چکے ہیں۔

ہم فاتحانہ طور پہ دائیں بائیں دیکھتے اور اہل دنیا کے ابھی تک خواب غفلت میں مبتلاء رہنے پہ کڑھتے ہوئے گھر پہنچے۔ صاف لگتا تھا کہ اہل محلّہ نے تقویٰ کے معاملے میں سارا انحصار ہم ہی پہ کر رکھا ہے اور یہ شرف ایک ہمارے ہی نصیب میں آیا ہے لیکن ہم نے بھی اُنہیں مایوس قطعاً نہیں کیا۔ خیال یہ تھا گھر میں گھستے ہی بیگم کو اپنے تقویٰ کی حکایات کی باڑھ پہ رکھ لیں گے اور انہیں باور کرا چھوڑیں گے کہ ہماری بابت اُن کی بدگمانیاں کس قدر

شکر گزاری

(لمرک)

میرے چند اک دوستوں کی بیویوں میں بات یہ اچھی نہیں
شوہروں کی تو اُنہیں "اخبار بنی" مطلقاً بھاتی نہیں
زہر لگنے لگتے ہیں شوہر اُنہیں
گمشدہ جب دیکھ لیں اخبار میں
شکر کرتا ہوں کہ بیگم آپ اُن میں سے کسی جیسی نہیں

نوید ظفر کیانی

بے بنیاد ہیں لیکن اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ بیگم کے چہرے ڈھیروں تشویش عیاں پائی اور انہوں نے برسات سے پہلے ہی برسنے کی باری لگا لی تھی "تو آپ پڑھ آئے نماز؟"

"کیوں کیا یہ اجلی سی ٹوپی اور ہمارے چہرے پہ دمکتا ہوا یہ نور تمہیں باور نہیں کراتا کہ ہم کس مقدس مشن سے آ رہے ہیں؟"

"نہیں! یہ بات نہیں۔۔۔ میں تو یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ جب آپ جلدی جلدی میں گھر سے وضو کیے بغیر ہی بھاگ نکلے تھے اور عیدگاہ میدان میں وضو کا کوئی تو سلسلہ ہی نہیں ہے تو پھر آپ کیا کر کے آ رہے ہیں؟"

کائنات بشیر، جرمنی

حکیم صاحب

جناب عزت مآب قبلہ حکیم صاحب!

سوال

میرے بال گھنے اور سیاہ تھے، مگر اس شوق میں کہ بال خوبصورت ہو جائیں بھورے کرنے کے لیے ہائیڈروجن پر آکسائیڈ کا استعمال کر لیا۔ جس سے بال تو بھورے ہو گئے مگر اب بال گرنے لگے ہیں۔ کوئی مشورہ دیں کہ بال گرنے رک جائیں اور دوبارہ سیاہ ہو جائیں؟

جواب

خیر سے بدھو گھر کو آئے، آپ کی مت ماری گئی تھی۔ بھلا آپ کو خوبصورت سیاہ اور گھنے بالوں کو بھورا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ فطرت سے جنگ انسان کے لیے سراسر خسارا ہے۔ نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا کہ انسان فطرت سے جنگ جیت سکے۔ کالے سیاہ بال تو خوبصورتی کی علامت ہیں۔ شاعر کالی گھٹاؤں جیسے بالوں پر باجماعت مرتے ہیں۔ کبھی آپ نے بھوری گھٹائیں دیکھی سنی ہیں۔ خیر اب آپ کو صبر کا لمبا پارٹ پڑھنا پڑے گا۔ سو جب تک بال خود بخود دوبارہ کالے نہیں ہو جاتے، تب تک انتظار کریں، روز آئینہ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھریں یا اتنا عرصہ سر پر کالی وگ استعمال کریں۔

سوال

مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بھی احساس ہوتا ہے کہ ابھی کچھ کھایا ہی نہیں۔ سو تھوڑی دیر بعد کھاتا رہتا ہوں۔ سمجھ لیں کہ ہر گھنٹے بعد کچھ نہ کچھ ضرور کھاتا ہوں۔ کوئی نسخہ مشورہ درکار ہے؟

جواب

ندیدے کہیں کے، آپ کو جو بھی تکلیف ہے اسے طبی زبان میں جوع البقر کہتے ہیں یعنی بکری کی طرح ہر وقت منہ مارتے رہنا۔ اور یہ اب آپ کی عادت بن چکا ہے جسے آپ روک نہیں سکتے۔ صرف کھانے کے وقت کھانا کھایئے۔ باقی ہر گھنٹے کے بعد چیونگم چبایا کریں۔ اور کھانے کے اوقات میں دوسروں کے ہاں جانے سے گریز کیجیے۔

سوال

جناب میری عمر اکیس سال ہے۔ ایم اے کر لیا ہے مگر ابھی تک داڑھی، مونچھوں کے بال نہیں آئے۔ جس کی وجہ سے دوست یار مذاق کرتے ہیں، اس لیئے دوستوں کی محفل میں جانے سے

ادب کا بھاؤ

"ادب کے معیار کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کاغذ جو بازار میں سونے کے بھاؤ بکتا ہے، جب اس پر شاعری یا افسانہ چھپ جاتے ہیں تو ردی کے بھاؤ بھی نہیں بکتا"

سوختنی نہ فروختنی از خامہ بگوش

گریز کرتا ہوں۔ مہربانی فرمایئے؟

جواب

احسان میرے دل پہ تمھارا ہے دوستو
یہ دل تمھارے پیار کا مارا ہے دوستو

آپ دوستوں کو یارِ غار سمجھ کر معاف کر دیں۔ وہ اپنی ٹانگ کھینچنے کی عادت سے مجبور ہیں۔ آپ تو بار بار شکر ادا کریں کہ آپ اس وقت یعنی فلموں کے کلاسک دور میں پیدا نہیں ہوئے۔ ورنہ کندن لال سہگل کی مونچھیں آپ کو چیلنج دیتیں۔ مغل اعظم میں دلیپ کمار کی مونچھیں اپنی جانب متوجہ کرتیں۔ مونچھوں کو تاؤ دینے کے زمانے سے بھی آپ کی بچت ہوگئی۔ امتیابچن، جانی واکر، کشور کمار، انیل کپور کی مونچھوں کو نظر انداز کر دیں۔ رتیک روشن اور فردین خان کی مونچھوں سے خائف ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اگر پھر بھی یہ کمی محسوس کرتے ہیں تو کبھی کبھی نقلی مونچھ لگا کر شوق پورا کر سکتے ہیں۔ آخر عورتیں بھی تو نقلی بال لگا کر اپنا شوق پورا کر لیتی ہیں ناں۔ اور داڑھی کو تو بھول جائیں وہ کبھی فیشن میں ہوتی ہے کبھی نہیں۔ ویسے سر کے بالوں کی فکر رکھیے گا۔

سوال

مجھے دور کی اشیاء صاف نظر نہیں آتیں۔ حالانکہ صحت بہت اچھی ہے۔ کوئی علاج مشورہ دیجیے؟

جواب

شکر کریں، کم از کم آپ کو قریب کی اشیاء تو ٹھیک نظر آتی ہیں نا، ناشکرے کہیں کے۔۔۔!

سوال

جناب والا، میں غیر شادی شدہ ہوں۔ سال بھر سے سر میں سفید بال نظر آنے لگے ہیں۔ کئی نسخے آزمائے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، پلیز رہنمائی کریں؟

جواب

مکھڑے پہ سہرا ڈالے آجا او نے والے

آپ بالکل بھی فکر مت کریں۔ کیونکہ فکر کرنا آپ کے لیے تریاق کے برابر ہے۔ اس سے بال دن بدن نہیں، سیکنڈ بہ سیکنڈ سفید ہوتے چلے جائیں گے۔ ویسے بھی آپ کو فکر، علاج معالجے کی کیا ضرورت؟ یقیناً آپ کو کوئی نہ کوئی سفید بالوں والی حسینہ مل ہی جائے گی۔

سوال

عزت مآب حکیم صاحب، سبزیاں کچی کھائی جائیں یا انھیں پکا کر کھانا چاہیے؟

جواب

او میرے ارائیں بھرا! جب پیاز کو روٹی پہ رکھ کر مکی مار کر کھا لیتے ہو تو اس وقت تو یہ خیال نہیں آتا کہ اسے پکا کر کھانا چاہیے یا کچی حالت میں۔۔۔! ناک کو چاہے سامنے سے پکڑو یا سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر، تو اسی طرح سبزی، سبزی ہی رہے گی۔ اگر آج من و سلویٰ بھی اترتا رہتا تو لوگ یہی پوچھتے کہ حکیم صاحب، سیدھا پتے سے چاٹ لینے سے زیادہ فائدہ ہوگا یا پکا کر کھانے سے۔۔۔!

سوال

میں ایک بنک میں کیشیئر ہوں۔ جب ڈیوٹی ختم کر کے اٹھتا ہوں تو سر چکراتا ہے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور اردگرد کی شے گھومتی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو کھڑا رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوئی مشورہ، نسخہ عنایت کیجیے؟

جواب

ہوں، پکڑے گئے نا، جناب سارا دن تو بنک میں آپ کی طبیعت ٹھیک رہتی ہے۔ مگر چھٹی کے وقت ایسا ہونا۔۔۔ دراصل سارا دن آپ کے ہاتھ کڑکڑاتے کھڑکتے نوٹوں کی گنتی کرتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو ایک دولتمند انسان سمجھنے لگتے ہیں۔ گھر

ایک بار تخلص بھوپالی مولانا علی میاں کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ "حضرت آپ سعودی عرب تشریف لے جارہے ہیں اس درمیان اگر میں مرجاؤں تو کتبے پر کیا لکھواؤں۔ مولانا نے مسکرا کر تخلص کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا "میرا خیال ہے آپ کتبے پر یہ لکھوایئے کہ یہاں پیشاب کرنا منع ہے۔"

جاتے وقت یہ خزانہ آپ کے ہاتھوں سے چھٹنے لگتا ہے۔ سو اسی لیے آپ کی یہ کیفیات ہوتی ہیں۔ لالچی کہیں کے، اگر ممکن ہو سکے تو رات کے لیے وہیں بنک میں بستر لگوالیں یا وہاں چوکیدار کی نوکری لے لیں۔ ورنہ گلوکوز کی ٹکیاں اپنی جیب میں رکھیں۔ بنک سے نکلتے ہوئے چھٹی کے وقت حسب منشاء ٹکی چوس لیا کریں۔

سوال

حکیم جی، مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ رات رات بھر جاگ جاگ کر وقت گزارنا پڑتا ہے۔ کچھ بتایئے گا کہ ایسا کیوں ہے؟

جواب

کروٹیں بدلتے رہے ساری رات تم
آپ کی قسم۔۔۔۔آپ کی قسم

پہلے تو یہ بتایئے کہ کہیں آپ شاعر تو نہیں یا آپ کو وہ تو نہیں ہوگئی جسے عاشقان برادری محبت وحبت، عشق وشق، پیار ویار کا نام دیتی ہے۔

اگر ایسا ہے پھر تو گئے کام سے۔۔ کچھ عرصے بعد آپ خود ہی گاتے پھریں گے،

سب کچھ سیکھا ہم نے نہ سیکھی ہوشیاری
سچ ہے دنیا والو کہ ہم ہیں اناڑی

یا پھر آپ نے کسی کا قرض تو نہیں دینا۔۔؟ بندہ بشر ہیں آخر کسی کے بھی مقروض ہو سکتے ہیں۔ ویسے کیا آپ کے گھر میں انٹرنیٹ نہیں ہے۔؟ لوگ تو وہاں رات بھر مکھیوں کی طرح بیٹھے رہتے ہیں۔ نیند بھگا کر وقت گزاری کرتے ہیں۔ خیر، اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو میرے خیال سے آپ کے دماغ میں خشکی ہوگئی ہے۔

سو ہر پندرہ دن بعد سر پہ مہندی لگایئے، اس طرح سنتِ اسلامی بھی پوری ہوتی رہے گی۔ جانی انجانی نیکیوں کا ثواب بھی آپ کے کھاتے میں جمع ہوتا رہے گا۔ ورنہ رات کو سوتے وقت گرم گرم دودھ میں خشخاش کی پوٹلی جادو کی طرح دو چار بار گھما کر پی لیجیے۔ اتنی گہری نیند آئے گی کہ آپ کو سوتے میں اپنی ہی خبر نہیں رہے گی۔

سوال

مجھے خارش کی شکایت ہوگئی ہے۔ جسم دانوں سے پُر ہوگیا ہے۔ رات کو تو بہت زیادہ خارش ہوتی ہے۔ سو کھجاتے کھجاتے صبح ہو جاتی ہے۔ اس خارش کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں۔ مشورہ درکار ہے۔؟

جواب

بُرے پھنسے نا، یاد رکھیے گا، خارش ایک اچھوتی بیماری ہے۔ جو آپ باقی گھر والوں کو بھی مفتو مفتی بانٹ سکتے ہیں۔ مگر ایسا کیجیے گا مت، بلکہ ناراض ہو کر ان سے اپنا بستر الگ کر لیں۔ ویسے بھیا کھجانے کے لیے تو آپ کے پاس سر موجود ہے اور ہتھیلی بھی، اب سیسہ فیشن ہے ورنہ حقے کے پانی سے اشنان آپ کے لیے بہت کارآمد تھا۔ خیر آپ سدا بہار درخت نیم کی پتیاں اُبال کر اس سے نہایئے۔ تب تک نہاتے رہیئے جب تک خارش ختم نہ ہو جائے۔ اس دوران کہیں مہمان بن کر مت چلے جایئے گا اور جلسے، جلوس میں بھی جانے سے پرہیز رکھیئے گا ورنہ ڈاکٹروں کو مصیبت پڑ جائے گی۔

سوال

جناب عزت مآب، چند دن ہوئے عجیب الجھن میں ہوں۔ جو بھی چیز کھاتا ہوں، اس کا ذائقہ محسوس نہیں ہوتا۔ نمک والی چیز کھا لوں تو نمکین نہیں لگتی، کوئی میٹھی چیز کھاؤں تو مٹھاس محسوس نہیں ہوتی۔ کیا کروں؟

جواب

اس مرض کو طبی زبان میں بطلانِ ذوق کہتے ہیں۔ اس میں چکھنے کی حس نہیں رہتی۔ خیر فکر کی بات نہیں۔ جب تک یہ بحال نہیں

ہوتی۔ آپ کسی ڈائٹنگ پلان پر آسانی سے عمل کر سکتے ہیں۔ کریلے، نیم، کڑوی چیزوں کا استعمال بھی ٹھیک رہے گا۔ گھر والوں سے بخوشی کدو، بینگن، توری، ٹینڈے، حلوہ کدو پکوا کر کھا سکتے ہیں۔

سوال

مجھے پان کھانے کی عادت ہووت۔ گزشتہ روز پان میں چونا زیادہ پڑت۔ جس سے زبان پھٹت۔ اب پان کھانے میں دقت محسوس ہووت۔ کیا علاج ہووت؟

جواب

کھائیں کے پان بنارس والا
کھل جائے بند عقل کا تالا

لگتا ہے آپ کی عقل کا تالا تو جم گیا۔ اب فکر کرنے سے کیا ہووت، آپ کوئی پان کھانا تھوڑی چھوڑت۔ آخر ہر کوز ہر مارت، آپ پان میں خوب سارا چونا، کتھا، تمباکو اور سپاری ڈال کے کھات رہت۔ آخر زبان کو بھی نہ کبھی تو اس نئے ذائقے کی عادت ہووت۔

سوال

حکیم صاحب کیا یہ صحیح ہے کہ جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی دوائیاں یا جڑی بوٹیوں کے نسخے سب کو فائدہ نہیں دیتے۔۔؟

جواب

(کملیو، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے) جی ہاں، بالکل صحیح بات ہے کہ دیسی ادویات ہر کسی کو فائدہ نہیں دیتیں کیونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہوتا ہے ورنہ طوطے کو چارہ کھلا دیکھئے اور بکری کو چوری۔۔

> دہلی میں پیروڈی شاعری کا مشاعرہ تھا۔ جب گلزار زتشی کا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا تو وہ انکسار سے بولے ''حضور! میں صدارت کا اہل کہاں ہوں؟''
> اس پر کنور مہندر سنگھ نے فرمایا ''مطمئن رہیں، آپ بھی صدر کی پیروڈی ہی ہیں۔''

سوال

میری بچی کی عمر دو سال ہے۔ گذشتہ چند ماہ سے وہ چارپائی کے جنگلے سے سر ٹکراتی ہے۔ بعض دفعہ تو کافی بار سر ٹکراتی ہے۔ کیا کریں؟

جواب

اونہوں بھولے بادشاہ، لگتا ہے آپ وقت اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے۔ ورنہ یہ مسئلہ کب کا خود ختم کر چکے ہوتے۔ بچی نئے دور کی نئی فصل ہے بلکہ نئی بوٹی ہے۔ اس کی مانگیں بھی مختلف ہیں۔ لگتا ہے آپ نے اسے ابھی تک موبائیل ہاتھ میں نہیں پکڑایا اور لیپ ٹاپ اس کی گود میں نہیں رکھا۔ سو جلد از جلد اس کی معصوم خواہشات پوری کریں۔ اسے یہ چیزیں لا کر دیں۔ ورنہ ابھی تو وہ چارپائی سے سر ٹکراتی ہے، آئندہ وہ زمین پر ٹکریں مارے گی اور ساتھ ساتھ ایڑیاں بھی رگڑ سکتی ہے۔

سوال

کھانا کھانے کے بعد میرا پیٹ پھول جاتا ہے۔ جیسے کسی نے غبارے میں ہوا بھر دی ہو۔ پیٹ میں کبھی بادل گرجتے محسوس ہوتے ہیں اور کبھی قرقر قر کی آواز آتی ہے اور کبھی گڑگڑ گڑ کی، مشورہ چاہیئے؟

جواب

بادل یوں گرجتا ہے ڈر کچھ ایسا لگتا ہے

بھیا، میں تو خود سن کر حیران ہوں کہ آپ کے پیٹ میں کوئی آرکسٹرا آرگنائز ہے۔ جہاں سے اتنے سروں کی موسیقی بجتی ہے۔ لگتا ہے آپ اپنے کھانے پر دھیان نہیں دے رہے۔ اور غذا کے ساتھ ساتھ بہت ساری ہوا بھی مفت میں نگل لیتے ہیں۔ یا آپ بادی چیزیں کھا رہے ہیں۔ جیسے گوبھی، ماش کی دال، چنے، لوبیے وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سے ہوا بن کر مستی میں آ رہی ہے۔ سو اجوائن، سونف، گڑ، کالے نمک، کالی مرچ اور خصوصاً مولیوں کا استعمال آپ کے لیے مفید رہے گا۔

سوال

جناب میری آنکھوں سے پانی آنسوؤں کی طرح بہتا ہے۔

آنکھوں میں نہ تو جلن ہے اور نہ ہی میں رو رہا ہوتا ہوں۔ کیا کروں؟

جواب

نیناں برسے رم جھم رم جھم

لگتا ہے آپ بہت جذباتی انسان ہیں۔ اور آپ کے نین ہر وقت بھرے رہتے ہیں جو ذرا سی بات پر چھلک جاتے ہیں۔ کیا آپ زیادہ جذباتی فلمیں دیکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان کی جگہ ایکشن فلمیں دیکھنی شروع کر دیجئے۔ یا آپ کی بیوی آپ سے روزانہ پیاز کٹواتی ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو کوئی حرج نہیں، آنسو بہنے سے آنکھیں نتھر کر صاف شفاف ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ کو پھر بھی اعتراض ہے تو آئندہ چشمہ لگا کر پیاز کاٹیے گا۔ بیوی بھی خوش رہے گی اور آپ کا مسئلہ بھی حل۔

سوال

جناب، مجھے ناخن چبانے کی عادت ہو گئی ہے۔ کئی بار احساسِ شرمندگی اٹھانا پڑی ہے۔ کچھ بتایئے گا؟

جواب

میاں تم کیا سمجھتے ہو۔ اس عادت پر شرمندگی کی بجائے کوئی انعام ایوارڈ ملے۔ ناخنوں کو ہمیشہ کاٹ کر رکھو ورنہ تم تو ان کا کباڑہ کر دو گے۔ تمہارے دماغ میں یقیناً کوئی احساسِ محرومی ہے جس کا بدلہ ناخن چبا کر لیتے ہیں۔ لہٰذا طوطے کی طرح اپنے ناخن کترنے بند کرو اور کوئی مثبت کام کرو۔

سوال

حضورِ والا، میں ایک دوکاندار ہوں۔ میری صابن فروخت کرنے کی ایک دوکان ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری جلد خشک ہو گئی ہے اور اس میں خارش بھی ہوتی ہے۔ صابن استعمال کرنے سے خشکی اور خارش بڑھ جاتی ہے۔ کوئی مشورہ دیجیے؟

جواب

لو کر لو بات، جناب لوشن، شمپوز کے دور میں اگر آپ سارا دن مختلف صابن کے درمیان رہیں گے۔ صابن استعمال کریں گے تو ری ایکشن ری پلے تو ہو گا ہی۔ سو صابن کی جگہ اپنی دوکان پر شمپوز کی رنگین بوتلیں رکھیں۔ چمچاتے پرفیومز، لوشن، فیس واش، باڈی واش رکھیے۔ خود بھی یہی استعمال کیجیے تو دیکھیے گا خشکی خارش دور اور جلد ملائم ہو جائے گی۔

وزیرِ قانون

بہت پرانا لطیفہ ہے۔ جب پاکستان میں افغان مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک افغانی مہاجر نے اپنا تعارف افغانستان کے ریلوے کے وزیر کے طور پر کرایا۔
مخاطب نے حیران ہو کر کہا "وہ کیسے؟ افغانستان میں تو ریلوے ہے ہی نہیں۔"
اس پر افغان مہاجر نے جواب دیا "اس سے کیا فرق پڑتا ہی، آخر پاکستان میں وزیرِ قانون بھی تو ہوتا ہے۔"

ماورائے عدالت پھینٹی از عطاء الحق قاسمی

سوال

حکیم جی، مجھے ایک ایسی لت پڑی ہے جسے سن کر شائد آپ بھی مجھ پر حکیمانہ ہنسی ہنس دیں۔۔۔ مجھے مٹی کھانے کی عادت ہے۔ بچپن کی عادت جوانی میں بھی چلی آئی ہے۔ اب پیچھا چھڑانے سے نہیں چھوٹ رہی۔ کوئی نسخہ عنایت فرمایئے گا؟

جواب

عادت ہو گئی ہے میرے مہربان کو کسی نامہرباں سے
او عقل کے اندھو، عادت سوچ سمجھ کر ڈالنی چاہیے تھی نا۔۔
میرے پاس حکمت ہے جادوگری نہیں۔۔ لگتا ہے مائیں بچوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں دیتیں، اسی لیے وہ مٹی کھانے لگتے ہیں۔ مٹی کا پتلا مٹی میں جا ملے گا۔ اتنا فکر نہ کریں۔ اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط کریں یا جیب میں ہر وقت ملتانی مٹی کی گاچی رکھیں۔ جب طبیعت زیادہ ہی للچائے تو اسے تبرک کی طرح چاٹ لیا کریں۔۔

سوال

مجھے سر میں درد رہتا ہے۔ تھوڑی دیر مطالعہ کر لوں یا شور و غل ہو، اونچی آواز سے گفتگو کر لوں تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ اگر

آرام سے لیٹ جاؤں یا نیند آجائے تو درد ختم ہو جاتا ہے۔؟

جواب

مہربان لگتا ہے آپ بہت حساس شخصیت کے مالک ہیں۔ جو دوسروں کو سنتے ہی آپ کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ یا آپ تنہائی پسند ہیں۔ دنیا سے بیزار، جی اچاٹ، یا آپ اپنی ہی کہنا چاہتے ہیں دوسروں کی سننا نہیں چاہتے۔ ویسے تو اس تالے کی چابی آپ ہی کے پاس ہے جب بھی سر درد ہو جا کر سو جایئے۔ یوں تو آپ درویش بھی بن سکتے ہیں۔ بیاباں کی خاک چھان سکتے ہیں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ فطرت آپ کے لیے ممدون ثابت ہوگی۔ آپ مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ کوہ نوردی کیا کریں۔ ان کی سیاح پارٹی میں شمولیت کرلیں۔ وہ آپ کو ایسی ایسی جگہوں پر لے جائیں گے۔ جہاں نہ بندہ نہ بندے کی ذات، یوں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

سوال

بعض دفعہ میرا دل اچانک گھبرانے لگتا ہے۔ ہر شے ڈراؤنی لگتی ہے۔ کوئی بھی چیز سامنے آجائے تو دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ جسم پر خوف کی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ جو پندرہ بیس منٹ بعد خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہے۔ کوئی علاج معالجہ؟

جواب

ڈرپوک کہیں کے

دھک دھک کرنے لگا

او مورا جیارا ڈرنے لگا

لگتا ہے آپ مادھوری ڈکشٹ کا یہ گیت بہت سنتے ہیں۔ یا آپ کی پسندیدہ لسٹ میں ٹاپ پر ہے۔ بھیا یہ دنیا ہے جی داروں کی اور دلداروں کی، آپ نجانے کہاں کھوئے رہتے ہیں۔ کن خیالوں اور وسوسوں کو اپنے اوپر طاری رکھتے ہیں۔ اور سوچ سوچ کر دل کو دہلائے رہتے ہیں۔ ورنہ جب جب جو جو ہونا ہے تب تب وہ وہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ وہم کا شکار ہیں۔ سو اسے دور کیجئے۔ کیونکہ دیکھیں ناں، بعد میں یہ خود بخود ٹھیک بھی تو ہو جاتا ہے نا۔ واقعی شکر خورے کو شکر راس نہیں آتی۔

لوٹا

لوٹا چاندی بھی ہے لوٹا سونا بھی ہے اور لوٹا ہیرا بھی ہے لیکن ایک لوٹا مٹی بھی کہ وہ مٹی ہی سے بنا ہوتا ہے۔ اور اس نے لوٹ کر اسی مٹی میں جانا ہوتا ہے۔ جو لوٹا اپنی مٹی سے تعلق نہیں توڑتا اس کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اس کی خوشبو ہی منفرد ہوتی ہے۔ اس میں گرم تپتا ہوا پانی بھی ڈالیں تو کچھ لمحوں بعد وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ الغرض لوٹے کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے کہ لوٹا خیر کثیر ہوتا ہے۔ لوٹا صرف ووٹ ہی نہیں حوصلے بھی بڑھاتا ہے۔ بعض اوقات ایک لوٹا آنے سے کہانی کا رخ ہی بدل جاتا ہے' پانسے پلٹ جاتے ہیں۔ بہرکیف لوٹا اگر ایک گروہ کے لئے خوشی کا باعث ہے تو دوسروں کو چھوڑ کر آنا بھی شائد اس کے لئے دکھ کا باعث نہ ہوتا ہو جن کو وہ چھوڑ کر آتا ہے ان کے لئے غم کا ایک کوہِ گراں بن جاتا ہے۔ لوٹے کی زندگی میں غم اور ندامت رچی بسی معلوم ہوتی ہے کہ لوٹا جتنا بھی بارعب ہو، اس کی آنکھیں پیچھے چھوڑ کر آنے والوں کا سامنا نہیں کر پاتیں۔ لیکن لوٹا تو لوٹا ہوتا ہے، وہ کیا کرے کہ اس کی اگر آنکھیں دو ہیں تو ٹوٹیاں بھی دو ہوتی ہیں۔ جو اسے نت نئی سمتوں کا تعین کرنے کے لئے بے تاب رکھتی ہیں۔

ہم تو یونہی چلتے رہیں گے
جلنے والے جلتے رہیں گے

یوسف عالمگیرین

شفیق زادہ ایس احمد

دُھائی

چند سال پہلے لکھا ہوا بطور شوہر نامدار میری ڈائری سے ایک ورقِ بیچارگی

ہمارے گھر میں قدم رنجہ فرمانے والے نئے مہمان نے ہمیں بس 'شوہر' بنا کر ہی رکھ دیا تھا۔ انگریزی میں پڑھیں تو ''شو'' یعنی دکھاوا اور ''ہر'' کا مطلب ''وہ'' (صنف نازک) بقلم خود، مطلب اس کا یہ کہ بس ہم ان کے لیے دکھاوے کی چیز ہی ہو کر رہ گئے جسے وہ بہت فخر سے اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر ساتھ لیے پھرتیں۔ اور ہمارا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ ہم ہر دم انہیں عند الطلب اور عدم الطلب اور ان دونوں کی درمیانی کیفیت میں بھی اپنی وفاداری، دلداری، خدمات گاری و غیرہ وغیرہ کے جوہر ''شو'' کراتے رہیں۔ اور وہ اپنی تصوراتی مونچھوں کو تاؤ دے دے کر ہمارے (تابناک حد تک مخدوش) مستقبل کے فیصلے کر سکیں۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ موصوفہ نے قبلہ والد صاحب کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ والد محترم پہلے ہی ہم پر شادی پر آمادہ ہونے کو ''خاندانی اغلاط'' کے تاریخی سلسلے کو بڑھاوا دینے کا الزام لگا کر ہم سے ناراض تھے، اوپر سے موصوفہ کی جانفشاں خدمتگاری اور خاموش تابعداری نے گھر میں اتنی جگہ بنا لی تھی، جتنی ہمیں ترکہ میں بھی نہ ملتی۔ تو جناب ڈائری بھیجیے! ''شادی کے گیم چینجر'' کے بعد ہم صرف اپنے کا بک اور اپنی ہی بیگم کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اس سسرالی پیٹھ تھپکائی کی آڑ میں دھڑلے سے ہم کو جو دھمکیاں دی جاتیں وہ شاذ ہی کبھی ڈھکی چھپی ہوتیں مگر ہم انہیں دوسروں سے چھپائے پھرتے کہ ''کچھ تو میرے پندارِ وفا کا بھرم رکھ''۔ ان کی طرف سے بہت ہی صاف وسلیس الفاظ میں سنگین نتائج کی ذمہ داری اور ان کے کیے کا بھگتان ہمارے گلے ڈالا جاتا۔ حد تو یہ کہ ہم اُن تمام پوشیدہ اور مخفی وارداتوں کے مبینہ سزا کے حقدار ٹھہرائے جاتے جو ہم سے نہ کبھی سرزرد ہوئے یا جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی ہو۔ اکثر ہم ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ازدواجی معطلی کا شکار رہتے۔ ہماری والدہ محترمہ اور موجودہ ساسو ماں البتہ ہماری درپردہ حمایتی تھیں مگر توازنِ طاقت کا جھکاؤ موصوفہ کی طرف دیکھ کر وہ بھی گھریلو سیاسی حکمت عملی کے تحت اعلانیہ اِس حمایت کا اظہار نہیں کرتیں۔ خاص طور سے موصوفہ کے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کے بعد تو ممتا کا شہد ہمارے حلق تک پہنچتا ہی نہیں تھا۔ دبئ میں ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنا کسی ''کراچائٹ'' کے لیے سندھ دبئی کا جادوئی ڈومیسائل حاصل کرنے سے کم نہ تھا۔ لہٰذا ساس بہو ہم دو ہمارے دو کے مصداق آنکھ میچے سہیلی سہیلی کھیلنے میں مگن تھیں۔ اگر ہمیں جنّت کا لالچ نہ ہوتا یا والدہ سیاست دان ہوتیں تو سائڈ بدلنے پر ''لوٹی'' کا لقب پاتیں۔ ہم بھانپ رہے تھے کہ کہ چند سال اور گزریں گیا ور ہم بھی قبلہ والد صاحب کی طرح آہنی، معاف فرمائیے گا ''آئینی'' صدر بن جائیں گے، یعنی اختیار سے محروم صرف دستخط کرنے کی مشین مگر پھر بھی ''ممنون''۔ وطن عزیز کے سیاست دان بہت باہمت اور عوام خوش نصیب ہیں کہ بات

اٹھارہویں ترمیم تک لے گئے، ہم نے تو اپنی ازدواجی حیثیت میں بھی کبھی دوسری ترمیم کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارا شادی شدہ ہو کر ختم شدہ ہونے کا تجربہ ایسا کچھ دلربا ہرگز نہ تھا کہ ' ڈومور ڈومور' کی دعوتی صدائیں ،نزلے سے بند ہمارے کانوں میں گونجتیں۔ اوپر سے بیگم نے حفظِ ماتقدم کے طور پر جو حفاظتی اقدامات کئے ہوئے تھے وہ ہمہ وقت ہمیں سہمانے اور دھمکانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھے۔ اس معاملے میں بیگم کی دور اندیشی امریکہ شریف کو بھی مات دیے جاتی ہے کہ ہمارے ارتکابِ جرم سے پہلے ہی ہم پر فردِ جرم عائد ہو چکی ہوتی ہے۔ یوسف زئی پٹھانی نے باتھ روم میں فنائل کی تیز اثر بوتل، تنومی طاقت والی سکون آور گولیاں اور ہمارے ائیر کنڈیشنڈ بیڈروم میں بغیر پنکھے کا قذّاقی پنجے جیسا ہک دکھا دکھا کر ہماری جان آدھی کر رکھی تھی۔ آپ سب سے چھپا ہوا نہیں ہے کہ ہماری پہلوٹھی کی تصنیف ''م تماشا'' میں بیان کردہ آصف قدر ٹھرکی والے معاملے کی جانکاری کے بعد وہ پہلے ہی ہم سے ہمارے زیرِ نگین ہونے کا خراج بائیس قیراط والی فسادی دھات کے کنگن کی صورت میں وصول کر چکی تھیں۔ اس وصولی کے ساتھ ہی وہ خوب اندازہ لگا چکی تھیں کہ ہمارا بریکنگ پوائنٹ کب آتا ہے، جس کے آنے میں انتظار کی گھڑیاں کبھی بھی طویل نہ ہوئیں۔ ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی گمان تھا کہ دھمکانا اور دہلانا اور بات ہے مگر وہ کبھی بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گی جس پر وہ ہم پر اپنا کنٹرول کھو بیٹھیں، چاہے ان کی اصلی یا بناوٹی بیہوشی کے چند لمحوں کے لئے ہی صحیح۔ مگر پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ پٹھان بچّی ہے، نہ جانے کس وقت کیا کر بیٹھے، کوئی خوبرو یا پھر خودکش دھماکہ۔ ہمیں خوب جتا دیا گیا تھا کہ (یقینی) ناکام کوشش پر ہمارا کیا حال ہو سکتا ہے جس کا سب سے عبرت ناک پہلو یہ تھا کہ ہمیں اپنے ہاتھ کی بنی چائے خود نوش کرنا پڑے گی۔ وہ چودھری اور چودھرائن کی کہانی سے بہت متاثر ہوئیں، آنکھوں میں آنسو بھر کر ہمارا ہاتھ تھام لیا، کہنے لگیں ' چودھرائن بہت عظیم عورت ہیں مگر میں ایسی بالکل نہیں ہوں۔ اسی لئے آپ کسی دھوکے میں مت رہیے گا، میرا نشانہ بہت پکا ہے، اگر بیلن پھینک کر گھٹنے پر ماروں تو وہیں لگے گا، اور اگر طبلے کی طرح سر پر بجاؤں تو گومڑ بھی آپ کے بے بال سر سے ہی نمودار ہوگا'۔ پھر رومانسی ہو کر بولیں ''لیکن کسی کی بھی قسم لے لیجئے، اگر آپ کی تیمارداری میں کوئی کوتاہی کروں تو بے فکر ہو کر چٹیا پکڑ لیجئے گا۔ چاہے چھوڑ آئیں مجھے نئے والے فلیٹ میں۔ میں اُف تک نہ کروں گی، بس آپ ہی کے اے ٹی ایم کارڈ سے خرچ کے پیسے نکال لیا کروں گی۔ اس وقت تک میری ساس نندیں وغیرہ حالات سنبھال ہی لیں گی''۔ موصوفہ بیگم کو خطّے (سسرال) میں اپنی ''اسٹریٹیجک ڈیپتھ'' یعنی اہمیت کا خوب اندازہ تھا اور اس کا فائدہ اٹھانے کی مہارت بھی تھی۔ ہماری جھکتی کمر میں آخری تنکا پرستانی پارلیمنٹ سے حال ہی میں پاس کیا گیا' حقوقِ نسواں بہ مخالف تشددِ نسواں بل' ثابت ہوا۔ اب اس قانونی شکنجے کی مدد سے وہ بغیر کسی وجہ کے ہمیں تھانے میں بند کروانے کی مجاز تھیں اور اندھا ''قنون'' بھی ان کا ہی ساتھ دے گا۔ ہمیں یقین تھا وہ کچھ بھی کریں، تفتیش کے دائرے میں ہم ہی پھنس جائیں گے۔ پہلے داخلی طور پر سگے مائیکے والوں کے ہاتھوں اور پھر خارجی طور پر سسرائیلیوں کے چنگل میں۔ ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ جسے دلہن بنائے دل میں بسائے ناز برداریاں اٹھانے کے چکر میں میں لائے تھے اس نے الٹا ہمارا ہی ''دولہا'' بنا کر بار برداریاں شروع کروادیں۔ ہمارے ہم عصر اور ہم پیالہ پیارے میاں گذری شام کہہ رہے تھے کہ ''نئی بیوی اور نئے رشتے، نئے جوتے کی طرح ہوتے ہیں، جب تک پاؤں میں اچھی طرح فٹ نہ ہو جائیں، کاٹتے ہی رہتے ہیں''۔ ہم ان کی اس بات سے متفق ہیں، کلّی طور سے، کیوں کہ ہماری باہوش زندگی میں میں رشتوں کی کاٹ کو ہم سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ ڈائری بھتیجے! اب تو ہمارے شب و روز ذیل درج شعر کو گنگناتے گزرتے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں تینتیس دانہ تسبیح رہتی ہے جس کے دانے اچھے دنوں کی آس میں گھماتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

دعا گو: شفیق ذادہ

عامر راہداری

سفر نامۂ واش روم

آخرکار کافی دیر سوچنے کے بعد ہم نے فیصلہ کر ہی لیا کہ ہمیں واش روم کی سیر کو نکل ہی جانا چاہیئے آخر سب ہی جاتے ہیں ہم کیوں نہ جائیں. تو دوستو ہمارا پروگرام فائنل ہو گیا کہ ہم واقعی واش روم جارہے ہیں ہم بستر پر فیس بک استعمال کرتے کرتے تھک چکے تھے سو ایک عجیب سی خوشی بھی ہو رہی تھی۔ فیصلہ ہوتے ہی تیاریوں میں لگ گئے. تھوڑا سا واش روم کا تعارف کروائے دیتے ہیں تا کہ آپ بھی سفر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ واش روم دراصل ایک ایسی جگہ ہے جہاں بعض لوگ سوچنے جاتے ہیں اور بعض لوگ نہ سوچنے۔ واش روم دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن پر بیٹھا جاتا ہے اور ایک وہ جن پر لیٹنے کے سٹائل میں بیٹھا جاتا ہے۔ موخرالذکر واش روم سیر کے لیے زیادہ آرام دہ تصور کیے جاتے ہیں۔ واش روم تقریبا ہر گھر میں موجود ہوتا ہے بلکہ اکثر گھروں میں تو گھر کے ہر فرد کے لیے علیحدہ علیحدہ ''سیر پوائنٹ'' بنوائے جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں واش روم کی بجائے ''جنگل پانی'' ہوتے ہیں حالانکہ یہ تاریخ کی بہت بڑی بددیانتی ہے کہ ''جنگل پانی'' میں نہ تو جنگل ہوتا ہے نہ پانی لیکن پھر بھی اسے جنگل پانی کہا جاتا ہے۔

واش روم کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ کسی ایسے ملک کی ایجاد لگتا ہے جہاں ٹیلے وغیرہ نہیں ہوتے ہوں گے۔ پھر جیسے جیسے دنیا اور خوراک ترقی کرتے گئے سہل پسندی اور اسہال پسندی بھی اسی طرح ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے گئے اور واش روم گھر کے کونے سے کمرے کی کمر میں بنائے جانے لگے یعنی سپرٹ سے اٹیچ ہوتے گئے بعید نہیں کہ آنے والے وقتوں میں بستر بھی واش روم میں لگایا جائے۔

واش روم میں ویسے تو کئی چیزیں سکون پہنچانے والی ہوتی ہیں لیکن سب سے مزیدار چیز واش روم کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس آئینے کی خاص بات یہ ہوتی ہے اس میں بندہ خود کو ننگا بھی دیکھ سکتا ہے، قومی سیاست کے ٹائلٹ میں تو ایسی سہولت میسر نہیں۔ اس کے علاوہ واش روم میں لوٹا بھی ہوتا ہے لیکن اس لوٹے کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ ہمیشہ ایک ہی پارٹی کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں سیاستدانوں کو لوٹا کہنا لوٹے کی توہین ہے کیونکہ لوٹے جیسی وفادار چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لوٹے کے علاوہ ٹشو، صابن، (ہاتھ دھونے کے لیے) برش، تیزاب، اور اسی طرح کی کئی اہم چیزیں واش روم میں موجود ہوتی ہیں۔

تو دوستو آخر ہم نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور سیر کی سب سے اہم چیز یعنی موبائل ساتھ لیا اور بیڈ کی ایک سائڈ سے اترنے لگے، اگر آپ نے بھی واش روم کی سیر کی ہو تو آپ کو علم ہو گا کہ موبائل وہ واحد چیز ہے جسے واش روم میں ساتھ لے جایا جائے تو

سفر بہت اچھا اور طویل گزرتا ہے۔ ویسے بھی تاریخ گواہ ہے کہ جو شخص بھی موبائل واش روم میں لے کر گیا ہے بیس منٹ تک واپس نہیں لوٹا، اس کے علاوہ تاریخ اس بات کی بھی گواہی دے گی کہ جب آپ واش روم کی سیر کی انتہا پر ہوتے ہیں یعنی حاجات ضروریہ کی پیک (Peak) پر ہوتے ہیں اس وقت موبائل ضرور بج اٹھتا ہے۔

خیر ہم نے بھی موبائل اٹھایا اور رخت سفر باندھ لیا۔ پہلا قدم اٹھایا پھر دوسرا قدم اٹھایا اسی طرح کوئی دس بارہ قدم اٹھانے کے بعد ہم واش روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ راستے کے یہ دس بارہ قدم ہم سفر کو انجوائے کرتے رہے، کئی جگہوں پر موبائل سے نظر اٹھا کر کمرے کے دوسرے نظاروں پر بھی نظر پڑی لیکن چونکہ یہ سفر ہم کئی بار کر چکے تھے سو نظارے ہماری توجہ حاصل نہ کر پائے۔ خیر کیا خوبصورت دروازہ تھا، خالص کیکر کی لکڑی کا خوبصورت دروازہ جسے اندر کی طرف کھولا جاتا ہے۔ واش روم کا دروازہ عموما سنگل ہی ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایک وقت میں ایک ہی بندہ جاسکتا ہے لیکن بعض گھروں میں دو بندے اکٹھے بھی جاتے ہیں لیکن تین ہو کر نکلتے ہیں۔ تیسرا بندہ تقریبا نو ماہ اندر رہتا ہے (واش روم کے اندر نہیں)۔ خیر ہم سنگل تھے سو ہمیں سنگل ہی اندر جانا تھا۔ پہلا قدم اندر رکھا تو آب و ہوا کی تبدیلی کا احساس ہوا۔ واش روم کا موسم، درجہ حرارت اور آب و ہوا عام کمروں سے مختلف ہوتی ہے بلکہ واش روم میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ بندا اندھا بھی ہو تو اسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ واش روم پہنچ چکا ہے۔

ہم واش روم کے اندر سامنے رکھی کرسی نما بلا کو دیکھتے ہی جمپ مار کر اس پر سوار ہو گئے اور موبائل کھول کر سفر انجوائے کرنے لگے کوئی بیس منٹ کی سیر کے بعد ہمارا سفر اختتام کو پہنچا (کرسی پر بیٹھنے سے لے کر اٹھنے تک کے درمیان کچھ اور واقعات بھی پیش آئے جن کا ذکر کرنا یہاں مناسب نہیں) سیر کے دوران ہمارا سارا دھیان موبائل کی طرف رہا۔ پھر ہم نے ٹشو فلش، لوٹے اور صابن (ہاتھ دھونے کے لیے) کے لوازمات پوری ایمانداری کے ساتھ نبھائے اور سفر کے اختتام پر ایک نظر آئینے پر ڈالی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

حماد احمد، لاہور

جوتا نامہ

جوتا انتہائی اہم چیز ہے اور اس کی اہمیت جاننے کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں اللہ رب العزت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ:

اے موسیٰ! یقین سے جان لو کہ میں ہی تمہارا رب ہوں۔ اب تم اپنے جوتے اتار دو۔ تم اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ (آسان ترجمہ قرآن، سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۱۲،۱۱)۔

مختلف زبانوں اور علاقوں میں جوتیوں کو مختلف ناموں اور القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ کوئی اسے شو (SHOE) کہتا ہے تو کوئی موجڑی، کوئی پاپوش کہتا ہے تو کوئی زیر پائی، کہیں کہیں اسے کفش کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اہل عرب پہلے اسے نعل کے نام سے پکارتے تھے، آج کل حذا کے نام سے پکارتے ہیں۔ جوتے کی بے شمار اقسام ہیں مثال کے طور پر سلیم شاہی، بوٹس، گرگابی، مکیشنز، ہیلز، جاگرز، فلیٹس، پمپس، سینڈلز، سلیپرز، عام چپل، پشاوری چپل، کھڑاؤں وغیرہ وغیرہ۔ موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرنے کے لئے بھی جوتوں کی بہت سی اقسام ہیں جیسے کہ فارمل شوز، برائیڈل شوز، ایوننگ شوز، ڈریس شوز، آؤٹ ڈور شوز، اِن ڈور سلیپرز، واکنگ شوز اور رین اینڈ سنو شوز وغیرہ وغیرہ۔

کچھ ذہین فطین لوگ جوتوں کے حساب سے ہی انسان کی شخصیت بھی بخوبی پہچان لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فلیٹ جوتیاں پہننے والوں کو فطرتاً خاموش طبیعت مانا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی صورتحال میں خود کو با آسانی ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ چھوٹی ہیل والی جوتیاں زیب تن کرنے والی خواتین کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سنجیدہ مزاج ہوتی ہیں، اپنے کام سے کام رکھتی ہیں اور انہیں اردگرد کے حالات و واقعات کی زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ لمبی یا ہائی ہیل جوتیاں زیب تن کرنے والی خواتین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مشکل وقت میں نہیں گھبراتیں اور کبھی بھی با آسانی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی خواتین فطرتاً مغرور اور تنہائی پسند بھی ہوتی ہیں۔ کئی جوتیوں پر مختلف قسم کے پرنٹ بنتے ہوتے ہیں۔ ایسی پرنٹڈ جوتیاں زیب تن کرنے والے لوگ فطری طور پر خوش مزاج اور فیشن کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح رنگ برنگی جوتیاں زیب تن کرنے والے لوگوں کو اکثر اوقات فنون لطیفہ سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔

اردو کے شعراء بھی جوتے کو مختلف ناموں اور صورتوں میں استعمال کرتے پائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ادب کا جانا پہچانا نام، مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں:۔

کمال کفش دوزی، علم افلاطوں سے بہتر ہے

اکبرالہ آبادی نے ہر چیز کی طرح جوتوں پر بھی بہت ہی کاری وار کیا۔ جیسے جوتوں کے دو مشہور برانڈز "باٹا" اور "سروس" آج کل مشہور ہیں، بالکل اسی طرح اکبرالہ آبادی کے زمانے میں "ڈاسن" کمپنی جوتے بنانے اور بیچنے میں ایک خاص پہچان رکھتی تھی۔ اکبرالہ آبادی نے اپنے ایک شعر میں ڈاسن کے جوتے کا تذکرہ کرتے ہوئے نہ صرف علم کی ناقدری کی طرف اشارہ کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ جوتے سے وابستہ ایک محاورے "جوتا چل گیا" کا بھی خوب استعمال کیا۔ یہ دلچسپ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے اِک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اکبرالہ آبادی کے نام سے ملتے جلتے نام کے ہی ایک اور معروف شاعر "نظیر اکبرآبادی" ہیں۔ ان کا شاعرانہ کلام "آدمی نامہ" بہت مشہور ہے، جس کے مندرجہ ذیل بند میں جوتی چوروں کی طرف جس عمدگی سے اشارہ کیا گیا وہ پڑھنے کے لائق ہے:۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی، امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی، قرآن اور نماز، یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد میں جوتیوں کا چوری ہو جانا کوئی معمولی نہیں بلکہ انتہائی اہم مسئلہ ہے، جس کے حل کے لئے شرفائے زمانہ ہمیشہ اپنی سی کوششیں کرتے چلے آئے ہیں۔ بقول شاعر:۔

یوں بولے کوئی دیکھ کے جوتا میرے آگے
گر سامنے جوتا ہو تو سجدہ نہیں ہوتا
میں نے کہا ارشاد بجا آپ کا لیکن
گر پیچھے رکھیں جوتا تو جوتا نہیں ہوتا

معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات تو مسجد کے اندر انتہائی احتیاط سے "چھپائی گئی" چپل بھی غائب ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس کبھی کبھار مسجد کے بیرونی دروازے پر رکھی ہوئی چپل بھی اپنی جگہ پر صحیح سلامت موجود رہتی ہے۔

مسجد میں جوتی چوری ہونے سے بچانے کا مشہور طریقہ یہ ہے کہ جوتوں کا مکمل جوڑا ایک ہی جگہ رکھنے کی بجائے دائیں جوتی کو مسجد کے ایک کونے میں اور بائیں جوتی کو کسی دوسرے کونے میں رکھ دیا جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب جوتی چور بھی اس طریقے سے واقفیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ ایسے ذہین چوروں کو اگر مسجد میں پڑی ہوئی کوئی "اکلوتی" جوتی پسند آجائے تو وہ نماز کے بعد اس جوتی کے نزدیک ہی بیٹھ جاتے ہیں اور جوتی کے مالک کا انتظار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جیسے ہی جوتی کا مالک اپنی جوتی اٹھانے آتا ہے تو اس کی شکل وصورت اچھی طرح نوٹ کر لیتے ہیں۔ یہ جوتی چور اگلی نماز کے لئے بروقت مسجد میں پہنچ کر اس نمازی کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اس کی جاسوسی کرتے ہوئے دوسری جوتی کا خفیہ مقام بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ یوں اگلی نماز ختم ہونے سے قبل ہی جوتی کے مالک کو "ایصال ثواب" پہنچ چکا ہوتا ہے۔

ایک چور نے تو نمازیوں کے جوتے چرانے کا عجیب وغریب انداز اپنایا۔ واردات کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ موصوف اپنے گھر سے طوطے والا پنجرہ لے کر مسجد پہنچ جاتے، جو کہ کپڑے سے ڈھکا ہوا ہوتا۔ مسجد میں جہاں بھی کوئی اچھا جوتا نظر آتا، اس کے قریب ہی پنجرہ رکھ کے نماز میں شریک ہو جاتے۔ جب نمازی حضرات سجدہ میں پہنچتے تو موصوف چپکے سے جوتا اٹھا کر پنجرے کے اندر گھسیڑ دیتے۔ صورتحال کچھ یوں بنتی کہ سر سجدہ میں ہوتا اور جوتا پنجرہ میں۔ کافی عرصے تک یہ خفیہ کاروائی چلتی رہی۔ آخر کار ایک دن موصوف پکڑے ہی گئے۔ پھر ان کے پسند کئے گئے "اجتماعی جوتوں" سے ان کی جو "اجتماعی خاطر تواضع" ہوئی، وہ یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔۔

جوتوں کو بہت سی سزاؤں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ نمرود

کا مشہور قصہ تو آپ نے سن ہی رکھا ہوگا۔ خدائی کا دعویٰ کرنے کی بدولت مالکِ دو جہاں کی طرف سے اس بدبخت کو یہ سزا ملی کہ ایک معمولی اور حقیر سے مچھر نے اس متکبر شخص کے ناک اور دماغ میں اچھی طرح دم کر کے رکھ دیا۔ اس مشکل وقت میں اپنی پریشانی کا حل بھی اس ''احمقِ اعظم'' نے خود ہی تلاش کیا۔ حل یہ تھا کہ وہ نامراد (نمرود) اپنے غلاموں اور درباریوں کے ہاتھوں جتنی زیادہ جوتیاں کھاتا، اتنا ہی زیادہ اسے آرام و سکون محسوس ہوتا۔

برصغیر میں ''کچھ مقامی عدالتیں'' مجرمان کو گدھے پر بٹھا کر جوتوں کا بنا ہوا ہار گلے میں ڈلواتی ہیں اور بعد ازاں جوتوں سے ہی ان معزز مہمانان گرامی سوری ''مجرمان گرامی'' کی تواضع بھی کرواتی ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص کے جرائم کو دیکھتے ہوئے مقامی پنچائیت نے سزا سنائی کہ اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا جائے۔ اسی حالت میں اسے سارے شہر میں گھمایا جائے اور ساتھ ساتھ ''چھترول'' بھی کی جائے۔ جب وہ شخص ''جوتا خوری'' سے فارغ ہوا تو بہت سے لوگ ازراہ ہمدردی (یا زخموں پر نمک چھڑکنے کی خاطر) اس کی تیمارداری کو چلے آئے۔ ایک بولا کہ ''سنا ہے تمہیں جوتے پڑے ہیں؟''۔ موصوف فوری طور پر بولے کہ ''کیا وہ جوتے تھے؟ مجھے تو انتہائی چھوٹی چھوٹی سی جوتیاں معلوم ہو رہی تھیں''۔ دوسرے نے چوٹ لگائی کہ: ''تمہیں تو گدھے پر بھی بٹھایا گیا تھا نا؟''۔ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے: ''ارے یار وہ گدھا تو نہیں تھا، بس ایک معمولی اور چھوٹی سی گدھی تھی، یقین جانو کہ میرے تو پاؤں بھی نیچے زمین پر لگ رہے تھے''۔ تیسرے نے لقمہ دیا کہ: ''تمہارے گلے میں تو جوتوں کا ہار بھی پہنایا گیا تھا نا؟''۔ انتہائی فخر سے جواب آیا کہ: ''پھر کیا ہوا؟۔ یہ کونسا بڑی بات ہے۔ ان میں سے دو جوتیاں تو میری ذاتی تھیں۔ ابھی تک خریداری کی رسید میرے پاس محفوظ ہے''۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ: ''وہ جو تمہارا منہ کالا کیا گیا تھا، اس کے متعلق تو بتاؤ؟''۔ ایک زوردار قہقہہ مارتے ہوئے جواب دیا گیا کہ: ''ان لوگوں کو تو منہ پر کالک تک نہیں ملتی آئی۔ بہت سی جگہوں سے میرا منہ کالا ہوا ہی نہیں تھا۔ بعد ازاں پانی کے دو چھینٹے مارنے سے ہی سارا منہ با آسانی صاف بھی ہو گیا تھا''۔ موصوف کے ان جوابات سے لوگوں کو ایک جانے پہچانے واشنگ پاؤڈر المعروف ''نیلے ذرات والے سرف'' کی مشہوری یاد آ گئی کہ ''داغ تو چلا جائے گا، مگر یہ وقت پھر نہیں آئے گا''۔

جوتوں کو بہت سی مشہور و معروف ہستیوں کی طرف اچھالا

مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کو اپنی بیٹی زیب النساء کیلئے استاد درکار تھا۔ یہ خبر سن کر ایران اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بیسیوں قادر الکلام شاعر دہلی آ گئے کہ شاید قسمت یاوری کرے اور وہ شہزادی کے استاد مقرر کر دیے جائیں۔

ان ایام میں دہلی میں اس زمانہ کے نامور شاعر برہمن اور میر ناصر علی سرہندی بھی موجود تھے۔ نواب ذوالفقار علی خان، ناظمِ سرہند کی سفارش پر برہمن اور میر ناصر کو شاہی محل میں اورنگزیب کے روبرو پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے برہمن کو اپنا کلام سنانے کا حکم ہوا، برہمن نے تعمیلِ حکم میں جو غزل پڑھی، اسکا مقطع تھا۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازم برہمن آوردم

(میرا دل اسقدر کفر آشنا ہے کہ میں جب بھی کعبہ گیا، برہمن کا برہمن ہی واپس آیا۔)

گو یہ محض شاعرانہ خیال تھا اور تخلص کی رعایت کے تحت کہا گیا تھا لیکن عالمگیر انتہائی پابند شرع اور سخت گیر بادشاہ تھا، اسکی تیوری چڑھ گئی اور وہ برہمن کی طرف سے منہ پھیر کے بیٹھ گیا۔

میر ناصر علی نے اس صورتِ حال پر قابو پانے کیلئے اٹھ کر عرض کی کہ جہاں پناہ اگر برہمن مکہ جانے کے باوجود برہمن ہی رہتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، شیخ سعدی بھی تو یہی کہہ گئے ہیں۔۔

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

(عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ بھی چلا جائے وہ جب واپس آئے گا، گدھے کا گدھا ہی ہوگا۔)

عالمگیر یہ شعر سن کر خوش ہو گیا اور برہمن کو معاف کر دیا۔

گیا۔ اس معاملے میں سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ مؤرخ کہتے ہیں کہ پاکستان میں اس سلسلے کا آغاز بھٹو کے دور میں ہی ہونے کو تھا مگر وہ اپنی ذہانت کی بدولت بال بال بچ گئے۔ دراصل ہوا کچھ یوں کہ ایک بہت بڑے مجمع عام سے خطاب کے دوران جب لوگوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے بھٹو کو جوتیاں دکھائیں تو انہوں نے خطاب کے دوران ہی فوری طور پر اپنی بات کا رخ تبدیل کر لیا اور بولے ''مجھے علم ہے کہ چمڑا بہت زیادہ مہنگا ہو گیا ہے، لہٰذا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے سستا کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔'' مجمع اس لالی پاپ کی لالچ میں آ گیا اور بھٹو بچ گئے۔

جوتوں کے جدید سے جدید تر استعمال کے لئے بھی سائنسدانوں نے بہت سی تحقیقات کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب جوتوں کو پاؤں میں پہننے کے علاوہ بھی ان سے بہت سے کام لئے جا سکتے ہیں۔ ایک امریکی کمپنی نے حال ہی میں خواتین کے لئے سیلفی لینے والے جوتے متعارف کروا دیئے۔ ان جوتوں کے آگے خصوصی طور پر موبائل فون رکھنے کیلئے جگہ بنائی گئی ہے جہاں موبائل فون رکھنے کے بعد اپنا پاؤں اوپر اٹھا کر با آسانی سیلفی بنائی جا سکتی ہے۔ جرمن ماہرین ایسے جوتے بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں جن سے آپ پیدل چل کر بجلی پیدا کر سکتے ہیں۔ چلنے کی سپیڈ جتنی تیز ہوگی اتنی ہی جلدی بجلی پیدا ہوگی اور جتنا زیادہ چلیں گے، اتنی ہی زیادہ بجلی پیدا ہوگی۔ اسی طرح ایک انڈین کمپنی نے ایسا ''سمارٹ جوتا'' تیار کیا، جس کے تلوں میں ایک اپلیکیشن اور گوگل میپس کا امتزاج موجود ہے، جس کی بدولت نئی منزل کا حصول بھی با آسانی ممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی کو منزل کی طرف نکلنے سے پہلے اپنی منزل مقصود کا مقام طے کرنا ہوتا ہے۔ بعد ازاں جوتا انسان کی خود بخود رہنمائی کرتا رہتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے فلاں موڑ سے دائیں طرف یا بائیں طرف مڑ جاؤ۔ ایک امریکی کسان نے تو تمام سائنسی ترقیوں اور دریافتوں کو مات دے دی۔ موصوف ایک سو گائے، دو سو مرغیوں، دو بکریوں، چار گھوڑوں اور دو گدھوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام جانوروں کو جدید اقسام کے جوتے پہنا رکھے ہیں۔ ان کے بقول جوتے پہنانے کے بعد سے ان کی مرغیاں پہلے سے زیادہ انڈے دے رہی ہیں۔ گائے اور بکریاں پہلے سے زیادہ دودھ دیتی ہیں اور گھوڑے، گدھے پہلے سے زیادہ تیزی سے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ سست اور کاہل لوگوں کے لئے ایک امریکی کمپنی نے ''ائیر میگ'' کے نام سے ایسے جوتے بھی متعارف کروا دیئے ہیں جو کہ خود بخود ان کے تسمے تک باندھ دیتے ہیں۔

تسموں والے جوتوں کا خود بخود بند ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں، خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لئے، کیونکہ عام طور پر بچے باقی لباس جلدی زیب تن کرنا سیکھ جاتے ہیں مگر تسمے باندھنے کا کام آخر میں بھی بمشکل ہی سیکھ پاتے ہیں۔ یوں یہ بچے بڑے لوگوں کیلئے مسلسل مشکل و مشقت کا سبب بنے رہتے ہیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ کھیلنے کودنے کے دوران عام طور پر ان ہی بچوں کے تسمے زیادہ کھلتے ہیں جنہیں خود سے باندھنا نہیں آتے اور جن بچوں کو خود سے تسمے باندھنا آتے ہیں وہ ہمیشہ یہ احتیاط ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی کھیلتے ہیں کہ اگر تسمے کھل گئے تو دوبارہ بھی خود ہی باندھنا پڑیں گے۔ اسی مناسبت سے ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک سکول میں جب چھٹی کا وقت ہوا تو نرسری کلاس کی ٹیچر اپنی کلاس کے بیس عدد بچوں کو اچھی طرح سے بوٹ پہنا کر تسمے باندھنے لگی۔ جھک جھک کر اس بیچاری کی کمر میں درد ہونے لگا۔ بیسواں اور آخری بچہ انتہائی شرمیلا اور خاموش طبیعت کا تھا، جب ٹیچر اسے جوتے پہنا چکی تو بچہ انتہائی اطمینان سے بولا: ''ٹیچر! یہ میرے جوتے نہیں ہیں''۔ ٹیچر کو بہت غصہ آیا، بے بسی کی وجہ سے اس کا دل چاہا کہ زار و قطار رو دے۔ مگر اس نے ہمت کر کے خود پر قابو پایا اور بچے کے جوتے اتارنے لگی۔ جوتے اتار کر ابھی اس نے اپنی کمر سیدھی کی ہی تھی کہ بچے کی پھر سے آواز آئی: ''ٹیچر! پوری بات تو سن لیں۔ یہ جوتے میرے نہیں بلکہ میرے بھائی کے ہیں، مگر امی نے صبح کہا تھا کہ آج تم یہ پہن کر چلے جاؤ''۔ اس کے بعد ٹیچر کی جو حالت ہوئی، وہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

جوتے کا جادو ہمارے معاشرے میں اس وقت بھی سر چڑھ کر

بولتا ہے، جب دولہا میاں کے ساتھ ''دودھ پلائی'' کے بہانے ''جوتا چھپائی'' کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کئی سمجھدار ''اکاؤنٹنٹ دولہے'' تو اس صورتحال کا ایڈوانس میں ہی انتظام کر لیتے ہیں۔ اپنی شیروانی کے نیچے وہ ایک عدد خفیہ ''سلوکا'' زیب تن کر لیتے ہیں۔ اس ''سلوکے'' کی دو جیبوں میں ہی ''سٹپنی'' یعنی اضافی جوتے رکھ لیتے ہیں تا کہ بوقت ضرورت کام آسکیں اور جرمانے کی ادائیگی کے دوران پیسوں کی بچت بھی ہو جائے۔ بات دولہے کی ہوئی ہے تو یہاں یہ بات بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ کسی زمانے میں رشتوں کے حصول کے لئے لڑکے والے اپنی جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے اور لڑکی والوں کی طرف سے تب تک ہاں نہ ہوتی تھی جب تک لڑکے والوں کے جوتے اچھی طرح سے گھس نہ جاتے تھے۔ اب معاملہ الٹ ہو چکا ہے۔ رشتہ بعد میں طے ہوتا ہے، جوتے گھسانے کی زحمت بھی کم ہی کی جاتی ہے اور تو اور نئے جوتے بھی کافی پہلے سے ہی پسند کر کے رکھ لئے جاتے ہیں۔

استاد بشیر کو جوتوں سے متعلق بھی بہت زیادہ معلومات ہیں جو کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو سناتے رہتے ہیں۔ ایک لیکچر میں وہ فرمانے لگے کہ جب ہمیں اپنا پسندیدہ جوتوں کا جوڑا پہننے کا موقع مل جائے تو ہمارا دماغ بہت اچھا محسوس کرتا ہے، حالانکہ جوتا پاؤں میں ہوتا ہے اور دماغ کھوپڑی میں۔ لیکن ''خیبر تا کراچی'' جتنی طویل مسافت ہونے کے باوجود نئے جوتے کی خوشی جسم کے ہر کونے تک ''گوگل'' کی سپیڈ سے پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے جوتوں کے شوقین لوگ خوشیوں کے حصول کے لئے اکثر یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ کاش میں اپنی پسند کے جوتے انٹرنیٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کر سکتا۔ مغربی معاشرے کی بدتہذیبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن استاد بشیر فرمانے لگے کہ مغرب میں ہر عورت کو سال میں سات مرتبہ پیار ہوتا ہے، چھ مرتبہ جوتوں سے اور ایک بار سوٹ سے۔ استاد بشیر نے یہ بھی بتایا کہ مغرب میں چالیس فیصد خواتین اپنے شوہروں کی طرف جوتا ضرور پھینکتی ہیں لیکن باقی ساٹھ فیصد خواتین اس طرح کی توہین بالکل بھی نہیں کرتیں ''اپنے جوتوں کی۔'' استاد بشیر کے بقول کسی کے غلط کام پر جائز تنقید کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس مقصد کے حصول کا سب سے آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جس شخص پر تنقید کرنی ہو اس کے جوتے پہن کر کم سے کم ایک میل دور چلے جاؤ۔ وہاں پہنچ کر اسے موبائل فون پر کال ملاؤ اور بھرپور تنقید کر لو۔ یوں اس شخص کے جوابی ردعمل سے با آسانی بچت ہو جائے گی، کیونکہ مخالف شخص ننگے پاؤں ایک میل کی مسافت طے کر کے آپ کا ستیاناس کرنے کے لئے بالکل بھی نہیں آئے گا۔

ایک دن دورانِ لیکچر استاد بشیر نے وائٹ بورڈ پر پوائنٹس کی صورت میں سمجھایا کہ درج ذیل تین چیزیں دنیا کی ہر عورت کا موڈ اچھا کر دیتی ہیں

نمبر ایک: شوہر کی طرف سے ملنے والا پیار

نمبر دو: شوہر کی طرف سے شاپنگ پر لے جانا

نمبر تین: شاپنگ پر جا کے یہ معلوم ہو جانا کہ جوتوں پر اسی فیصد سیل لگی ہوئی ہے

کئی خواتین کو اکثر اوقات یہی پریشانی لاحق رہتی ہے کہ ان کے پاس پہننے کے لئے بہت سے جوتے دستیاب ہیں مگر پاؤں صرف دو ہی ہیں۔ ایک عقل سے پیدل خاتون نے الٹے جوتے زیب تن کر رکھے تھے۔ میں نے ''توجہ دلاؤ نوٹس'' پر عرض کیا کہ محترمہ آپ نے غلط پاؤں پر جوتا پہن رکھا ہے۔ جواب دیا کہ میرے پاس تو محض دو ہی پاؤں ہیں، اگر یہ بھی غلط ہیں تو پھر درست پاؤں کہاں سے لاؤں؟ یہ کہتے ہی زار و قطار رو پڑیں۔ ایسی خواتین خوش رہنے کے لئے آخر یہ کیوں نہیں سوچ لیتیں کہ انسان تو جوتوں کے بغیر بھی چل سکتا ہے مگر جوتے انسانوں کے بغیر بالکل نہیں چل سکتے۔ (اور کئی بار تو چلتے بھی انسانوں پر ہی ہیں)۔ یہی سوال میں نے جب استاد بشیر سے پوچھا تو وہ فرمانے لگے کہ خواتین ایسا اس لئے نہیں سوچ سکتیں کیونکہ چاکلیٹس اور جوتوں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں چیزیں خواتین کے پاس جس قدر زیادہ ہوں، فطرتاً وہ اتنی ہی زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کی غیر موجودگی میں خواتین کا خوش رہنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔

احمد سعید

عظیم کرکٹر

آٹھویں میں سیکنڈ پوزیشن آئی تو بڑی شرمندگی ہوئی کہ دس نمبروں سے پہلی پوزیشن رہ گئی۔ میٹرک میں انتالیسویں پوزیشن آئی تو بہت خوشی ہوئی کہ دس نمبروں سے فیل ہونے سے رہ گیا۔

دونوں جماعتوں کے حوالے سے میں خاصہ معاملہ فہم ثابت ہوا تھا۔ اِس لئے میٹرک میں ہر ایک کے معاملات میں ٹانگ اڑانا شروع کردی۔ بس کمیٹیوں والی مائی نہ بن سکا۔ لگائی بجھائی میں ماہر جو نہ تھا۔ آٹھویں میں سیکنڈ پوزیشن پہ سب نے مبارکباد دی تو میں نے پوری پوری ہی وصول کی۔ میٹرک میں بھی میں نے مبارکباد وصول کی لیکن پوری گرمجوشی سے کہ شکر ہے بال بال بچ گئے۔ ''ہیڈ اینڈ شولڈر'' جو استعمال کرتا تھا۔

نویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد اگر کسی نے آٹھویں جماعت کے نمبر پوچھتے تو میری طرف غصے سے دیکھتا کہ یہ ہمارے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ کئی اُساتذہ کو آٹھویں کا سرٹیفکیٹ دکھاتا پھر کہیں جا کر اُن کا غصہ ٹھنڈا پڑتا، وہ بھی چند لمحوں کیلئے اور پھر غصہ چڑھ جاتا کہ اگر آٹھویں میں اتنے نمبر لئے تھے تو اب اُس سے آدھے ہی لے لیتے۔ میں نے کہا کہ انضام الحق پہ ''بیڈ پیچ'' آیا یہاں تک کہ عمران خان پہ آیا اور کس کس کھلاڑی پہ نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھے کھلاڑی ہو جو بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔

کھلاڑیوں سے یاد آیا کہ میں نویں جماعت میں تھا تو ''انڈر 16'' کے ٹرائل شروع ہوئے اقبال سٹیڈیم میں، اور میں اپنے آپ کو پہلے ہی ایک عالمی کھلاڑی تصور کرتا تھا، سو چل دیئے۔ ہارڈ بال کبھی کھیلی نہ تھی، اِس لئے لباس بھی نہ تھا۔ فوری طور پر کرکٹ کا لباس، بیٹ، پیڈ، ہیلمٹ اور انتہائی اہم گارڈ خریدنے کیلئے نکل پڑا۔ پھر سوچا کہ اگر سلیکٹ نہ ہوا تو بعد میں کھیلنا تو ''ٹینس بال'' سے ہی ہے تو لباس کے بغیر ہی سٹیڈیم چل پڑا۔ کرکٹ کے لباس کی بات کر رہا ہوں ویسے تو مختلف رنگوں کا ''ٹروزر'' اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ بڑے بہنوئی مجھے اسٹیڈیم چھوڑنے آئے۔ اندر داخل ہوا اور بیٹنگ کی لائن میں لگ گیا۔ نہ ہاتھ میں بیٹ، نہ ٹانگوں پہ پیڈ، نہ سر پر ہیلمٹ، بس چالان ہونے ہی والا تھا کہ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی جاننے والا پر کوئی نہ ملا تو کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی طرح دوستی نکالنا شروع کردی۔ بھئی لوگ رشتہ داریاں نکال لیتے ہیں کیا میں دوستی نہیں نکال سکتا تھا؟ اتنی جلدی میں جتنی دوستی ہو سکتی تھی اُس سے صرف پیڈ اور ہاتھوں کے دستانے ہی ہاتھ آئے اور لگا رہا لائن میں۔ اب باری بہت قریب آچکی تھی۔ بلا کسی صورت کوئی دینے کو تیار نہ تھا۔ باری سر پر تھی، مشکل بھی سر پر ہی۔ جب میرے آگے ایک بلے باز رہ گیا تو میں کبوتر باز بن گیا۔ جیسے کبوتر باز کبوتر پکڑنے کیلئے کبوتر کو ایک سیکنڈ کی مہلت نہیں دیتا۔ اِس طرح میں نے جب بلے باز اپنی باری لیکر ابھی سرزمین کرکٹ (پچ) سے

باہر نہیں آیا تھا کہ اُس پر ایسے جھپٹا جیسے بلی چھچھڑوں پر۔ میرے پہلے ہی وار پہ وہ بوکھلا گیا دوسرا وار میں نے کیا نہیں بلکہ اُسے سمجھایا کہ یہ وار نہیں پیار ہے۔ آپ اِس قدر اچھا کھیلتے ہیں کہ آپ کی صلاحیتیں اِس بلّے میں بھی داخل ہوگئیں ہیں۔ جنابِ مَن! میں باری لیکر ابھی آیا۔ یہ دیکھیں بس میری باری بھی آئی کھڑی۔ اور اُسے مانگا کہاں؟ بلکہ چھین لیا اور شکریہ ادا کیا، اور مسلسل داد دیتا گیا کہ واہ کیا کھیل کر آئے ہیں؟ اب وہ بھی جانتا تھا کہ وہ کیا کھیل کر آیا ہے؟ کیونکہ اُس سے کوئی ایک گیند بھی کھیل تک نہ ہوئی تھی۔ بھئی یہ بھی تو کمال ہی تھا کہ بیس پچیس گیندیں کھیلیں اور کسی گیند کو بلے کے نیچے نہیں لگنے دیا۔ یہاں تو پورا بندہ ہی اپنی زوجہ کے تھلے (نیچے) لگ جاتا ہے۔ اتنے میں اُسنے اپنا سازوسامان اُتارا تو میں پھر دوڑا دوڑا اُسکے پاس گیا۔ داد دی اور ساتھ میں اُس کا ''گارڈ'' بھی اُٹھا لایا اور ہاتھ کے اِشارے سے اُسے کہنے لگا کہ یار! یہ بہت ضروری تھا، بیٹ سے بھی زیادہ۔

میں ''ہیلمٹ'' پہنے ہوئے نہ تھا اور پہلا باؤلر بھی شعیب اختر نما تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ لمبے لمبے پاؤں، اب میں نے دو چیزیں بچانی تھیں ایک منہ اور ایک وکٹ، خیر بچاتے چلے گئے۔ کوئی تین ''اوورز'' کے بعد ''سپن باؤلر'' جسے گوگلی بھی کہتے ہیں گیند کروانے کیلئے آیا اور مجھے سکھ کا سانس آیا پھر میں نے اِدھر اُدھر بلا گھمانا شروع کر دیا۔ میری ففٹی نہیں ہوئی تھی۔ بلا گھمانے سے مراد ''شارٹس'' لگا رہا تھا۔ سلیکٹر سمجھ گیا کہ یہ شارٹ کٹ کھیل رہا ہے۔ وہ بھی اپنی طرف سے بڑے وقار یونس تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر تیز باؤلنگ لگائی، پر میں نے دوڑ نہ لگائی، ڈٹا رہا منہ اور وکٹ بچانے کیلئے۔ پھر ایک دم خیال آیا کہ عزت بھی بچانی ہے صرف منہ اور وکٹ ہی نہیں۔ اسی اثناء میں نظریں نیچے گئیں، باؤلر سر پہ تھا، نظر اوپر اُٹھائی تو وکٹ جا چکی تھی۔ جانے عزت کا کہاں سے خیال آ گیا؟ جبکہ ''گارڈ'' میں نے پہنا ہوا تھا۔ میں کلین بولڈ ہو چکا تھا بلکہ صرف بولڈ کیونکہ گھر سے میں نہا کر نہیں آیا تھا تو کلین (Clean) تو نہ ہوا اور بولڈ ویسے ہی بہت تھا۔

میں پچیس بلے بازوں میں شامل نہ ہوسکا تو باؤلنگ میں

قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ سلیکٹر نے کہا کہ تم تو بیٹسمین ہو۔ میں نے کہا جی نہیں، میں آل راؤنڈر ہوں۔ سلیکٹر کہنے لگا: بیٹا ایک ہی چیز کا ٹیسٹ دے سکتے تھے اور ویسے بھی کرکٹر ایک چیز میں ''سپیشلسٹ'' ہوتا ہے۔ میں نے کہا، جی غلطی ہوگئی میں نے تو دینا ہی باؤلنگ کا ٹیسٹ تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ کسی قسم کی غلطی ہے۔ ساتھ ہی میں نے عمران خان، وسیم اکرم، عبدالرزاق اور شاہد آفریدی کی مثالیں دیتے ہوئے اپنی مثال دی کہ میں بھی اِن کی طرح دونوں چیزوں میں سپیشلسٹ ہوں۔ وہ گھبرایا کہ اس نے

تو اپنے آپ کو پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی بھی بنالیا ہے۔ اِس سے پہلے کہ یہ بغیر ٹیسٹ دیئے اُس ٹیم میں حقیقتاً شامل ہوجائے اِس سے فوری باؤلنگ کا ٹیسٹ بھی لے ہی لیں۔

سلیکٹر صاحب نے مجھے بھی گیند تھمادی اور کہا کہ شروع ہوجاؤ۔ میں نے سوچا کہ دو چار ''اوورز'' کروائیں گے پر کہاں جی، میں لگا رہا اور بس لگا ہی رہا۔ آٹھ نو اوورز لگاتار کروا کر مجھے کوئی جوس بھی نہ پلایا بلکہ نمک والا پانی پلادیا اور پھر میں لگا رہا۔ اتنی'' باؤلنگ'' کروا کر مجھے محسوس ہوا کہ میں جانے کب کا سلیکٹ ہوچکا ہوں، پر سلیکٹر نے کچھ لڑکے سلیکٹ کرکے مجھے اگلے دِن پھر سلیکشن راؤنڈ کے لئے بلالیا۔ میں سمجھ گیا سلیکٹر کے ذہن کو کہ وہ میرے ذہن کو سمجھ گیا ہے۔ میں نے تو اُس کی جان چھوڑنی نہیں اور اُس نے میرے لئے یہ طریقہ رائج کیا ہے کہ جس دِن تک سلیکشن ہونی ہے اِسے باؤلنگ ٹیسٹ کیلئے بلاتے جاؤ کیونکہ اگر اِس کو باؤلنگ میں بھی آؤٹ کیا تو اِس نے تو ''جینٹی روڈ'' بن کر سامنے آجانا ہے یعنی کہے گا کہ آپ مجھے ''فیلڈنگ'' میں موقع دیں اور تو اور اُس کا خیال تھا کہیں میں ایمپائرنگ کا ٹیسٹ نہ اُسے دینا شروع کردوں۔ اور اِس کے لئے بھی ایک واضح مثال علیم ڈار کی۔ اگلے دِن میں بہت تھکا ہوا تھا پچھلے دِن سارا دِن سلیکٹر نے باؤلنگ پر جو لگائے رکھا۔ وہ مجھے سلیکٹ نہیں کر رہا تھا۔ ٹیسٹ میچ کھلا رہا تھا، اور مجھے عبدالرزاق یا محمد سمیع سمجھ رہا تھا کہ جتنی مرضی ''اورز'' کروائی جاؤ نہ اِس نے بولنا ہے نہ تھکنا، پتہ نہیں یہ دونوں باؤلر کیا چیز ہیں؟ تھکتے ہی نہیں، ہاں سگریٹ نہیں پیتے ہوں گے۔ اِس طرح سے تو ایک آدھ باؤلر ایسے بھی ہیں۔ جو پیتے ہی صرف سگریٹ ہوں گے۔ تھکے ہی رہتے ہیں۔ اُن کو سگریٹ لے بیٹھی، محمد عامر کو نو بال اور آصف کو تو ویسا ملک ہی اور مجھے یہ سلیکٹر لے بیٹھا تھا۔ صبح امی جان نے اُٹھایا تو میں نے کہا: میں نے نہیں جانا سلیکشن کیلئے۔ کیونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میں سلیکٹ ہوچکا ہوں صرف اِس سلیکشن کے اختتام تک باؤلنگ کروانے کیلئے۔ اُدھر سے ابا جی کی گرجتی ہوئی آواز آئی کہ کیوں نہیں جانا؟ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا کہ جی کس نے نہیں جانا؟ میں تو نہا کر بس نکل ہی پڑا ہوں اور پھر اپنے ایک دوست کے ہمراہ سٹیڈیم پہنچا۔ آج سلیکٹر صاحب نے ہر چیز سفید رنگ کی پہنی ہوئی تھی۔ مجھے لگا ایمپائر کی جگہ کوئی ''بغلا'' کھڑا ہے کیونکہ وہ تھے بھی کافی سمارٹ اور جتنے دِن سے میں آرہا تھا جو کچھ بھی سفید پہنیں ٹوپی کالی ہی ہوتی۔ تھوڑا سا آگے گئے تو پتہ چلا کہ وہ سلیکٹر ہی تھے آج بغلے بغلے۔ : (بدلے بدلے) محسوس ہورہے تھے۔ گیند تھمادی مجھے اور میں پھر شروع ہوگیا، سارا دِن باؤلنگ کرواتا رہا۔ سارا دِن بیٹنگ کرواتے تو یقین کریں میں انہیں ناشتہ بھی کرواتا وہ بھی پولی کے پایوں کا یا حفیظ پوری ہاؤس سے پوڑیاں۔ آج مجھ سے کچھ ''وائڈ'' بھی زیادہ جارہے تھے جو کہ میرے حق میں جارہے تھے۔ کیونکہ شام کو سیشن کے اختتام پر سلیکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ بھئی آپ سلیکٹ نہیں ہوئے۔ میرا دِل کیا کہ انہیں گلے لگالوں کہ آپ کا بے حد شکریہ۔ کہیں کل پھر سارا دِن باؤلنگ کیلئے نہ بلالینا۔

محمد علی بمقابلہ محمد علی

محمد علی باکسر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے جس طرح کچھ سال قبل ہمارے اپنے فلمی اداکار محمد علی ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ دونوں اپنے فن کے دھنی تھے اور بے حد اچھے انسان بھی تھے لیکن ایک بات ہمیں ماننی پڑے گی کہ محمد علی باکسر کو ہم فلمی اداکار محمد علی سے بہتر مسلمان سمجھتے رہے جسکی وجہ شاید ہمارے والے محمد علی کی فلمی دنیا سے وابستگی ہوسکتی ہے کیونکہ ہمارے دین میں فلموں میں کام کرنے پر پابندی ہے اور معاشرہ بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ ہاں البتہ پوری دنیا کے سامنے جا گھسیا پھن کر کسی کو گھونسے مارنا ٹھیک ہے۔ بچپن میں محمد علی باکسر کے پوسٹر کمرے کی دیوار پر لگانے پر کوہ پابندی نہیں تھی البتہ گھر میں محمد علی اداکار کے ذکر پر لوفر کا لقب ملنے میں دیر نہیں لگتی تھی اور اگر یہ غلطی اسکول میں ہوتی تو استاد کلاس روم سے نکال دیتے تھے۔ محمد علی باکسر ہمارے لئے ہمیشہ باعث افتخار رہے مگر محمد علی اداکار پاکستانی فلمیں دیکھنے والے "جاہل اور گنوار" تجے سے تعلق رکھنے والوں سے منصوب کئے جاتے رہے۔ جہاں محمد علی باکسر کے حقیقت پر مبنی اور ناک منہ سے خون نکال دینے والے گھونسے ہم سراہتے رہی وہاں محمد علی اداکار کے جھوٹ موٹ کے مکّوں کو، جن سے "ھشوم-پا" کی آواز کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا تھا، مزاق کا نشانہ بناتے رہے۔ محمد علی باکسر جب بھی ہمارے ڈرائنگ روم میں آئے بغیر قمیض کے آئے اور ہم انہیں بہ خوشی برداشت کرتے رہے لیکن محمد علی اداکار کے گریبان کے کھلے ہوئے دو بٹن ہم سے گوارا نہ ہوسکے۔ خیر۔۔۔اب چونکہ دونوں محمد علی دنیا میں نہیں رہے اس لئے دونوں کی مغفرت کی دعا کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں محمد علیوں کو معاف کرے اور جنت میں اعلیٰ درجے عطا فرمائے۔ آمین

عظیم خواجہ

محمد ایوب صابر

فیس بُکی شاعر

کتابی چہرہ شاعر سے مراد لمبوترا چہرہ نہیں بلکہ فیس بک شاعر ہے۔ آجکل شاعر بننے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ فیس بک پر اپنی آئی ڈی بنالیں اس کے بعد آپ خود کو شعراء کی فہرست میں شمار کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست کو کسی نے بتایا کہ فیس بک پر آئی ڈی ہونا زبان وبیان کے علم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ وہ کہنے لگا پھر تو میں بھی شاعر بن سکتا ہوں کیونکہ زبان وبیان پر عبور حاصل کرنا منہ زور گھوڑے پر سواری کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس فیس بک پر آئی ڈی بنانے میں پانچ منٹ درکار ہیں۔ میں آپ کو فیس بک شاعر بننے کا آسان اور مکمل طریقہ بتا دیتا ہوں۔ آپ میل ہوں یا فی میل لیکن فیس بک آئی ڈی بنانے کے لئے ''ای میل'' ایڈریس ہونا ضروری ہے کیونکہ فیس بک تو ای میل کے پیٹ سے جنم لیتا ہے۔ اس لئے ای میل موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کے پہلے پائدان پر پاؤں رکھ لیا گیا ہے۔ اب چہرے پر ''اقبالی سنجیدگی'' طاری کر کے ایک عدد تصویر بنا لیں اگر پس منظر میں کتابوں کی الماری نظر آ رہی ہو تو شاعر ذرا رعب دار ہو جاتا ہے۔

اب فیس بک سے شعراء تلاش کر کے ان کو اپنی فرینڈز لسٹ میں شامل کرنا شروع کر دیں۔ صاحبو! شعراء سے زیادہ شاعرات کا آپ کی فرینڈز لسٹ میں ہونا آپ کی شہرت کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ ہاں اپنی لسٹ پر پرائیویسی لگانا مت بھولیں ورنہ آپ کا ہی کوئی دوست آپ کے نئے دوستوں کو ورغلا کر اپنی لسٹ میں شامل کر سکتا ہے۔ اس طرح دوستوں کو کھلی چھوٹ دینے سے وہ آوارہ کبوتر کی طرح کسی کی بھی منڈیر پر بیٹھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کے کمپیوٹر میں فوٹو شاپ پروگرام ہے تو اس کی مدد سے اداس سی خوبصورت لڑکی کی خیالی تصویر اپنی نظم یا غزل کے پس منظر میں ڈیزائن کر کے دوستوں کو ٹیگ کرنا شروع کر دیں پھر دیکھیے کس طرح کمنٹس آتے ہیں اور لوگ کس قدر آپ کی شاعری کے حق میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ یہ سب آپ کی غزل یا نظم سے زیادہ اس حسین تصویر کا کمال ہو گا جو آپ شاعری کو سپورٹ کرنے کے لئے ڈیزائن کریں گے۔ اگر آپ نے دوستوں کو شاعری ٹیگ کر دی اور اس کے باوجود کچھ بے قدرے لوگ گرمجوشی سے کمنٹس کرنے کی بجائے خود کو آپ کی شاعری سے لاتعلق رکھنے پر بضد ہوں تو بھی آپ ہمت نہ ہاریں، اب چاٹ بکس میں جا کر اُن کے دماغ چاٹیں، یہاں تک کہ وہ آپ کی شاعری کو سندِ پسندیدگی عطا کرنے کا اعتراف کر لیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ کی یہی بے سروپا

شاعری سخنِ پائیدار کا درجہ حاصل کر لے گی۔

مجھے فیس بک کرتا دھرتا مارک زکر برگ سے ایک شکایت ہے کہ وہ خود تو دنیا کے دس امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل ہو گئے لیکن اپنے صارفین کو پانچ ہزار فیس بک فرینڈز میں صرف پچاس لوگوں کو پوسٹ ٹیگ کرنے کی سہولت پر ٹرخا دیتے ہے۔ اب پانچ ہزار دوستوں سے پہلے پچاس خوش نصیبوں کے نام تلاش کرنا کابینہ تشکیل دینے سے بھی مشکل مرحلہ ہے۔ فیس بک پر شاعر جب پچاس فرینڈز کو اپنی شاعری ٹیگ کر لیتا ہے تو فیس بک کی جانب سے "انتہائے ٹیگ" کا ہتھوڑا سر پر برستا ہے۔ اُس وقت ایک لمحے کو دل چاہتا ہے کہ ہم اپنی فیس بک آئی ڈی بند کر دیں یا پھر کسی نہ کسی کا سر پھوڑ دیں۔ اِن سب مشکلات کے باوجود بھی "فیس بکی" شاعر ہونا کسی اعزاز کے کم نہیں۔

ایک زمانہ تھا جب برسوں کسی استاد شاعر کے حقے کی چلم تازہ کرنے اور ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بعد مصرعہ سیدھا کرنے کے فن سے آشنائی حاصل ہوتی تھی۔ علمِ عروض کے لئے برسوں استاد کی تابعداری میں گزارنے پڑتے تھے اس کے بعد بمشکل ہی یہ علم ہاتھ آتا تھا۔ اب اتنے جھنجھٹ کون پالے؟ خود کو ہی استاد سمجھتے ہوئے اپنی شاعری فیس بک پر اپ لوڈ کر لیں، پھر دیکھیں کس طرح دھڑا دھڑ کمنٹس کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ مشاعرے میں شاعر اکثر چہک چہک کر شعر سناتا ہے تا کہ داد کے ڈونگرے اس پر بھی برس پڑیں۔ مشاعرے میں جانے سے پہلے کتنی مشقت سے خود کو عام انسان سے شاعر کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے کیونکہ شاعر وہ جو حلیے سے ہی پہچانا جائے لیکن فیس بک پر اتنی تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف آپ کو کمپیوٹر کا تھوڑا سا نالج ہونا چاہیے پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کے اور شہرت کے درمیان حائل ہونے کی غلطی نہیں کرے گی۔ ماضی میں کسی بھی شاعر کے لئے بین الاقوامی سطح پر قارئین کو اپنی شاعری سے متاثر یا متاثرہ کرنا فرہاد کی طرح دودھ کی نہر کھودنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا مگر فیس بک نے کام آسان کر دیا ہے۔

ہمارا ایک دوست شاعر "اداس ٹوبہ ٹیک سنگھی"، شہر کے دور افتادہ گاؤں میں رہتا ہے۔ آج تک اُس نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے بڑا شہر نہیں دیکھا، اس کے باوجود لندن، پیرس، نیویارک اور ٹورانٹو میں قیام پذیر اردو دان طبقہ اس کی دسترس میں ہے۔ وہ فخر سے کہتا ہے کہ پوری دنیا ہی میرے حلقہء احباب میں شامل ہے۔ سحر انصاری، امجد اسلام امجد، راحت اندوری اور عطاء الحق قاسمی کو اپنے مقرب دوستوں کی فہرست میں شامل سمجھتا ہے۔ گاؤں کے پڑھے لکھے لوگوں کو بتاتا ہے کہ آج سحر انصاری اور راحت اندوری نے اس کی شاعری نہ صرف پڑھی ہے بلکہ اسے پسند (like) بھی کیا ہے، گویا اب وہ نالائق شاعر نہیں رہا کیونکہ اُردو کے نامور شعراء نے اسے لائق کر دیا ہے۔

> مجھے ہنسنا ہنسانا پسند ہے لیکن کچھ لوگوں کا ہنسنا ہنسانا دیکھ کر مرثیہ گوئی کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ایک صاحب ہیں جو کسی معمولی سی بات پر ہنستے ہیں اور پھر ہنستے چلے جاتے ہیں۔ اِن کا مخاطب انتظار کرتا ہے کہ ان کی ہنسی ختم ہو تو وہ آگے بات بڑھائے لیکن ان کے آدھے جملے پر یہ صاحب پھر سے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں اور اِتنا ہنستے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے جس پر وہ دھوتی کا پلو اوپر اُٹھا کر آنکھ صاف کرتے ہیں، دوسرے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔
>
> **ہنسنا منع ہے از عطاء الحق قاسمی**

ایک زمانے میں ہر وقت پڑھائی میں مشغول رہنے والے شخص کے لئے "کتابی کیڑے" کا لقب استعمال ہوتا تھا۔ آج کل کتابیں تو لائبریریوں میں قید ہو کر دیمک کے کیڑوں کی خوراک بن رہی ہیں اس لئے اِن دنوں کتابی کیڑے نے فیس بک کیڑے کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ کئی دفعہ تو ماں باپ اپنے فیس بک کے دیوانے بچے کے کمرے آتے ہیں اور وہاں کا منظر دیکھ کر حیرانی کے عالم میں کہتے ہیں، دیکھو! کچھ دیر پہلے یہ فیس بک پر مصروف تھا، اب بک پر سر رکھ کر سو گیا ہے۔ آجکل بہت سے لوگ صرف اس لئے وقت پر دفتر آتے ہیں تا کہ فیس بک پر منتظر خواتین وحضرات

سے بذریعہ چیٹنگ ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہو سکے۔ فیس بک صارفین اپنی اوقات سے بڑھ کر اپنے اوقات فیس بک پر صرف کرتے ہیں۔

بعض منچلے کسی ماڈل یا اداکارہ کی تصویر لگا کر اپنی آئی ڈی بناتے ہیں۔ اِن کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ پروفائل فوٹو جس قدر جاذبِ نظر ہو، اسی قدر دوسروں سے دوستی کرنے میں آسانی ہوتی ہے، گویا وہ اپنی پروفائل فوٹو کو چڑیاں پھانسنے کے لئے جال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کافی عرصے تک ایک خاتون سے بلاناغہ گفتگو کرتے رہے۔ ایک سال کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ مذکورہ خاتون دراصل کوئی مرد تھا جو خاتون کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے دوست کو بیوقوف بنا رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیس بک دوسروں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا تیز ترین ذریعہ ہے، اس کے باوجود فیس بک کے منفی اثرات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ فیس بک انتظامیہ نے اسے مزید دلچسپ بنانے کے لئے کال کی سہولت بھی مہیا کر دی ہے تاکہ لوگ فیس بک کے سحر میں مزید مبتلا ہو جائیں۔ اُف یاد آیا، مجھے تو خود اس وقت فیس بک پر لاگ اِن ہونا تھا، ہائے میں تو چلا۔۔۔

انسپکٹر صاحب! اس شخص کو فوراً گرفتار کیجئے، اور پوچھیے کہ یہ میری گاڑی کے نیچے کیوں آیا ہے!

محمد اشفاق ایاز

رمضان، روزے اور شیطان

بزرگوں سے سنا تھا کہ رمضان میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ میاں لچھن کا کہنا ہے کہ بھلا شیطان کو قید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو اپنے تربیت یافتہ بندے پیچھے چھوڑ کر کب کا پہاڑوں کی غاروں میں بسیرا کئے ہوئے ہے۔ اسے اب دنیا کے بکھیڑوں میں دخل اندازی کی اتنی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ادھر رمضان آیا، ادھر شیطان کے حواری میدان عمل میں ایسا آئے کہ گرو کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ مجال ہے جو پتہ چلے کہ شیطان ہمارے درمیان موجود نہیں۔

بازار میں جائیں تو جو چیز پہلے پچاس روپے کلو تھی اب اسی نوے بلکہ سو روپے میں بھی دستیاب نہیں۔ مسجدوں میں جوتیاں معمول کے مطابق چوری ہوتی ہیں۔ دن کے وقت ہوٹل باقاعدگی سے کھلتے ہیں۔ کاروبار رشوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چوکوں، چوراہوں، سڑکوں، گلیوں اور گھروں میں پہلے پیار سے اور پھر ''چالان'' کی وعید سے ''عیدی'' وصولی شروع ہو جاتی ہے۔ مسجد میں آنے والی افطاری کا بڑا اور معیاری حصہ مولوی صاحب کے لئے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ گھروں میں افطاری کے نام پر پکنے والے کھانے کی بڑی بڑی پلیٹیں انہی گھروں میں چلی جاتی ہیں جہاں پہلے ہی کھابے تیار ہو رہے ہوتے ہیں اور ''اللہ کے نام پر بی بی جی'' کی صدائیں لگانے والے مستحقین حسرت بھری نظروں سے پلیٹوں اور ٹرے کو ایک گھر سے دوسرے گھر سفر کرتا ہوا دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اب اس میں تو میاں لچھن کو کہیں شیطان کی مداخلت نظر نہیں آتی۔

اب دیکھئے ناں، رمضان المبارک کی آمد سے قبل ہی عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں پر مشتمل بھکاریوں کی فوج ظفر موج شہروں میں ڈیرے ڈال لیتی ہے۔ اب شیطان تو انہیں نہیں بھیجتا۔ نہ وہ ان سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ دوسری طرف دیکھئے رمضان المبارک سے کئی ماہ قبل ضروری اشیائے خورد و نوش کولڈ سٹوروں یا گوداموں میں جمع ہونے لگتی ہیں۔ اور رمضان کے دوران آہستہ آہستہ بازاروں میں مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ اب یہ کولڈ سٹورز اور گودام شیطان کے تو نہیں۔ نہ شیطان چینی کھاتا ہے، نہ آٹا یا پھل۔ اس کی بلا سے بازار میں مہنگی بکے یا سستی۔ اب اس اضافی آمدنی سے ہمارے تاجر اور سیٹھ عمرے اور حج کرتے ہیں۔ شیطان تو حج پر نہیں جاتا۔ اسے تو وہاں صدیوں سے سنگسار کیا جا رہا ہے۔ پھر وہ بھلا ان مقامات پر کیوں جائے گا۔ ہمارے کچھ تاجر دوست رمضان کو ''سیزن'' کا مہینہ کہتے ہیں۔ جو وہ اس ایک ماہ میں کماتے ہیں وہ باقی کے گیارہ مہینوں میں نہیں کما پاتے۔

دفتروں میں روزوں کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ ''صاحب'' روزے کے احترام میں دفتر سے جلد اٹھ جاتے ہیں۔ خواہ وہاں سے سیدھا کسی ''محفل'' میں چلے جائیں۔ اور ان کے اہلکار پہلے ''افطاری'' اور عید کے قریب ''عیدی'' کی وصولی ثواب کا کام سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ نہ دینے والا ہچکچاتا ہے اور نہ وصول کرنے والا شرمندہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کام ''امداد باہمی'' کے اصول پر سرانجام دیا جاتا ہے۔ اب شیطان کو نہ افطاری کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ عیدی کی وہ بھلا کسی کو ایسا کرنے پر کیوں اکسائے گا۔ سب خطا آنکھوں کی ہو تو کیوں سزا پائے دل۔ ہم نے وہ دن بھی دیکھے جب میاں لچھن گھر سے روزہ رکھ کر دفتر آتے تھے۔ دوپہر کے وقت قریبی خفیہ کینٹین سے کھانا کھا کر اور سگریٹ کا کوٹا پورا کر کے تین چار منٹ دھوپ میں کھڑے ہو جاتے۔ تا کہ کھانا کھانے سے جو آ جاتی ہے چہرے پہ رونق، اس میں کمی ہو۔ جب وہ چھٹی کر کے گھر واپس جاتے تو ایک روزہ دار شکل کے ساتھ داخل ہوتے۔

ایک دن میاں لچھن افطاری کے وقت مسجد میں گئے۔ وہاں انواع واقسام کے کھانے اور پھل دیکھ کر جی چاہا کہ سب کچھ لوٹ کر گھر لے جائیں۔ تھوڑی دیر بعد انہیں بھی شاپر بند افطاری پیش کی گئی۔ ایک کھجور اور شربت کے دو گلاس سے افطاری کے بعد انہوں نے بقیہ شاپر کو احتیاط سے مسجد کی الماری میں رکھ دیا تا کہ بقیہ نماز کے بعد گھر لے جا سکیں۔ میاں لچھن حفاظتی نقطہ نظر سے الماری کے قریب ہی نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ایک بچہ انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور بس اسی تاک میں تھا۔ جونہی نماز شروع ہوئی، وہ بچہ اٹھا اور الماری سے شاپر نکال کر چلتا بنا۔ میاں لچھن بچے کی اس دیدہ دلیری پر نماز بھول گئے۔ قریب تھا کہ نماز چھوڑ کر اس کی گردن توڑ دیتے۔ لیکن کچھ مصلحتیں آڑے آ گئیں۔ اور اپنا مال ''افطاری'' بڑی بے دردی بلکہ دیدہ دلیری سے اپنے سامنے جاتا دیکھ کر بھی چپ ہو رہے۔ بقیہ نماز میں دماغ اور نظروں کے سامنے شاپر ہی گھومتا رہا۔

دوسرے دن میاں لچھن قمیض کے نیچے بڑی بڑی جیبوں والی صدری پہن کر افطاری کے لئے مسجد گئے۔ حسب روائت مسجد کے صحن میں مال افطاری سے لبریز شاپر انہیں ملا تو فوراً اندر چلے گئے اور چند ہی لمحوں میں سب صدری کی جیبوں میں ڈال کر باہر آ گئے۔ اب ایک دوسری بچے نے جو کسی ماہر جیب تراش خاندان کا معلوم ہوتا تھا میاں لچھن کی استادی دیکھ لی۔ اور دل ہی دل میں کہا

تمھیں یقین نہیں آئے گا، دو ہفتے ہونے کو آئے، ایک مظلوم صورت کلرک یہاں آیا اور مجھے اس کونے میں لے جا کر کچھ شرماتے، کچھ لجاتے ہوئے کہنے لگا کہ کرشن چندر ایم اے کی وہ کتاب چاہیئے جس میں ''تیری ماں کے دودھ میں حکم کا اِکّا'' والی گالی ہے۔ خیر، اسے جانے دو کہ اس بیچارے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ گالی سامنے رکھ کر ہی اُس کی صورت بنائی گئی ہو مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو نئے نئے اُردو کے لیکچرر مقرر ہوئے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اِسی مہینے کی پہلی تاریخ کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کر کے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پوچھنے لگے کہ صاحب آپ کے ہاں مثنوی وہ کتاب بھی ہے جس میں ''دھرن تختہ'' کے معنیٰ ہوں؟ اور ابھی پرسوں کا ذکر ہے، ایک محترمہ تشریف لائیں، سن یہی اٹھارہ انیس کا، نکلتا ہوا بدن، اپنی گُڑیا کی چولی پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کی رحل بنا کر اس پر اپنا کتابی چہرہ رکھا اور لگیں کتابوں کو ٹکر ٹکر دیکھنے۔ اِسی جگہ جہاں تم کھڑے ہو۔ پھر دریافت کیا ''کوئی ناول ہے؟'' میں نے راتوں کی نیند حرام کرنے والا ایک ناول پیش کیا۔ رحل پر سے بولیں ''یہ نہیں، کوئی ایسا دلچسپ ناول دیجئے کہ رات کو پڑھتے ہی نیند آ جائے۔'' میں نے ایک ایسا ہی غشی آور ناول نکال کر دیا۔ مگر وہ بھی نہیں جچا۔ دراصل اُنہیں کسی گہرے سبز گرد پوش والی کتاب کی تلاش تھی جو اُن کی خواب گار کے سرخ پردوں سے ''میچ'' ہو جائے۔ اس سخت معیار پر صرف ایک کتاب پوری اُتری۔ وہ تھی ''استاد موٹر ڈرائیوری (منظوم)'' جسے دراصل اُردو زبان میں خودکشی کی آسان ترکیبوں کا پہلا منظوم ہدایت نامہ کہنا چاہیئے۔

خاکم بدھن از مشتاق احمد یوسفی

''استادیاں اور ہمارے ساتھ''۔ جونہی میاں پھجن ہر قسم کے خوف سے آزاد نماز کے لئے کھڑے ہوئے، استاد بچے نے قمیض کے اندر بھی استادی دکھادی۔ میاں پھجن کا مال افطاری، مال غنیمت بن کر لمبی جیب سے پھسل کر میاں پھجن کے عین قدموں میں آن گرا۔ اس سے پہلے کہ میاں پھجن صورتحال کو سمجھتے ۔ وہ بچہ مال غنیمت لوٹ کر جاچکا تھا۔

تیسرے دن میاں پھجن نے مال کو جیبوں میں ڈالا۔ اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو ہاتھ اس طرح باندھے گویا جیبوں کو سختی سے بھینچ رکھا ہو۔ اب ایک اور بچہ میاں پھجن کی جیبوں کو ایک چیلنج سمجھتے ہوئے، ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پہلی رکعت خیریت سے مکمل ہوگئی۔ میاں پھجن سمجھے آج جیبوں پر ہاتھ رکھنے کی ترکیب کامیاب رہی اور خطرہ ٹل گیا۔ مگر اصل میں بڑے استاد کا ہونہار چیلہ اس تاک میں تھا کہ میاں پھجن کی جیبیں کس حالت میں زیادہ آزاد ہوتی ہیں۔ دوسری رکعت کے پہلے ہی سجدے میں جب میاں پھجن کے ہاتھ جیبوں سے ہٹے تو وہ اپنے وزن سے نیچے لٹک گئیں۔ بچے نے کہنیوں اور پیٹ کے درمیان سے ایسے واردات کی جیسے جنگلی بھیڑیا کسی بڑے جانور کی بغل سے گوشت نکالتا ہے۔ میاں پھجن سجدے میں کسمسائے لیکن ۔۔۔ بچہ مع مال غنیمت جاچکا تھا۔ میاں پھجن کی زبان پر بے اختیار موٹی سی گالی آگئی۔ میاں پھجن کی شکست فاتحانہ کی ہیٹ ٹرک مکمل ہوچکی تھی۔ رمضان ابھی باقی تھا لیکن ان میں مزید بے عزتی کی گنجائش نہ رہی تھی۔ نماز کے بعد مسجد پر الوداعی نظر ڈالی۔ اور گھر آگئے۔ اس کے بعد انہیں عید کی نماز کے لئے ہی مسجد کی طرف جاتے دیکھا گیا۔

اب ہر شخص میاں پھجن کی طرح جلد ہار مان لینے والا نہیں ہوتا۔ وہ افطاری وصول کرتے ہی مال کی قسم اور نوعیت کے لحاظ سے ترجیحات کا تعین کر لیتے ہیں۔ کس مال کو مسجد میں ہی ختم کرنا ہے۔ کونسا گھر جاسکتا ہے یا گھر لے جایا جاسکتا ہے۔ شربت بھی ہو، چاول بھی ہوں، کھجوریں اور سموسے بھی ہوں تو وہ یوں کریں گے کہ شربت سے پیٹ بھر لیا۔ تھوڑے سے چاول بھی کھا لئے۔ پھل کٹا ہوا ہو تو وہیں کھالیں گے۔ اور باقی جو بچا وہ احتیاط سے شاپروں میں تقسیم کر کے گھر لے جائیں گے۔ بعض تو احتیاط سے شاپر گھر سے لے کر آتے ہیں۔ اب بتاؤ بھلا یہ باتیں انہیں شیطان سمجھاتا ہے؟۔ یہ ماشاءاللہ خود سمجھدار ہیں۔ انہیں شیطان کی رہنمائی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

اب ایک اور سنو۔ جن کے گھر میں بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ سب بچوں کو ایک ہی مسجد میں نہیں بھیجتے ہیں۔ صاحب خانہ ذرا دور کی مسجد میں جائیں گے۔ اور بچے ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر مختلف مساجد میں چلے جائیں گے۔ بعد میں جب سب اکٹھے ہو کر اپنی اپنی کامیابی کی داستانیں سناتے ہیں۔ تو صاحب خانہ خوش بھی ہوتے ہیں اور انہیں اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں بہت سی گُر کی باتیں بھی بتاتے ہیں۔ اس میں چھینا جھپٹی سے لے کر جھوٹ موٹ کا رونا بھی شامل ہوتا ہے۔ زیادہ اولاد کا فائدہ رمضان کے مہینے میں ہی نظر آتا ہے۔ پھر ہر روز ہر مسجد میں ''عید'' نہیں ہوتی۔ بعض اوقات مال کی رسد بہت کم ہوتی ہے۔ اگر یہ صورتحال ہو تو بچے فوراً دوسری مسجد کا رخ کر لیتے ہیں۔ بچے یہ خبر بھی رکھتے ہیں کہ کس گھر میں دیگ پک رہی ہے اور وہ کس مسجد میں جائے گی۔

رمضان میں مسجد کے علاوہ بھی افطار پارٹیاں ہوتی ہیں۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے تو کیا انہیں شیطان کہتا ہے کہ ایسی ہڑبونگ مچاؤ، بھئی وہ تو خود ایسی بھیڑ بھڑ کے سے دور بھاگتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس کلاس میں شاگرد زیادہ ہوں وہاں استاد بھی جانے سے گھبراتا ہے۔ ایسی بعض افطار پارٹیوں میں روزہ کھلنے سے پہلے ہی میز اشیائے افطاری سے خالی ہو چکے ہوتے ہیں۔ بڑے لیڈر تقریر کرتے رہ جاتے ہیں اور کارکن جو خاص نیت اور ارادے سے گئے ہوتے ہیں وہ دراصل حالت جہاد میں ہوتے ہیں۔ وہ جس تیز رفتاری اور مہارت سے اپنے ٹارگٹ پر پہنچتے اور اپنا مشن پورا کرتے ہیں۔ اگر انہیں کسی دشمن ملک میں خاص مشن پر بھیجا جائے تو کامیاب لوٹیں گے۔

سید بدر سعید

خدارا دورانِ سحری و افطار لوڈ شیڈنگ کیجئے!

ابھی کل ہی کی بات ہے ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب ہانپتے کانپتے تشریف لائے اور بیٹھتے ساتھ ہی میز پر سے جگ اٹھا کر سامنے پڑے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹا غٹ پی گئے ہم ارے ارے ہی کرتے رہ گئے لیکن انہوں نے ہماری طرف دھیان ہی نہ دیا جب خوب سیر ہو چکے تو کہنے لگے ''آپ غالباً کچھ پوچھ رہے تھے؟''

ہم نے کہا'' جناب پوچھنا کیا؟ بس یہ بتا رہے تھے کہ ماہ رمضان ہے اور آپ ہمارے سامنے پانی پی رہے ہیں۔ کیا روزہ نہیں رکھا؟''

انہوں نے ہماری بات اتنی ہی توجہ سے سنی جتنی کہ زرداری صاحب،نواز شریف صاحب کی سنتے ہیں پھر نہایت اطمینان سے بولے ''میں بھول گیا تھا،لیکن یہ بتاؤ کہ تم ماہ رمضان،دن کے وقت اپنے سامنے پانی سے بھرا جگ رکھ کر کیا افطاری کے لئے مچھلیاں پکڑ رہے تھے؟''

اب آپ ہی بتایئے کہ ایسی حالت میں کوئی شریف انسان کیا کرسکتا ہے؟ سو ہم نے بھی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے عزت سادات بچانے کے لیئے خاموشی اختیار کر لی۔

شاہ صاحب کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور ہم بھی جواب میں اُدھر اِدھر دیکھتے رہے مگر صرف اتنی احتیاط کی کہ وہ اس طرف دیکھتے تو ہم اُس طرف دیکھنے لگ جاتے،وہ ہماری نگاہ کی سیدھ میں کچھ تلاش کرتے تو ہم الٹ میں یعنی مخالف سمت دیکھنے لگ جاتے۔کافی دیر'' لک لک'' کا یہ کھیل چلتا رہا پھر ہم نے سامنے سے ایک کامن پن اٹھا لی انہوں نے بھی ایسا ہی کیا،ہم بلا وجہ پن کان میں گھمانے لگے انہوں نے بھی پن والا ہاتھ اوپر کیا کان تک لے کر گئے لیکن نہ جانے کیا سوچ کر دانت کریدنے لگ گئے۔کافی دیر ہم دونوں اپنے اپنے کاموں میں اس طرح مگن رہے جس طرح امریکا ڈاکٹر عافیہ پر جھوٹے الزامات لگانے اور ان کے خلاف جھوٹے ثبوت تیار کرنے میں مگن ہے آخر جب اس سے بھی تھک گئے تو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگ گئے۔

شاہ صاحب نے ہماری جانب دیکھا ہم نے ان کی جانب دیکھا،انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا ''کچھ سنا تم نے؟''

''جی ہاں!ایک ٹھنڈی آہ کی آواز۔۔۔یا پھر کسی سانس کے مریض کی آخری سانسوں میں سے ایک سانس کی آواز تھی'' ہم نے سوچتے ہوئے ادب سے جواب دیا لیکن شائد انہیں ہمارا جواب پسند نہ آیا لہذا تیخ پا ہو کر چلائے ''رمضان کے آغاز میں حکومت کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ اب سحر اور افطار کے اوقات

میں لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی''
ہم نے یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا ''اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ عوام کو کچھ تو سہولت ہوگی۔''
لیکن انہوں نے ہماری بات سے اتفاق نہ کیا کہنے لگے ''لگتا ہے آج کل سیاست سے کچھ دور دور ہو''
اب کے ہم نے ان کی بات سے اتفاق نہ کیا کیونکہ ہمارے خیال میں آج کل ہی تو ہم (گھریلو) سیاست میں ''اِن'' ہیں، بھلا کونسا فساد ہے جس میں ہمارا ہاتھ نہیں؟ لیکن وہ مصر رہے کہ ہم سیاست کی الف بے بھی نہیں جانتے آخر ہمیں ان کی مانتے ہی بنی کہنے لگے ''کیا تم ہمارے حکمرانوں کی عادتوں سے واقف نہیں ہو؟ واللہ! دنیا کے سب سے ذہین حکمران ہمارے پاس ہیں۔ ذرا غور کرو پہلے سولہ سے بیس گھنٹے لوڈشیڈنگ ہوتی تھی اب اعلان کیا گیا کہ سحر اور افطار کے اوقات میں لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی''
''بالکل یہی تو فائدے کی بات ہے'' ہم فوراً چلائے۔
شاہ صاحب نے غصے سے ہماری جانب دیکھا اور کہنے لگے
''پہلے مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو''
ہم نے بھی کہہ دیا کہ چلیں آپ اپنی بات پوری کر لیں ہم کونسا کسی مشاعرے میں بیٹھے ہیں جو اپنی اپنی سنانے کے چکر میں پڑیں۔
شاہ صاحب پھر سے کہنے لگے ''حکومت نے وعدہ کیا کہ سحر اور افطار کے اوقات میں لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی لیکن یہ وعدہ تو نہیں کیا کہ دن کے باقی اوقات بھی بجلی کی سپلائی جاری رہے گی۔ اب سحر اور افطار کا وقت تو بمشکل دو گھنٹے میں ختم ہوجاتا ہے۔ یعنی ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کے وقت لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی لیکن باقی بائیس گھنٹے کی کوئی گارنٹی نہیں اس طرح تو حکومت سولہ سے بڑھا کر بائیس گھنٹے کی لوڈشیڈنگ بھی کر سکتی ہے اور اب تو ذمہ داروں کے یہ بیانات بھی آن دی ریکارڈ آچکے ہیں کہ سیلاب کی وجہ سے لوڈشیڈنگ کو نہیں روکا جا سکتا، مطلب دو گھنٹے کی بھی ضمانت نہیں رہی۔۔۔''
شاہ صاحب تو چلے گئے لیکن ہم واقعی پریشان ہوگئے کہ روزہ تو دن کے وقت ہوتا ہے اور اس وقت اگر بجلی کی سپلائی معطل رہی تو روزہ داروں کا کیا حال ہوگا؟؟؟ گرمی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ پسینہ بھی خوب بہے گا اور پیاس بھی خوب لگے گی۔ لیکن جب لائٹ ہی نہ ہوتو عین ممکن ہے پانی بھی نہ ملے اور نہ ہی افطاری کا سامان تیار ہو سکے، جس بھی اپنے عروج پر ہے لوگ نمازِ تراویح کیسے ادا کریں گے؟ اور امام بھی آخر کتنی بلند آواز سے بول سکتا ہے وہ بھی انسان ہے مرغا تو نہیں۔۔۔۔اور لائٹ نہ ہونے کا مطلب لاؤڈ سپیکر بھی جام!
ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم ایک انجمن قائم کریں جس کے تحت ملک بھر میں سیمینار کروائے جائیں اور ایک بل منظور کروانے کی کوشش کی جائے جس کی رو سے حکومت وقت یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوجائے کہ آئیندہ سحر اور افطار کے اوقات میں لوڈ شیڈنگ ہوگی لیکن دوران روزہ بجلی کی سپلائی جاری رہے گی تاکہ روزہ دار کسی بھی قسم کی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔
امید ہے آپ اس مشن میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ ویسے تو ہمیں یہ بھی امید ہے کہ جب تک یہ بل منظور ہوگا تب تک رمضان ختم ہو چکا ہوگا۔ بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بکرا عید (جس پر اس مرتبہ مہنگائی کی وجہ سے مرغا ذبح کرنے کے زیادہ چانس نظر آرہے ہیں) بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہوگی۔ بہرحال پھر بھی آپ امید کا دامن تھامے رکھیں کیونکہ امید پر دنیا قائم ہے۔ جبکہ امید کا تا حال معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کس پر قائم ہے، قائم بھی ہے یا اب تک دم توڑ چکی ہے۔۔۔۔۔؟؟؟ اللہ ہماری مردہ امیدوں کو جنت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

مشہور شاعر اختر شیرانی لاہور کے انارکلی بازار میں جوتوں کی مشہور دکان پر جوتے خریدنے گئے۔ دکان دار نے ان کے سامنے جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اختر شیرانی نے ایک ایک جوڑا دیکھا، مگر کوئی پسند نہیں آیا۔ قیمتوں پر بھی انہیں اعتراض تھا۔ دکان دار طنزیہ لہجے میں بولا ''اِتنے جوتے پڑے ہیں، آپ اب بھی مطمئن نہیں ہوئے؟''
اختر شیرانی ایک جوتا پہنتے ہوئے بولے ''بارہ روپے لیتے ہو یا اُتاروں جوتا؟''

مرزا یاسین بیگ

بڑھاپا اور جرم قبول کرنا آسان نہیں!

بڑھاپا پوچھ کر آتا ہے نہ دھکے دینے سے جاتا ہے۔ یہ مشرق میں مرض اور مغرب میں زندگی سے انجوائے کرنے کا اصل وقت سمجھا جاتا ہے۔ بڑھاپے میں دانت جانے لگتے ہیں اور دانائی آنے لگتی ہے۔ اولاد اور اعضاء جواب دینے لگتے ہیں۔ بیوی اور یادداشت کا ساتھ کم ہونے لگتا ہے۔ خوراک اور صحت آدھی رہ جاتی ہے۔ نظر اور بال بھی کم ہونے لگتے ہیں۔ بڑھاپا آتا ہے تو مرتے دَم تک ساتھ نبھاتا ہے۔

بڑھاپے کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ حسین لڑکیاں ''انکل'' کہہ کر پکارنے لگتی ہیں۔ ہاتھ میں رعشہ یا چھڑی آجاتی ہے۔ شوگر کا حساب پل پل رکھنا پڑتا ہے۔ میٹھی نظر ڈالنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چہرے پر چشمہ اور جھریاں جگہ پانے لگتی ہیں۔ بال اچانک کالے سے گورے ہونے لگتے ہیں۔ گھٹنوں اور دل میں درد رہنے لگتا ہے۔

انسان دو چیزیں مشکل سے قبول کرتا ہے۔ اپنا جرم اور اپنا بڑھاپا۔ ہمارا بچپن دوسروں کی دلجوء اور خوشی کیلیے ہوتا ہے، جوانی صرف اپنے لیے ہوتی ہے اور بڑھاپا ڈاکٹروں کیلیے۔ جب بار بار اللہ، ڈاکٹر اور بیوی یاد آنے لگے تو سمجھ لیں آپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ بڑھاپے کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ بے ضرر ہوتے جا رہے ہیں، اپنے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ جب بچے آپ کو نانا، دادا کہہ کر اور حسین لڑکیاں انکل کہہ کر پکارنے لگیں تو تردد سے کام نہ لیں، تنہاء پاتے ہی غم بھلانے کے لئے سیٹی بجائیں کیونکہ آپ سیٹی ہی کے قابل رہ گئے ہیں۔ بڑھاپے میں اگر اولاد آپ کی خدمت کرتی ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ آپ نے ان کی تربیت اور اپنی لائف انشورنس پر پورا دھیان دیا ہے۔

''مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا'' یہ ایک نہیں ہزاروں بوڑھوں کا قول ہے۔ بوڑھا ہونا الگ چیز ہے اور بوڑھا دکھائی دینا الگ۔ ہر بوڑھے میں ایک بچہ اور جوان چھپا ہوتا ہے۔ بوڑھا ہونا آسان کام نہیں، اس کیلیے برسوں کی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا نہ چل پاتی اگر بوڑھے ہونے کا رواج نہ ہوتا۔ بوڑھے ہونے کے بہت سے فائدے اور کافی سارے نقصانات ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بوڑھے کو دیکھ کر سب سیٹ چھوڑ دیتے ہیں سوائے سیاست دان کے۔ اچھا خاندان اور اچھی حکومت ہمیشہ اپنے بوڑھوں کا خیال رکھتی ہے۔ بوڑھے نہ ہوتے تو چشموں اور دانتوں کا دھندا بالکل مندا ہوتا

ہے۔ بوڑھوں کو بندی اور خاندانی منصوبہ بندی دونوں کی ضرورت نہیں ہوتی مگر نیت اور نظر پھر بھی خراب رہتی ہے۔

عورتیں بوڑھی تو ہوتی ہیں مگر ان کی عمر اکثر جوانی والی ہی رہتی ہے۔ مغربی عورت اپنی عمر چھپاتی ہے نہ جسم۔ پاکستان میں جو عورت اپنی عمر پینتیس سال بتاتی ہے وہ پچاس سال کی دکھائی دیتی ہے، کینیڈا میں جو پچپن سال بتاتی ہے وہ دیکھنے میں پینتیس کی لگتی ہے۔ پاکستانی آمدنی چھپانے میں اور چینی عمر چھپانے میں نمبر ایک ہیں۔

ایک تحقیق کے مطابق آج کی دنیا میں پانچ سال کی عمر کے بچے کم اور ساٹھ سال سے زائد عمر کے بوڑھے زیادہ ہیں۔ اگلے پانچ سالوں میں ساٹھ سال سے زائد عمر کے بوڑھوں کی تعداد ایک ارب ہو جائے گی اور ان میں سے اسّی فیصد ترقی یافتہ ممالک میں ہونگے۔ ہم خوش ہیں کہ ہم اس وقت بوڑھے ہونگے جب بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ کسرت کی عادت کی وجہ سے کینیڈا میں بزرگوں کی کثرت ہوگء ہے۔

دنیا میں سب سے آسان کام نانا، نانی یا دادا، دادی بننا ہے۔ اس میں آپ کو کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی جو کچھ کرنا ہو، آپ کے بچوں کو کرنا پڑتا ہے۔ انسان کو زندگی میں دو بار رشتوں کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے: بیوی کے آنے کے بعد یا پھر بڑھاپا آنے کے بعد۔ زیادہ بوڑھے ہو کر مرنا، اپنے آپ کو رنج پہنچانا ہے۔ ہر بچے کے اندر ایک بوڑھا چھپا ہوتا ہے بشرطیکہ وہ عمر لمبی پائے۔ کیا باکمال دور ہے یہ آغاز بڑھاپا بھی۔ بچپن میں ہم ٹیسٹ دیا کرتے یا ٹیسٹ دیکھا کرتے تھے، اب ڈاکٹر ہمارے لیئے ٹیسٹ لکھ رہا ہے۔ ہمارا تو ہر عمر رسیدہ کو یہی پیغام ہے کہ دنیا سے انجوائے کرو قبل اس کے کہ دنیا تم سے انجوائے کرے۔

ہمارے ایک شاعر دوست نے کہا ”میری ماں دعا مانگتی تھیں کہ میرا بیٹا شاعر نہ بنے“ عرض کی ”آپ کا کلام پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ ماں کی دعا سیدھی عرش پر جاتی ہے۔“

بٹ پارے از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

میم سین بٹ

سنگین خان کا سفر نامۂ لاہور

امارا نام سنگین خان اے اور امارا مخالفین ام کو پیٹھ پیچھے رنگین خان بھی بولتا اے مگر ام سچا بات کا کبھی برا نہیں مناتا، ام کراچی کے علاقہ سہراب گوٹھ اور امارا خاندان پیشاور کے پہاڑپورہ محلے میں رہتا اے مگر امارا آبائی علاقہ پڑانگ چارسدہ اے، اودھر اب بھی امارا قبیلہ رہتا اے، تیس سال پہلے امارا ماں باپ مرضی سے شادی کر کے پیشاور بھاگ آیا تھا علاقے میں امارے ماموں نے امارا دادا اور اس کا بھائی مار ڈالا تھا، بدلے میں امارے چاچا نے امارا نانا اور ماما قتل کر دیا تھا اب تک دونوں طرف چالیس لوگ قتل ہو چکا اے، ماں کے قبیلے نے زیادہ لوگ مارا آخر غیرت بھی کوئی چیز ہوتا اے۔

ایک دفعہ ام نے غیرت میں آ کے اپنے باپ پر بندوق تان لیا تھا ”خو چہ بتاؤ تم نے امارا ماں کو اغوا کر کے شادی کیوں کیا؟ اس پر امارا باپ بولا تھا ”یارا! ام نے تمھارا ماں کو نہیں بلکہ اس نے ام کو اغوا کیا تھا۔۔۔۔۔!

اس کا یہ بات سن کر ہم ٹھنڈا ہو گیا تھا اور ماں کو کچھ نہ کہا تھا

ہمارا غیرت ام کو عورت ذات پر ہاتھ اٹھانے کا اجازت نہیں دیتا امارا معاشرے میں لڑکیاں محفوظ رہتا اے۔۔۔!

یہ آٹھ دس سال پہلے کا بات اے ام میٹرک میں فیل ہونے کے بعد پیشاور اور کوہاٹ کے درمیان ٹرک چلایا کرتا تھا ایک روز ام مال لے کر جاتے ہوئے درہ آدم خیل کے گاؤں ٹنڈی میں چائے پینے رکا تو ہوٹل کا بیرا لڑکا ام کو اچھا لگا اس کا عمر بارہ تیرہ سال تھا ام نے کمسن خان کو بولا ”یارا تم ہوٹل کا نوکری چھوڑ کر امارا کلینر بن جاؤ۔۔۔۔!

اس نے انکار کر دیا جس پر ام کو بڑا غصہ آیا مگر برداشت کر گیا اور نسوار کا چٹکی لے کر آگے چلا گیا ، کوہاٹ سے واپس پیشاور جاتے ہوئے ام نے کمسن خان کو پستول دکھا کر ہوٹل سے اغوا کر لیا مگر امارا بد قسمتی کہ وہ تیسرے دن پیشاور سے بھاگ کر درہ آدم خیل واپس پہنچ گیا اور پھر اس کا ہوٹل مالک نے امارے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کروا دیا ام گرفتاری سے بچنے

کیلئے اپنے دوست لکڑ خان کے پاس لہور بھاگ گیا۔

لکڑ خان کا گھر لہور کے علاقے موزنگ میں تھا، گھر کے ساتھ ہی اس کے باپ کا ٹال تھا مگر لکڑ خان نے مین بازار میں نان روٹی کا تندور لگا رکھا تھا ام نے بی صبح اور شام کا وقت تندور پر نان روٹیاں لگانا اور دن کا وقت آوارہ گردیاں کرنا شروع کر دیا، لہور کا زیادہ تر نوجوان بڑا خوبصورت ہوتا اے جب وہ انگریز کا لباس پہن کر جا رہا ہوتا اے تو دیکھ کر اور بھی پیارا لگتا اے، جی چاہتا اے کہ بس اس کو جاتا ہوا دیکھتا رہو اور سب گھڑیوں کا سوئی ٹوٹ جائے۔۔۔!

امارا تندور پر ایک چھوٹا سا لڑکی روٹی لینے آیا کرتا تھا ام نے ایک روز اس سے پوچھ لیا ''اے لڑکی تمھارا کوئی بھائی روٹی لینے کیوں نہیں آتا۔۔۔۔؟''

وہ لڑکی بولا تھا ''میرا تو کوئی بھائی ای نہیں اے۔۔۔!

یہ سن کر زندگی میں دوسرا بار امارا آنکھوں میں آنسو آ گیا تھا بے چاری کا کوئی بھائی ای نہیں تھا۔۔۔۔۔۔!

لاہور کا لوگ باہر سے آنے والوں کا بہوت عزت کرتا اے اور اپنے لوگوں کا ٹانگ کھینچتا رہتا اے، ام نے ان جیسا میزبان دوسرا کوئی نہیں دیکھا اودھر کا پڑھا لکھا لوگ ماں کا زبان تک نہیں بولتا، زیادہ لوگ قومی زبان اردو اور بین الاقوامی زبان انگریزی میں بات کرتا اے، یاد آیا لہور میں ایک بازار کا نام اردو بازار بھی تھا ام نے ایک دکاندار سے پوچھا تھا ''یارا ایدھر پشتو بازار بھی اے۔۔۔؟''

اس نے ام سے بولا ''ہاں بازار یا لنڈا بازار چلا جاؤ۔۔۔!''

لہور کا ہر بازار میں پٹھانوں کا خشک میوہ، چائے پتی وغیرہ کا دکان مل جاتا اے، لکشمی چوک میں تو کریانے کا دکان بھی پٹھان بھائی کا تھا، اودھر دو تین پٹھان بھائی موچی بی تھا ام اس سے نسوار خریدا کرتا تھا، موزنگ اڈہ میں پٹھانوں کا ہوٹل بڑا مشہور تھا ام اکثر پشتو فلم اور گانا دیکھنے اس ہوٹل پر جایا کرتا تھا اودھر ٹی وی پر پشتو چینل لگا رہتا تھا۔۔۔!

ایک روز ام انارکلی میں گھوم پھر رہا تھا کہ امارا چائے پینے کو جی چاہا مگر اتوار کا وجہ سے سب ہوٹل بند تھا نیلا گنبد کے راستے موزنگ واپس جاتے ہوئے مال روڈ کے قرب ایک ہوٹل کھلا ہوا دیکھ کر ام اندر چلا گیا، کافی لوگ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا جن میں بوڑھا، جوان سب شامل تھا بچہ لوگ اور عورت نہیں تھا، بیرا امارا لئے

چائے لایا تو ام نے اس سے پوچھا ''یارا یہ کون لوگ اے؟''

اس نے بتایا ''یہ شاعر لوگ اے، چائے کم پیتا اے اور باتیں زیادہ کرتا اے۔۔۔۔۔۔!''

ام نے زور سے بابا خوشحال خان خٹک کا ایک پشتو شعر پڑھ دیا، سب لوگ غصے سے امارا طرف دیکھنے لگا اس شعر کا مطلب اے کہ کسی کے کانوں تک میرا تلوار کا جھنکار پہنچ چکا اے اب وہ خواب میں بھی لرزتا ہوا چارپائی سے گر پڑتا اے۔۔۔۔۔!

کچھ دیر بعد بوڑھا لوگ اودھر ای بیٹھا رہا مگر نوجوان لوگ اٹھ کر اوپر جانے لگا ام بھی بیرے کو پیسے دے کر ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا کچھ دیر بعد ایک شاعر نے کاغذ پر لکھا ہوا چند شعر پڑھنا شروع کر دیا مگر کسی نے اس کو داد نہ دیا بلکہ شعر میں کیڑے نکالنا شروع کر دیا شاعر بیچارہ کچھ نہ بولا اور اپنے خلاف دوسروں کا بات سنتا رہا ام کو بڑا عجیب لگا اور غصہ آنے لگا جب آٹھواں مخالف بولنے لگا تو ام نے اس کو گردن سے پکڑ لیا اس پر سب لوگ اٹھ کھڑا ہوا ہنگامہ ہو گیا اور ام کو دھکے دے کر سیڑھیوں سے اتار دیا گیا ام نے نیچے آ کر ان لوگوں کو پشتو میں تڑاخ تڑاخ گالیاں دیا اور چائے گھر سے باہر نکل کر موزنگ چل دیا۔

ایک روز ام ریگل چوک سے گزر رہا تھا کہ ایک دکان پر گلابوں کے پھولوں نے امارا قدم روک لیا اودھر اور بی رنگ برنگ کا پھول پڑا تھا جن سے دکان والا گلدستہ بنا رہا تھا مگر ام کو پھولوں میں صرف گلاب پسند اے ام نے دکان سے ایک گلاب کا پھول اٹھا کر کان پر سجا لیا اور آگے بڑھ گیا دکان دار ام کو بس گھورتا ای رہ گیا، ٹیمپل والے روڈ سے گزرتے ہوئے سینما گھر کے گیٹ سے نکلنے والا ایک لڑکا ام سے ٹکرا گیا ام نے اس سے پوچھا ''اوئے تم فلم دیکھ کر آیا اے۔۔۔۔؟''

وہ بولا ''ایدھر انگریزی فلم مشین گرل عرف میرا جوانی گرم مصالحہ لگا ہوا اے، ام پنجابی فلم ماکھا گوجر دیکھنے ایبٹ روڈ جا رہا اے!''

ام نے پوچھا ''یہ ماکھا گوجر کون تھا یارا۔۔۔؟''

اس نے بولا ''وہ بدمعاش، ڈاکو اور کرائے کا قاتل تھا اس نے پچاس ڈاکے مارا اور دس قتل کیا، مخبری پر ہیروں کی منڈی سے پکڑا گیا اور چار دن بعد راوی کنارے جعلی پولیس مقابلہ میں مارا گیا تھا!''

ام کو بڑا حیرانی ہوا کہ پنجابیوں کا فلمی ہیرو کس قسم کا لوگ ہوتا اے؟ پھر لہور میں ام نے کئی پنجابی فلمیں دیکھا یہ پچیس فیصد پشتو فلموں جیسا ہوتا تھا خاص طور پر اس کا موٹا تازہ ہیروئین اور اس کا ڈانس دیکھ کر پشتو فلموں کا کمی پورا ہو جاتا تھا فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ پنجابی فلموں کا ہیروئین زیادہ تر کیمرے کی طرف منہ کئے رکھتا تھا!

ایک روز ام چڑیا گھر کا سیر کر کے موزنگ اڈہ جا رہا تھا کہ راستہ میں گنگا رام ہسپتال والا چوک میں ایک لڑکا فٹ پاتھ پر پیٹ پکڑے بیٹھا نظر آیا ام نے اس سے پوچھا ''خو چہ کیا ہوا؟''

وہ بڑی مشکل سے بولا ''ہائے درد۔۔۔۔۔۔!''

ام نے پوچھا ''دردزہ۔۔۔۔؟''

وہ پیٹ چھوڑ کر ام کو غصے سے گھورتا ہوا اپنے بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا ام اس کا ارادہ سمجھ گیا اور صفانوالہ چوک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔۔۔!

اِن دنوں امریکہ میں بلڈنگ تباہ ہوا تو دنیا میں عرب اور پٹھان مسلمانوں کا شامت آ گیا، خودکش دھاکوں کے بعد لہور میں بی پٹھانوں کا پکڑ دھکڑ شروع ہو گیا تو ام واپس اپنے علاقے میں چلا گیا مگر اودھر لہور سے بی زیادہ سختی تھا ام کو رشتہ داروں کے پاس کراچی بھیج دیا گیا اب ام کراچی میں اومنی بس چلاتا اے اور لہور کو یاد کرتا رہتا اے، جب بھی ام کو لہور بہوت زیادہ یاد آتا اے تو ام زور زور سے آواز لگانا شروع کر دیتا اے۔۔۔۔۔۔لہور لہور اے۔۔۔۔۔لہور لہور اے۔۔۔۔لہور لہور اے۔۔۔۔لہور لہور اے!''

ڈاکٹر تمہیں کوئی خاص شکایت نہیں، صرف آرام کی ضرورت ہے۔
مریضہ لیکن ڈاکٹر صاحب ذرا میری زبان تو دیکھیے۔
ڈاکٹر ہاں اس کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔
(نوادر۔ مرزا محمد عسکری)

فہد خان

ایک تو ہم کسی بھی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیں گے۔اب اسی رکشے کو دیکھ لیں۔ مذاق اڑاتے ہیں ہم ان کا۔پھٹیچر کہتے ہیں۔ارے عام رکشے تو عام ہوتے ہیں ہم تو سپر ایشیاہ کے ٹک ٹک کو بھی ساری عمر وہ مقام نہ دیں گے جو اس کا بنتا ہے۔بالکل ویسے ہی جیسے مصباح ٹک ٹک کو ہم نے کبھی بھی وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ حق دار ہے۔ذرا سوچئے اس دن کیا ہوگا جب آپ اپنے گھر سے باہر نکلیں اور آپ کو رکشہ نہ ملے گا؟ پھر چندھیائی ہوئی آنکھوں سے کسی رجلِ رشید کا انتظار کریں گی، جو جنت کی سواری لا کر آپ کے سامنے بریک مار کر کہے: چین! کتھے جانا اے؟

خدا دشمنوں کو بھی وہ وقت نہ دکھلائے۔

اب رولز رائس، بی ایم ڈبلیو، لینڈ کروزر کے فوٹو تو ہمارے نائیوں نے دکانوں میں ایسے لگائے ہوتے ہیں جیسے والدین کی تصاویر لگائی جاتی ہیں۔حالاں کہ رکشہ میڈان پاکستان ہے۔ہمیں اپنی بے غیرتیوں کے ساتھ ساتھ اپنی مصنوعات پر بھی فخر ہونا چاہیے۔کبھی سوچا آپ نے بی ایم ڈبلیو پر ہم کیوں فخر کرتے ہیں۔ حالاں کہ ایم بی ڈبلیو "بھیک مانگنے والا" کا مخفف ہے؟ جد وہی ہے۔۔انگریزی ذہنی غلامی!

یہ رکشہ تو سڑک کا ہیلی کاپٹر ہوتا ہے۔اللہ قسم! ایک تو دونوں کی شکل ب ملتی جلتی ہوتی ہے۔دوسرا دونوں کا شور بھی یکساں ہوتا ہے۔تیسرا جیسے ہیلی کاپٹر فضا میں آزاد پنچھی کی مانند جہاں من کرے ادھر مڑ جاتا ہے بالکل ویسے رکشہ بھی سڑک پر چلتے چلتے اچانک ہی کہیں مڑ جاتا ہے۔ہاں کبھی کبھی وَڑ بھی جاتا ہے۔۔چاہے اس کی لپیٹ میں کوئی گل بدن آجائے یا پہیے تلے کوئی کتے کا بچہ۔

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں آئے کیوں؟

کبھی ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ہاں اتنی مماثلت ہے تو یقین سے کہ سکتا ہوں کہ اس میں بھی نصیبو لعل کے گانے ضرور چلتے ہوں گے۔

ایک رکشے والے سے میں نے پوچھا کہ بھئی تم یہ کان پھاڑ گانے کیوں چلائے رکھتے ہو۔تو کہنے لگا صاحب اپنے رکشے کی آواز تو علی ظفر جیسی ہے ناں۔۔۔ایک دم نائز پالیوشن۔ہاں یوں اونچے گانے لگا کر ہمیں اس پالوشن سے اگر نجات مل جاتی ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے؟ ایک تو ایک تو آپ پڑھے لکھے لوگ اعتراض بہت کرتے ہیں!

کسی زمانے میں رکشوں میں میٹر نصب کیے جاتے تھے۔پھر ایسا ہوا کہ بھوک کے مارے رکشہ والوں نے میٹر کھا لیے۔اس دن سے ان کو بھوک کا ایسا چسکا لگا ہے کہ ایمان کو بھی بیچ کھاتے ہیں۔

کبھی آپ نے غور کیا کہ کہ رکشے کو گھریلو سواری کا درجہ حاصل کیوں نہ ہو سکا؟ خوب صورت ہے، پائیدار ہے، ہارن بھی بجتا ہے، جدھر لے جائیں چلا جاتا ہے۔گدھوں کی طرح گھاس بھی نہیں کھاتا۔سڑک کے بیچ میں لید بھی نہیں کرتا۔میٹرنٹی لیو بھی نہیں مانگتا۔اچھی اچھی گاڑیوں کی کئی کاٹ کر اپنی راہ لیتا ہے۔کبھی کبھار زیادہ مستی چڑھے تو پچھلے دو پہیوں پر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسا گھوڑے کو ایڑ لگائی ہو۔لیکن یہ کوئی غلط بات تو نہیں۔ہم لوگ کبھی اس بات پر کسی گھوڑے کو دوش تو نہیں دیتے!

موٹر سائیکل پر ہمارے یہاں فیملیز کس طرح سوار ہوتی ہیں۔۔آپ نے تو دیکھا ہی ہوگا۔دو بچے ٹینکی پر سوار ہیں، ایک خالہ قدوس کے حجم والی بیوی پیچھے بیٹھی ہے۔چھریرے بدن کا ایک جوان موٹر سائیکل اڑائے لے جا رہا ہے۔بیگم نے ہاتھ کمر کے پیچھے سا آگے لا کر ناف میں انگلی گھسوڑ رکھی ہے۔تا کہ سند رہے، اور اگر خاوند کی نظر ادھر ادھر پڑے تو بوقتِ عجلت کام آئے۔دوسرے ہاتھ سے ایک بچے کو سنبھالا ہوا ہے۔اور راستے کے جھٹکوں پر پوری فیملی ایک دم اوراچھلتی ہے۔یہ کرتب دکھانا۔۔اور وہ بھی بلا پیسوں کے کتنا خطرناک کام ہے۔کاش کہ ذرا عقل استعمال کرتے ہوئے ایک رکشہ لے لیا جائے۔میاں آگے رکشہ لیے جا رہے ہیں اور پچھلی سیٹ پر بیگم بچوں کو تھامے بیٹھی ہیں۔کوئی غم نہ غصہ۔۔۔بس اڑا اَور رکشہ!

رکشہ سٹیٹس کو کے خاتمے کی علامت ہے۔میں یقین سے کہتا ہوں اور یہ میرا ایمان ہے کہ ایک تو میری ایمان کو کچھ نہیں ہوگا دوسرا ایک دن میرے ملک سے ساری سٹیٹس کو کی علامت گاڑیاں ختم ہو جائیں گی اور ان کی جگہ رکشے لے لیں گے۔

جب تخت اچھالے جائیں گے
اور رکشے سنبھالے جائیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

رکشہ تو صدیوں سے مقبول سواری ہے۔سکندرِ اعظم نے ملتان کا محاصرہ ختم کر کے رکشوں پر واپسی کی تھی۔راجا پورس کو بھی اسی وجہ سے شکست ہوئی کہ اس کی فوج اور وہ خود ہاتھی پر لدا ہوتا تھا جب کہ نئی ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے سکندر رکشے میں سفر کرتا آیا تھا۔اور پھر آگے جو ہوا وہ تاریخ ہے۔جہلم کے قریب سفر کرتے کرتے ایک جگہ سکند کے رکشے "پیلا فورس" نے ذرا اپنی اگلی ٹانگیں اوپر اٹھائیں تو پچھلی باڈی نے زمین کو ذرا کھرچ دیا۔یوں دنیا کی نمکین سب سے بڑی کان کھیوڑہ دریافت ہوئی۔۔

رائٹ برادران نے جب اڑنے والے جہاز کا کامیاب تجربہ کر لیا تو اگلے دن نیویارک ٹائمز میں آخری صفحے پر ایک آٹھ کالمی خبر چھپی تھی کہ اٹلی کے رہائشی دو بھائیوں نے اڑنے والا رکشہ ایجاد کر لیا ہے۔

رکشہ والوں کا گانے کا ذوق بھی نہایت پختہ ہوتا ہے۔یہ آج

کل کی پود کے گانے والوں کے گانے سنتے ہی نہیں۔۔ان کے
کانوں کو آج بھی ملکہ ترنم نور جہاں، فریدہ خانم، آشا، لتا یا نصیبو لعل
طراوت بخشتی ہیں۔آپ صبح صبح رکشے میں سوار ہوں رکشے والے
نے قوالی لگائی ہوئی ہے۔یہ کوئی عام قوالی نہیں ایک دم ''تھالی''
مافق ہے۔قوال کچھ کچھ دیر بعد اردو، عربی کی کڑاہی میں فارسی کا
لہسن ڈالتا ہے اور پھر اسے انگریزی کا تڑکا دیتا ہے۔جونہی سورج
ابھرتا ہے رکشے والوں کی بے حیائی کا درجہ حرارت بڑھنے لگتا
ہے۔گانے لگ جاتے ہیں۔شروع ہوتا ہے۔

''آندا تیرے لئی او! ریشمی رومال
تے اتے تیرا ناں کڑھیا!''

بعد میں مختلف گلوکاروں کے بعد جب رکشے والا سواری کے
انتظار میں کھڑا ہوتا ہے تو خود بخود فطرت اسے ''گجراوے۔۔۔
وے گجرا۔۔۔اوے!!'' سننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

رکشہ ہوادار سواری ہے۔آپ اس میں بیٹھ کر موسم کا مزہ لے
سکتے ہیں۔موسم کے عین مطابق۔۔۔سردیوں میں سرد، گرمیوں
میں گرم۔

چھوٹے شہروں میں تو رکشہ ہی محبت کی کشتی کا ناخدا ہوتا ہے۔
نویں دسویں کے بچے، جن کی مسیں بھیگنا شروع ہوئی ہوتی ہیں،
سائیکلوں پر رکشوں کے پیچھے جا رہے ہوتے ہیں۔اس امید پر کہ
شاید آج وہ مسکرا کر دیکھ لے۔شاید آج جب میں پرچی پر فون
نمبر لکھ کر پھینکوں تو وہ کیچ کر لے۔ان کو گھر پر اپنے ابا کے آنے کی
اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی گلی کی نکڑ سے نمودار ہوتے رکشے کو دیکھ کر
ہوتی ہے۔

شروع شروع میں رکشوں کا رنگ ٹیکسیوں کے وزن پر پیلا
رکھا گیا تھا۔بعد میں انگریزوں سے آزادی کے نشان کے طور پر،
نیلے، اودے، ہرے، گلابی ہر رنگ کے رکشے نظر آنے لگے ہیں۔
ویسے بھی کلر میں کیا رکھا ہے۔گلاب سیاہ ہو تو بھی گلاب ہی ہوتا
ہے!

نئے رکشے کو کیسے سجایا جاتا ہے؟۔چھت پر اگلی اور پچھلی طرف
جھالر لگائی جاتی ہے۔ایکسلریٹر کے ساتھ کالی کالی پٹیاں باندھی
جاتی ہیں جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یوں ناچتی ہیں جیسے کا جل
کوٹھا والے بابا جی! بریک اور گیئر کو خوب صورت اور چمک دار
''موزے'' پہنائے جاتے ہیں، یوں ایک رکشہ تیار ہوتا ہے۔
ہمارا یہ رکشہ اس طرح چمک رہا ہوتا ہے جیسے شادی والے دن
دلہن۔۔۔ہاں کچھ سال بیتتے ہیں، زمانے کا پہیہ گھومتا ہے، اور پھر
رکشہ یوں ہو جاتا ہے جیسے ولیمے والے دن دلہا۔

رکشہ لسی کی مانند ہے۔لسی میں جتنا پانی ملا دو ''لسیت'' ختم
ہونے کو نہیں آتی اور رکشہ میں جتنی سواریاں بٹھا دو رکشہ کی
''رکشکیت'' قائم رہتی ہے۔کہنے والے کہتے ہیں کہ ایک رکشے
میں اتنے مسافر سفر کر سکتے ہیں جتنے ریل کی دو بوگیوں میں۔لیکن
اس بات میں تھوڑا مبالغہ لگتا ہے۔

اوپر ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے۔۔''رکشکیت''۔رکشکیت
ایک کیفیت کا نام ہے۔۔یہ کیفیت بعض گاڑیوں میں بھی پائی جاتی
ہے۔بعض سیاست دان بھی رکشے ہوتے ہیں۔بعض گلوکار بھی
رکشے ہو سکتے ہیں۔ہوسکتا ہے آپ آئینے کے سامنے جائیں اور
آپ کو اپنے عکس کے بجائے ایک رکشہ نظر آئے۔ہوسکتا ہے کہ
آپ کی ہونے والی بیوی کی شکل رکشے سے ملتی جلتی ہو۔ہوسکتا ہے
آپ اس تحریر کو پڑھنے والا رکشہ ہو۔ہوسکتا ہے اس تحریر کو لکھنے والا
رکشہ ہو۔اگلا سی سی بھی رکشہ ہوسکتا ہے۔(ہونے کو موجودہ بھی ہو
سکتا ہے)۔ہوسکتا ہے ہمارا اگلا وزیر اعظم رکشا ہو۔ہونے کو تو کوئی
بھی رکشا ہوسکتا ہے۔کل کلاں کسی کا نام اکرم ولد رکشا بھی ہوسکتا
ہے۔آپ کہاں تک روک سکتے ہیں کسی کو؟

ہر گھر سے رکشہ نکلے گا
تم کتنے رکشے روکو گے؟

ویسے مجھے ایک شکایت آج کل کے عاشقوں سے بھی ہے۔
آپ اپنی محبوبہ کو جانو، میری موٹو، گوریے، شونو، شونیٹو، جانی، جگری
کہتے ہیں۔۔رکشہ کیوں نہیں کہتے؟ اتنا کیوٹ تو ہوتا ہے!

آخر میں ایک شعر کے ساتھ اختتام:

خدا تجھے کسی رکشے سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

راشد حمزہ

کمینے کی کار

کمینے کی کار اگرچہ دنیا کا آٹھواں یا نواں عجوبہ تو نہیں تھا مگر اس کا عجوبہ ہونے سے انکار کرنا بھی کوئی عقلمندی نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر عجوبے بھی تعجب کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ یہ عجوبہ کار اُسے طویل مدت پر محیط خاصی محنت کے بعد وراثت میں ملی تھی۔ اس کار سے متصل کمینے کی ایک گھریلو روایت بھی موجود تھی اور وہ یہ تھی کہ ''کار خاندان میں اس شخص کو بطورِ سزا وراثت میں منتقل کی جاتی ہے جو پڑھائی میں غبی، کام میں کاہل اور سر سے پھرا ہوا ہو۔''

اِس کار کو حاصل کرنے کیلئے کمینے کو سخت مشقت سے پُر محنت کرنی پڑی تھی، اس کی خواہش کار کا حصول نہیں تھا، وہ تو محض خود کو اس سے زیادہ سزا سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی محنت کا یہ دورانیہ گیارہ سال پر محیط تھا، صرف گیارہ سال اس نے میٹرک پاس کرنے میں لگائے، میٹرک کے امتحان میں کمینہ نیچے کی طرف سے پہلے نمبر پر آئے تھے یعنی خراب پوزیشن میں اُن سے کوئی آگے نہیں تھا، آخری پوزیشن حاصل کرنے کے لئے کمینے کو اتنی ہی کھٹن محنت کرنے پڑی جو ایک لائق فائق طالب علم پہلی پوزیشن کے لئے کرتا ہے، کمینے کا پاس ہوجانا جہاں سب کے لئے حیران کن تھا وہاں خاندان والوں کے لئے باعثِ فخر بھی تھا۔ خاندان میں کئی دِنوں تک اس کے پاس ہونے کا جشن منایا جاتا رہا، دور دور کی رشتہ دار مبارک باد دینے ایسے آتے رہے جیسے برسوں سے اجڑے گھر کے چمن میں نئی زندگی کا پودا اُگا ہو۔

کمینے کے پاپا فخر سے سر اونچا کر کے جشن میں شریک ہونے والوں کو کہتے کہ ''میرا بیٹا میٹرک پاس ہوگیا ہے۔'' کمینے کے پاس ہونے سے متعلق کمینے کے پاپا کے خیالات اس زمانے کے تھے جس زمانے میٹرک میں فیل ہوجانا بھی بڑی سعادت اور کرامت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ کمینے نے اپنی کامیابی سے تمام ناقدین کے منہ بند کر کے اُن کو حیرت اور استعجاب میں مبتلا کر دیا تھا، اِس وجہ سے کمینے کے پاپا نے بھی متذکرہ عجوبہ کار وراثت میں منتقل کر کے کمینے کو تعجب میں مبتلا کر دیا۔ دراصل اس کے پاپا کو خوش فہمی ہوئی تھی کہ اس کار کی کمپنی سے تنگ آ کر کمینہ اگلے سال کے لئے جی بھر کر محنت کرے گا اور اس کار سے چھٹکارا پا لے گا مگر بعد میں سب کچھ مختلف ہوا۔

میٹرک کے بعد کمینے کو شہر کے اس کالج میں بہت مشکل سے داخلہ مل گیا جس میں شہر سے گنے چنے نہایت خاص کمینے اور خالص

نالائق اکٹھے ہوجاتے تھے۔ اگر اس کالج کو آوارہ گردوں کی آماجگاہ قرار دیا جائے تو بعید از انصاف نہیں ہوگا۔ کمینے کو جب داخلہ مل گیا تو کسی طرح اس نے کار کو بھی ہاسٹل منتقل کر ہی دیا۔ کار کے ہاسٹل منتقلی کے بعد کولیگ کو تو جیسے دلچسپ موضوع بحث مل گیا، کمینے کو دیکھ کر ہر دو آپس میں کھسر پھسر کرتے، کوئی اسے کباڑیے کا ستم رسیدہ ٹین کا ڈبہ کہتا تھا تو ساتھ ہی کمینے کو نہایت ہی بدذوق کہا جاتا تھا، کوئی اس کو عجوبہ سمجھتا تھا تو کوئی کار کی حالت دیکھ کر کمینے کو ولی سمجھنے لگتا اور سوچتا کہ کار کا مالک ہونے کے باوجود کمینے کے اب تک ہاتھ پیر سلامت ہیں تو کیوں ہیں اور ہیں تو کیسے ہیں۔ یوں کمینے نے کالج کے ابتدائی ایام میں ہی قرب وجوار کی بھرپور توجہ حاصل کرلی۔ زمانہ طالبعلمی میں بڑا خبط یہی سر پر سوار رہتا ہے کہ کسی طرح کولیگز کی توجہ حاصل کی جائے۔ چھت پر چڑھ کر ایسے ناچیں کہ انگ انگ سے مستی نکلنے لگے یا ایسا گائیں کہ سب سحرزدہ ہوجائیں۔ کمینے کو اتنی بامشقت محنت نہ کرنے کے باوجود خاصی توجہ حاصل ہوگئی۔ سورج کے طلوع وغروب کے ساتھ کمینے کی شہرت کا ستارہ چمکنے لگا۔

یوں تو کمینے کی کار میں خامیاں ہی خامیاں تھیں مگر چند ایک خوبیاں بھی تھیں۔ صورت تو کسی قبر رسیدہ خواجہ سرا کی سی تھی۔ کہیں پر پتھروں کے نشان تھے تو کہیں پر لاتوں کے، پچھلی سیٹ کی دائیں طرف کے شیشے پر گوبر کے اپلے کا نشان نمایاں نظر آ رہا تھا، اگلی سیٹ کے نام پر لکڑی کی دو تپائیاں رکھی گئی تھیں، جس کے ساتھ کیلوں کے ذریعے تکیے منسلک کیے گئے تھے۔ پچھلی سیٹ لکڑی کے ایک تختے سے بنی ہوئی تھی، ہیڈ لائٹس کی ضرورت پورا کرنے کے لئے کار میں ایک ٹارچ لائٹ رکھا گیا تھا۔

کار میں بیٹھ کر گننا مشکل ہوجاتا کہ اس چھوٹی سی کار میں کمپنی کے مشینی ہاتھوں کے تیار کردہ چیزیں کتنی ہیں اور کمینے کے اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی کتنی ہیں۔ کار سٹارٹ ہونے میں خاص نخرے دکھاتی یا شاید اپنی ذاتی صحت کی وجہ سے وہ ایسی حرکتوں پر مجبور تھی، کبھی کبھی بغیر ایندھن سٹارٹ ہوجاتی، اکثر ان حالات کا سامنا بھی ہوتا کہ ہم کار کے ارد گرد کھڑے کار کی ایندھن ختم ہونے کے

گدھا ایک ایسا جانور ہے جو پیٹھ پیچھے کھڑے ہوکر بولنے والوں کو لات مارتا ہے مگر سامنے کھڑے ہوکر بولا جائے تو خاموش کھڑا رہتا ہے۔

کہتے ہیں گناہ میں لذت ہوتی ہے اور یہ مشغلہ گناہ بھی بڑا لذت آموز ہوتا ہے لوگ اسے اس شخص کی پرواہ تو چھوڑ دیجئے بلکہ منکیر اور نکیر کی پرواہ تک چھوڑ دیتے ہیں اس کارِ مصروف میں ابن آدم سے زیادہ بنت حوا کافی آگے ہے اس لئے بیچاریاں کافی مصروف ہوتی ہیں۔ گھر کی مصروفیات نپٹانے کے بعد ایک دوسرے سے نپٹتی ہیں۔ اس نپٹا نپٹی میں کبھی کبھی چھینا جھپٹی اور جنگ محلہ اور جنگ پڑوسی برپا ہوجاتی ہے۔ ہتھیار تیز رفتار زبان جو پیٹھ پیچھے چلتی تھی اب آگے چلنے لگ جاتی ہے، یہ نوبت اس لئے آتی ہے کیونکہ اس میں کچھ ماہر جاسوسیت بھی ہوتی ہیں جو بجھانے سے زیادہ چنگاریاں سلگاتی ہیں۔

اس لپٹا جھپٹی سے نکل کر اس مرگ فتن کا کا پوسٹ مارٹم کرے تو پتہ چلتا ہے کہ جس میں حق گوئی کے وٹامن نہیں ہوتے یہ بیماری اس پر اثر کرتی ہے اور اس مرگ لاعلاج کا جب بے عزتی سے آپریشن نہیں ہوتا تب تک ختم نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں کے لاتعداد آپریشن کرنا ہوتے ہیں مگر پھر بھی یہ ناسور ختم نہیں ہوتا، بس زندگی آپریشن بھری ہوجاتی ہے الا یہ کہ سکرات میں جائے اور زبان خنجر خاموش ہوجائے۔

پیٹھ پیچھے از ارشاد سرگروہ

انتظار میں ہوتے۔

کار کی عادتیں سرپھری محبوبہ کی طرح تھیں، کبھی یونہی منہ بناتی اور کھڑی رہتی جب ضرورت رہتی سٹارٹ نہیں ہوتی جب ضرورت نہیں رہتی تو باآسانی سٹارٹ ہوجاتی۔ ایک دفعہ تو حد ہی ہوگئی، جس کی وجہ سے وارڈن کو ہاسٹل میں خصوصی نوٹس لگانا پڑا تھا۔ نوٹس میں لکھا تھا کہ "کمینے کی کار ہمارے کالج کی نشانی بن گئی ہے تو اس وجہ سے ہاسٹل میں اُن کو کھڑے کرنے کے لئے ایک خاص جگہ مقرر کی گئی ہے تاکہ کار کی زیارت کیلئے آنے والے زائرین کو زیارت کرنے میں آسانی ہو، اس لئے ہاسٹل میں مقیم تمام طالب علموں کو نوٹس ہذا کے ذریعے مطلع کیا جاتا ہے کہ کار کی خصلتوں اور حرکتوں کے متعلق خاص جانکاری کمینے سے حاصل کی جائے

بصورت دیگر کسی نقصان کی ذمہ داری کار پر نہیں ہوگی۔'' ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک دن کار کو نجانے کیا سوجھی کہ جب سامنے ہاسٹل کا باورچی گزر رہا تھا تو سٹارٹ ہوگئی اور ٹکر ماردی تھی جس کی وجہ سے باورچی زخمی ہوگیا تھا۔

کار کو سڑک کی ہوا خوری سے پہلے کمینہ سڑک کا جائزہ لیتا تھا، اگر رش کم ہوتا تو کار کو صاف ہوا کھلائی جاتی، رش کے متعلق کمینے کا خیال تھا کہ یہ کار کی صحت پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے، حالاں کہ کمینے کا یہ خیال نہایت غیر معقول تھا کیونکہ جب یہ عجوبہ کار خود ہی ماحول پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی تو پھر ایسے میں ماحول پر بدگمانی کرنا تو بہت بے ایمانی کی بات تھی۔ ویسے بھی جب وہ سڑک پر آنکلتی تو لوگ اور گاڑیاں ایسے غائب ہوجاتیں جیسے بلی کو دیکھ کر چوہے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔

کار سے ہر قسم آواز نکلتی تھی، سوائے ہارن کی، اور ہارن کی ضرورت بھی کیا تھی، جب وہ سڑک پر آموجود ہوتی تو سو گز لمبا دھواں پیچھے چھوڑ جاتی جن سے پیچھے والوں کو سو گز پہلے سے محتاط ہونا پڑتا۔ اسی طرح سو گز آگے اس کے سپیئر پارٹس کی گڑگڑاہٹ اور طرح طرح کی جناتی چیخ و پکار اس کی آمد کی اعلان یوں کرتی جاتی تھی جیسے کسی بادشاہ کی آمد پر باخبر، باملاحظہ، ہوشیار کے آوازے لگائے جاتے ہیں۔

کار کی سب سے منفرد خامی یہ تھی کہ اس کی سمت کا صحیح تعین کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ آگے چلتے چلتے کبھی پیچھے کی طرف چلتی، کبھی آگے کی طرف چلنے کیلئے ریورس گیئر لگانا پڑتا۔ سمت کا تعین کرنے کے لئے کمینے نے کار کی پچھلی طرف ایک ہڈی آویزاں کر رکھی تھی، جب بھی ہم سڑک پر نکلتے کہیں سے کوئی کتا آ کر اس کا پیچھا کرنا شروع کرتا۔ اگر کتا ہمارے سامنے آرہا ہوتا تو کمینہ کہتا کہ ہم ریورس میں جارہے ہیں۔ اگر کتا کا کے پیچھے سے اس کی ریکی کرتا نظر آتا تو کمینہ کہتا کہ ہم منزلِ مقصود کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

کمینے کی کار میں ایک بار سفر بھی سفر کرنا ہر کولیگ کی خواہش تھی لیکن اس خواہش کے راستے میں کمینے نے خاص اصول بنا رکھے تھے کہ سفر کی خواہش رکھنے والا پہلے کمینے سے اجازت نامہ فارم لے، اُس پر اُن کے والدین کے دستخطوں کا ہونا امرِ لازم قرار دیا گیا تھا۔ جو خوش قسمت فام پر متعلقہ دستخط کروا کر لاتا، وہی کار میں سفر کرنے کا اہل ہوتا۔ فارم میں کچھ اس طرح لکھا گیا تھا ''آپ کا فرزندِ ارجمند میری کار میں سفر کرنے کی خواہش رکھتا ہے، حادثے اگر چہ من جانب اللہ ہوتے ہیں مگر پھر بھی لوگ میری کار کو دیکھ کر قیانہ کرتے ہیں کہ کچھ حادثات جیسے میری طرف سے رونما ہوجاتے ہیں، آپ کا بیٹا اگر میری کار میں سفر کرے گا اور خدانخواستہ اس دوران کوئی حادثہ رونما ہوگیا تو میں آپ کے بیٹے کو بالکل ذمہ دار نہیں ٹھہراؤں گا اور نہ آپ سے ایسی توقع رکھوں گا، اگر آپ اتفاق کرتے ہیں تو اس اجازت نامہ پر دستخط فرمادیجئے۔''

کمینے کی کار کی وجہ سے کالج کو قرب و جوار میں بہت شہرت ملی۔ بہت سارے لوگ اس کالج کو کمینے اور اس کی کار کے حوالے سے جاننے لگے اور ان کے نام ہی سے تعارف کرتے۔ کالج کے معلمین اگر چہ کمینے کی تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے خوش نہیں تھے مگر وہ اپنی کار کی شہرت کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ کولیگ انتہائی عقیدت کے ساتھ کار کی زیارت کے لئے کالج سے ہاسٹل کا رخ کرتے جب کار اپنے عروج کی انتہاء پر پہنچی تو بہت زیادہ نگاہیں کار کی طرف اٹھنے لگیں تو ان میں سے کی بدنگاہی بھی تھی۔ ایک دن کمینہ تفریحِ طبع کے لئے کار کو کالج گراؤنڈ کی سیر کرا رہا تھا، اُس کے ساتھ چند دوست بھی اُس کے ہمراہ تھے۔ کالج گراؤنڈ کے دو چکر مکمل ہوئے تھے اور تیسرا شروع ہونے جارہا تھا کہ کہیں سے پرنسپل صاحب آ دھمکے۔ کمینہ حواس باختہ ہوگیا۔ پرنسپل صاحب کار کے بالکل راستے میں آگئے تھے، کمینے نے بہت بار بریک دبایا مگر ہر بار کار اپنی عادت کے مطلب اپنی سپیڈ بڑھاتی چلی گئی یوں لاکھ کوشش کے باوجود کار نے پرنسپل کے پچھواڑے میں زوردار ٹکر ماری۔ پرنسپل صاحب مکمل شہادت سے تو بچ گئے البتہ اُن کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اس حادثے کے بعد کمینے کو کالج سے برخاست کردیا گیا اور کار کو کمینے کے خاندان کے بڑوں کے حوالے کرکے تلف کرنے کی ہدایت کی گئی۔

مدثر عباس

عشق کل اور آج

آج کل کے جدید دور نے پیار محبت کو کھلونا بنا کے رکھ دیا ہے نہایت آسانی سے موبائل یا فیس بک کے ذریعے لیلیٰ ڈھونڈنا پھر چند روپوں کا بیلنس ہوا کر کے وصال تک پہنچنا پھر اولاد نرینہ کی شکل میں وصولی اس ساری کہانی میں نہ کوئی ایکشن نہ تھرل ہاں البتہ بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان موبائل پہ جس لڑکی کو اپنے خوابوں کی پری سمجھ رہا ہوتا ہے وہ پری نہیں بلکہ ایک لڑکا ہوتا ہے جس کا تعلق پیسے بٹور گروپ سے ہوتا ہے جو عاشق کو ملاقات کے جھانسے دے کر اس کے پیسوں کو ہوا کر دیتا ہے۔

پرانا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا لڑکیاں تو شرم کرتی ہی تھیں لڑکے بھی شرمساری میں پیچھے نہ تھے۔ اس زمانے میں کسی عاشق سے عشق و معشوقہ کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو شرم سے عاشق صاحب اپنے سولہ دانتوں کو دوسرے تقریباً سولہ دانتوں سے لگا کر ہونٹوں سے چھپا لیتے تھے معشوقہ کا انتخاب اور اسکی طرف سے کبوتر کے منہ میں رضامندی کا خط بھی کافی وقت مانگتا تھا اور آج کا نوجوان کیا سمجھے کہ ایک کو دعوت عشق دی تو جیسے اسکی رال بہہ جائے ایسا نہیں تھا عاشق تیر کو ہدف تک پہنچانے کے لیے ایک سائنسی اصطلاح کام میں لاتا تھا مشاہدہ کافی مشاہدات اور مایوسیوں کے بعد جا کر جھیمو کہیں سے مانتی عاشق اتنا حساس ہوتا تھا کہ اگر معشوقہ نے لسی نہ دی تو فوراً دکھی اشعار پڑھنا شروع ہو جاتا اب گاؤں میں میر و غالب سے آشنائی کم ہوتی تھی اس لیے ایسے موقعوں پہ عاشق حضرات پنجابی دوہڑے ماہیے گا لیا کرتے تھے۔

پھر خط کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا فیس بک تو تھی نہیں کہ آناً فاناً دل کی بات دل تک پہنچ جائے۔ اس کارِ خیر کے لیے کبوتر کی خدمات لی جاتی تھیں۔ پیغام رسانی کی کثرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عاشق جو بھی کبوتر لاتا وہ کچھ دن بعد اڑ جاتا۔ اس زمانے میں خصوصاً دیہات میں معاشقہ کم ہی ہوتا تھا جس کی بنیادی وجہ دیہات میں کالجوں کا نہ ہونا تھا۔ اور اگر کر کرا کے کوئی معاشقہ منطقی انجام کو پہنچتا بھی تو پہلے والی چاشنی کھو دیتا۔ کیونکہ دیہات میں لوگ مال مویشی رکھتے تھے اور اللہ کے فضل سے لوگوں کی اولاد بھی زیادہ ہوتی تھی۔ معشوقہ کے لیے یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی کہ عشق تو ایک سے کیا سزا سب سے کیوں ملے؟ اس لیے یہ معاشقہ ارینج میرج میں بدل جاتا۔ زمانہ اگرچہ بدل گیا ہے لیکن دو چیزیں نہیں بدلیں ایک معشوقہ کی یہ خواہش کہ عاشق کا خاندان چھوٹا ہو اور دوسری عاشق کی یہ خواہش کہ سالیاں زیادہ ہوں تا کہ بوقت ضرورت اِن سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

سید ممتاز علی بخاری

مجھے میرے شاگردوں سے بچاؤ

میرے سامنے خط کا کھلا لفافہ پڑا ہوا تھا اور خط میرے ہاتھوں میں تھا۔ یہ خط مجھے گاؤں سے میرے والد محترم نے بھیجا تھا۔ میں نے خط کی تحریر کو تین چار بار پڑھا اور پھر اسے اس لفافے میں ڈال دیا جس میں اس نے گاؤں سے سفر طے کر کے شہر آیا تھا۔ پھر اسے گوند سے چپکا کر میز کے اس دراز میں ڈال دیا جس میں پہلے ہی ایک درجن سے زائد خطوط موجود تھے۔ دراز کو مقفل کر کے میں نے زور سے میز کو مکہ مارا اور پھر بڑبڑاتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے ایک سرد آہ لی اور پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔

یقیناً آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح مجھے یہی مشورہ دیں گے کہ مجھے اپنے گھر والوں کی بات مان لینی چاہیے اور باغیانہ روش ترک کر دینی چاہیے۔ آپ کا خیال ہو گا کہ میں بھی ان ہزاروں طلباء میں سے ہوں گا جو اپنے گھر کے دیہاتی ماحول سے بھاگ کر شہر کی رونقوں میں کھو گیا ہوں۔ مجھے میرے گھر والے واپس آنے پر اصرار کر رہے ہیں اور مجھے شہر کی روشنیاں بھا گئی ہیں۔ یا پھر یہ کہ گھر والوں سے ناراض ہو کر میں نے شہر کو جائے پناہ سمجھ لیا ہے۔ اگر آپ یہ نہیں سوچ رہے تو پھر یقیناً آپ بھی مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہی سوچ رہے ہوں گے جو مجھے پہلے پہل اس حالت میں دیکھ کر میرے دوست صفدر نے سوچا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے والدِ محترم میری شادی کسی بوڑھی جاگیردارنی سے کروانا چاہ رہے ہوں گے اور مجھے شہر کی کوئی چنچل اور ماڈرن لڑکی سے عشق وغیرہ ہو گیا ہے۔ صفدر نے تو مجھے اپنے تئیں اس بات کے لیے رضامند کرنے کے واسطے اپنی کوششیں بھی شروع کر دی تھیں۔ اس ضمن میں اس نے کئی علماء اور مساجد کے پیش اماموں سے دو شادیوں کے حق میں کئی فتوے بھی لے آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے اس جاگیردارنی سے بھی شادی کر لینی چاہیے اور محبوبہ کو بھی میں اپنے ہاتھ سے جانے نہ دوں۔

آپ کے یہ سارے خدشات بالکل بے جا اور بے بنیاد ہیں۔ نہ ہی میں شہر کی رنگینیوں میں کھویا ہوں اور نہ ہی اپنے دیہات کی خالص آب و ہوا، کھیتوں کے دلفریب نظارے اور اپنے رشتہ داروں کے بے لوث تعلق کو بھول پایا ہوں۔ جہاں تک عشق کی بات ہے تو آپ کے باقی اندازوں کی طرح یہ بھی درست نہیں اور جب صفدر کو بھی میرے اصل مسئلے کا علم ہوا تو پھر اس دن کے بعد اس نے کبھی میری اس حالت کو سدھارنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ یہ مسئلہ تھا ہی کچھ ایسا۔ بات کچھ یوں ہے کہ میرے والدِ محترم کا پیشہ معلّی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آبائی پیشے کو

باپ (بمعنی روحانی باپ) بن جاتا ہے اور دوسرا کچھ پیسے بھی ہاتھ آجاتے ہیں۔آج کل کے دور میں اس سے زیادہ منافع بخش کاروبار کوئی نہیں۔یہ وہ واحد کاروبار ہے جس میں رات دن چوگنی ترقی ہوتی ہے۔اس کے باوجود میں استاد بننے پر راضی کیوں نہیں۔یقیناً آپ بھی وہ وجہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں گے جس کی وجہ سے میں اتنے سنہرے موقعے کو ہاتھوں سے یوں جانے دے رہا ہوں جس طرح لوگ ہاتھوں سے میل کو جانے دیتے ہیں۔اس کی واحد وجہ صرف اتنی ہے کہ میں بے شمار اساتذہ کو اپنے شاگردوں کے سامنے (زانوئے تلمذ طے کیے) شرمسار ہوتے دیکھا ہے۔نئی نسل کے شریر بچے ان کے پیچ وخم کس دیتے ہیں اور خدا کی پناہ۔۔۔!!! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک استاد کو ناک سے زمین پر لکیریں بھی کھینچتے دیکھا ہے۔عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے مظلوم مخلوق ''شوہر'' ہوتا ہے لیکن اگر غیر جانبداری سے ملاحظہ کیا جائے تو اکیسویں صدی میں شوہروں سے بھی مظلوم آج کا استاد ہے جو کسی زمانے میں روحانی باپ بھی مانا جاتا تھا۔اس پر مستزاد ''مار نہیں پیار'' کا نعرہ جس نے استاد کے رہے سہے رعب و دبدبے کو بھی شاگردوں کے قلب و ذہن سے نکال دیا۔میرے کچھ دوست ان دنوں مظلوم اساتذہ کی ایک انجمن بنانے کے چکروں میں ہیں۔میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ دوسروں کو ٹھوکر لگتے دیکھ کر سبق سیکھوں اور خود کو مجروح ہونے سے بچاؤں۔شاید اسی وجہ سے آج تک میرا سر، گردن اور دل سلامت ہیں۔

میں پہلے آپ کے سامنے اپنے چند احباب کے ساتھ ان کے شاگردوں کے روا رکھے گئے رویوں کو بیان کروں گا پھر آپ سے

انصاف حسبِ حیثیت

منے میاں ہمارے پڑوسی ہیں اور اس نوخیز نسل کی کونپل ہیں جسے آگے چل کر پھول بننا ہے، پتہ نہیں گوبھی کا پھول یا گلاب کا۔ البتہ آثار بتاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ان کے عینک لگ جائے گی اور بال بڑھائے، سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ چٹکی بجا کر، گل جھاڑتے ہوئے کہا کریں گے "بائی دی وے انکل، ہمارے ہاں سنسر اتنا نیرومائنڈڈ کیوں ہے؟ ہم سنسر کی قید سے آزاد فلمیں کیوں نہیں بناتے۔ ماشا اللہ ہمارے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بدر منیر ہے، مسرت شاہین ہے، منزہ شیخ ہے، سنیتا خان ہے، اتنا سہم سہم کر، بچ بچ کر، مرغی چوزوں کی طرح دائیں بائیں دیکھ کر فلمیں بنانے کی کیا ضرورت ہے، آجاؤ کلر کٹ میدان میں!"

اس طرح تو ہوتا ہے از اعتبار ساجد

مشورہ طلب کروں گا کہ مجھے استاد بننا چاہیے یا نہیں۔

میرے ایک دوست ہیں جن کا اسم گرامی "اشرف خان" ہے۔ ایک سرکاری تعلیمی ادارے میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ نہایت سادہ طبیعت کے مالک ہیں۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر بچوں پر رعب جمانے کی بڑی کوشش کرتے ہیں لیکن آخرکار کہیں نہ کہیں ان کا "ہاسا" نکل جاتا ہے۔ بچوں کو سمجھانے کے لیے نہایت دلچسپ اور آسان طریقے استعمال کرتے ہیں لیکن اکثر اوقات یہی طریقے ان کے گلے کا طوق بن جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے ان کے شب و روز کا احوال دریافت کیا۔ پوچھنے ہی کی دیر تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا دریائے نیل لیے کچھ یوں گویا ہوئے: بھئی اس سے تو بہتر تھا کہ میں بھیک مانگتا۔ میں نے وجہ پوچھی تو رونی صورت بنا کر بولے: یار کیا بتاؤں۔ یہ غالباً پچھلے ماہ کی بات ہے۔ میں کلاس میں گیا اور جاتے ہین میں نے پڑھانے کے لیے کتاب کھولی۔ ابھی ایک پیراگراف بھی پورا نہیں پڑھایا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک کنکر آ کر کتاب پر گر پڑا۔ میں نے سکول کی چھت کی طرف دیکھا جہاں سے مٹی کے آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے کتاب پر دوبارہ نظر کی تو اچانک ایک اور کنکر کہیں سے میرے سینے پر آ لگا۔ میں نے اس حرکت کا منبع دریافت کرنے کی کوشش کی اور ایک بچے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ میں نے اس کی تھوڑی سرزنش کی اور اسے کلاس کے سامنے کھڑا رہنے کا حکم دیا اور دوبارہ پڑھانے لگا۔ ابھی میں نے ایک جملہ ہی پڑھا کہ ایک بار پھر اسی حرکت کا اعادہ ہوا۔ میں نے نئے کھلاڑی کو بھی پکڑ لیا اور سرزنش کے بعد کلاس کے سامنے بلیک بورڈ کے ساتھ دوسرے لڑکے کے ہمراہ کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ وہ بھی وہاں کھڑا ہو گیا۔ میں سکون کی سانس لیتے ہوئے دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ اتنی دیر میں ایک اور کھلاڑی میدان میں اتر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ بلیک بورڈ کے ساتھ کھڑے لڑکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر ایک وقت آیا کہ کلاس کے بنچ خالی تھے اور بلیک بورڈ کے سامنے والی دیوار بھری ہوئی۔۔۔ اب ایسے میں میں انہیں کیا پڑھاتا۔ لڑکوں نے پتا نہیں کہاں سے یہ حرکت سیکھی اب میں روزانہ ان کی اس مشقِ ستم کا نشانہ بنتا ہوں۔

ارسلان شاہ تو شاگرد کے نام سے ہی بھاگتے ہیں۔ موصوف کو ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے لیے تقریباً تین سال بعد کالج میں ملازمت ملی۔ تین چار سال تک انہوں نے بڑی مشکلوں سے کچھ جمع پونجی اکٹھی کی تاکہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو سکیں۔۔ ان دنوں جب ان کی شادی کے دن مقرر ہونے والے تھے کہ ان کا ایک، لاڈلے طالب علم ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری بہن ہسپتال میں ایڈمٹ ہے اسے کینسر ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ اس کے علاج کے لیے چار پانچ لاکھ چاہیں۔ اب میں ادھار مانگ رہا ہوں اگر کچھ ہو سکے آپ میری مدد فرما دیں۔ انہوں نے اپنی جمع پونجی بنک سے نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔ چند دن بعد ان کو اطلاع ملی کہ جس لڑکی سے ان کی شادی ہونے والی تھی، ان کے اس جواب کے بعد کہ اگلے سال شادی کروں گا، اس کی شادی ایک اور لڑکے سے ہو رہی ہے۔ جب انہوں نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ان کا لاڈلا طالب علم ان کی منگیتر سے شادی کر رہا ہے۔

لو جی! میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو باہر میرے والد محترم بنفسِ نفیس کھڑے نظر آئے۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

عقل نیفے میں

جب کسی کی نالائقی پر ہرزہ سرائی کرنا مقصود ہوتو ہم اکثر یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ" فلاں کی عقل گھاس چرنے گئی ہے" یا" آپ کے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے" تو لیجیے جناب میرا تخلیق کردہ ایک نیا اور تازہ ترین محاورہ بھی سن لیجیے کہ "فلاں عقل نیفے میں اڑس کر آتا ہے۔" اب آپ دوسرے محاوروں کی طرح اس کا پس منظر جاننے کے لیے بے تاب ہو رہے ہوں گے تو وضاحت کرنے کے لئے مجھے اپنی آپ بیتی بلکہ" دِن بیتی" سنانی پڑے گی لہذا کان کھڑے کر لیجیے اور بالکل خرگوش بن کر اور آنکھیں تحریر پر مرکوز کر کے، بالکل ایک بھوکے کی طرح جو صرف خوان پر نظریں جمائے شڑپ شڑپ کھاتا ہے، سننے اور پڑھنے کے لئے ہمہ تن خرگوش اور دیمک بن جایئے۔

صاحبو! وقوعہ (واقعہ) کچھ یوں ہوا کہ امسال گیارہویں، بارہویں کے سالانہ امتحان کے لیے ناچیز کو معاونِ ممتحن (انوجیلیٹر) کے طور پر ایک سنٹر بھیجا گیا۔ سنٹر کا نام شجرِ ممنوعہ جان لیجیے کیوں کہ افشائے راز نقضِ امن کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے جو کہا جائے سچ کہا جائے گا اور کنایتاً کہا جائے گا۔ کردار بھی فرضی ہوں گے اس لئے معذرت بہ وجہِ مصلحت۔

جب ادائیگی فرض کے سلسلے میں ہم نے امتحانی ہال میں قدم رنجہ فرمایا، وہ بھی طوفانی رفتار سے کیونکہ سنٹر بہت دور تھا اور مابدولت کی گاڑی، اگرچہ ماشاء اللہ انجر پنجر ہے مگر اس دن کمال دکھا گئی کہ اپنی فریادی وجود سے مجھے وقت پر بال بلا حیل وحجت پہنچا دیا لیکن ہال کا حال دیکھ کر کان کی لویں تپنے لگیں اس پر مستزاد یہ کہ حبس اور گرمی نے سفر میں بھی خاصا تپا دیا تھا۔ تمارا ستے حسد کی اسی آگ میں جلتے بھنتے کاٹی تھی کہ ہم اساتذہ بھی کس قدر مسکین اور مظلوم مخلوق ہیں کہ جنہیں طبقۂ کمین میں شمار کیا جاتا ہے، بہت تیر ماریں بھی تو سیدھی سادی گھریلو قسم کی گاڑی کے ہی متحمل ہو سکتے ہیں، ائرکنڈیشنڈ گاڑیاں تو صرف اُنہیں کی تشریف کا بوجھ اٹھاتی ہیں جو نقل بہ وزن عقل نیفوں میں لے کر آتے ہیں، پاس ہوتے ہیں اور افسر بن جاتے ہیں جبکہ ہم استاد تو محض" کتابی دیمک" کی جگت بن کر رہ جاتے ہیں۔

اپنا دماغ ویسے بھی پشتونی ہے اور اُس پر موسم کی گرم مزاجی نے اسے اور بھی دو آتشہ کر دیا تھا، اس لیے فی الفور سرچ اپریشن شروع کر دیا۔ اتنے دہشت گرد پکڑے کہ میرے کمرے

والوں میں ایک بھی نواز شریف نہ نکلا کہ جو لیک ہو کر بھی مقتدر رہے، گویا تمام علمی موت کے ہرکارے تھے اور مستزاد اس پر یہ کہ پرچہ بھی اسلامیات کا تھا۔ ظالم کے بچے نقلیں بھی قابل اعتراض جگہوں میں رکھ کر مار رہے تھے۔

ہماری رگِ معلمیت پھڑک اٹھی اور ہم لگے جھاڑ پلانے کہ اے No جوانانِ پاکستان و تاریک فریبی مستقبل پاکستان پوکٹ یعنی بھیجے عقل پر اس عدم اعتماد اور پاکٹ جو کہ آپ جیسے عقل دانوں نے تصنیف کیے ہیں ہوں گے پر بھروسہ کامیابی سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ماشاء اللہ وطن عزیز مستقبل کے گھامڑوں سے پھٹ پڑے گا اور داعیانِ اسلام جلد ہی شریعت کو غیر شرعی قرار دینے پر اتفاق رائے حاصل کر لیں گے کیونکہ دین کی اتنی سمجھ آگئی اور اِتنا سہل بنا لیا گیا ہے کہ اب قرانی آیات کو نیفوں ،جرابوں اور بوٹوں جیسی جگہوں میں بھر کر عقل ماری جا رہی ہے۔ تف ہے نئی نسل تم پر جو ناموس رسالت و قرآن کے داعی ہو کر خود کتنی آسانی سے بے حرمتی کر جاتے جا رہے ہو اور ڈکار بھی نہیں لیتے!"

وہ پوتڑوں کے بگڑے ہوئے نواب تھے، میری تقریر کا اثر کیا لیتے، الٹا ایک بوری نقل کھنگالنے کے بعد بھی جانے کہاں سے مزید پرچیاں برآمد ہوئیں۔

ہمارے ہال میں اچھی بات یہ تھی کہ بیرونی مداخلت سے پاک تھا ورنہ نعوذ باللہ قران پارہ بہ پارہ ہوا میں اُڑتا ہوا اُن ملیچھ مسلوں کی جھولیوں میں گرتا رہتا۔

حد تو یہ ہوئی کہ پہلے پرچے کے بعد کسی خانوادے کے بھی خواہ اس گوہرِ گمنام کو ڈھونڈتے ڈھانڈتے مابدولت کے غریب خانے میں ٹو ڈیو سے قدم رنجہ عطا فرما گئے اور حوالہ بھی دیا تو ہماری مسجد کے معلم کا، اب بھلا آپ کے اس غریب گوہر کو زبانی ہاں کیے بغیر کیا چارہ تھا سو اس بلا کو ٹالنے کے لیے ہاں کرنا پڑی یعنی سسٹم کا حصہ بننے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا مجبوری ہوگئی اگرچہ عملاً ایسا کرنا میرے لیے کار دارد تھا کیونکہ میرا تعلیم معیار اگرچہ کچھ ایسا بلند پایہ تو نہیں مگر ان نیفوں والے عقل دانوں سے کم از کم پاک اور بے داغ ضرور ہے۔

خدا خدا کر کے یہ امتحانی بلا بغیر کسی ناخوشگواریت کے سر سے ٹلی اور میں نے توبہ کر لی کہ آئندہ ان جھمیلوں میں قطعاً نہ پڑوں گا کیونکہ ہمارے ہاں کی ایک لابی بھی ان کو شہ دے رہی ہے اور خوب طعام قیام اور اوپر کی آمدنی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

ایک ہی صف میں ...
(لمرک)

زبانِ زوجہ کے نرغے میں ہے میاں کی پھبن
ہر ایک مردِ اکڑ خُو بنا ہے بندۂ رن
سو کر سکا ہے کہاں
کبھی بھی چوں و چراں
جو حکم ہو گیا وہ نیڈ فل کیا ہے ڈن

نوید ظفر کیانی

بغدادی نژاد رازی

اختلافی موڑ

مشہور لاطینی مقولہ ہے:
''آج کرے سو کل کر، کل کرے سو پرسوں''
یعنی ''کل کا کام آج نہیں کرو، ہوسکتا ہے کل وہ کام کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔''
یہ مشہورِ زمانہ قول ہے اٹھارہویں صدی کے مفکرِ عظیم ''ولیم کا مچور'' کا۔

ہم کوئی جگ سے نرالے تو نہیں تھے لوگو
ہم پر بھی عہد جوانی کا عذاب اترا تھا

ذکر ہے ہمارے زمانہ سٹوڈنٹی کا۔۔۔
ایک دن جب ہم کینٹین میں ''چکن رول'' کھا رہے تھے، اسی دوران ہم نے میں نے اپنی ''ہم کھاؤ'' سے از راہ تفنن پوچھا کہ ''اے پیاری! ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے کتنے بھائی ہیں، تا کہ ممکنہ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر سیکیورٹی ریڈ الرٹ رکھی جا سکے''
جواب آیا ''ویسے تو پانچ ہیں لیکن ایک ہڈحرام ہے''
جواب میرے لئے کافی حیران کن تھا ''ہیں جی کل تک تو چار تھے، آج پانچ؟ اور ہڈحرام؟''
''ہاں جی، وہ کام شام کوئی کرتا نہیں اور غذائی اشیاء سے اللہ واسطے کا بیر رکھتا ہے، یعنی دشمن اناج کا، اس کی خصلت خاص ہے کہ اگر کوئی نوعِ انسانی برابر سے گزر رہا ہو تو فوراً سوچے کہ یہ بندہ میرے کس کام آسکتا اور کچھ نہیں تو پینے کو پانی ہی مانگ لیتا ہے اور اگر اس سے کوئی کام کہہ دو ولڈز موسٹ لائٹسٹ ٹوپی المعروف ٹھنڈی ٹوپی کرا دیتا ہے''
اس کی قینچی کی طرح کی زبان چچ چچ چلے جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیسی ناہنجار اور ندیدی بہن ہے کہ ''چکن رول'' سامنے ہونے کے باوجود اپنے جیتے جی مردار بھائی کا گوشت کھا رہی ہے، تھوڑے بہت ہڈحرام تو سبھی ہوتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتہ ہی کی تو بات ہے جب میں نے دنبہ کے بال کاٹنے کیلئے امی کی قینچی کی بلی چڑھا دی تھی، وہ دن اور آج کا دن روز امی کو بولتا ہوں کہ اس میں کیا، بس کل لا دوں گا آپ کو نئی قینچی، مگر کوئی سمجھے تب ناں۔۔۔
حسان صاحب کو ہی دیکھ لو، ایک مہینہ سے بولا ہوا ہے کہ ہوجائے گا آپ کا کام، اخباری کالم ہی تو جمع کرنے ہیں پچھلے دو سال کے، اس میں کیا، ایک دن بیٹھوں گا اور کام مکمل، مگر نہیں، جب بھی ملتے ہیں وہی سوال پھر ان سے اچھے تو اجمل چچا ہی ہوئے، بیچارے کو سال پہلے یقین دہانی کرائی تھی کہ ہاں بنوا دوں

گا آپ کے بچہ کا ڈومیسائل، اس میں کیا، بس جس دن جاتا ہوا ڈی سی آفس کی طرف فارم لے آؤں گا، پر کر کے، سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے تصدیق کروا کے جمع کروادوں گا، اس میں کیا، درد دل کے واسطے ہی تو پیدا کیا انسان کو، جب بھی ملتے ہیں پوچھتے ہیں ہاں بئی وہ میرا کام کر رہے ہو ناں؟ اور میں جھٹ سے ہامی ہنکار دیتا ہوں، اس میں کیا، کر دیں گے

بات یہ بندے کو اپنے بھی سو کام ہوتے، اب یہ جو ناخن اتنے بڑے بڑے ہوئے ہوے یں، یہ نہ کاٹوں میں؟ ہفتہ بھر سے نہایا بھی نہیں، وقت ہی کہاں ملتا ہے، اب اگر اپنی بیس سالہ زندگی میں کوئی بندہ چلا کھ دو لاکھ مرتبہ کسی سے پانی مانگ کے پی لے تو وہ کاہل ہو گیا؟ اور جو اس کام کو کروانے پر اِتنی رکعتوں کا ثواب اُسے دیا ہوا ہوتا ہے، اُس کا کوئی مذکور نہیں؟ ہوتا ہے کچھ لوگوں میں، نہیں اچھا لگتا کوئی کام، اگر میں خود سے کھانا گرم کر کے نہیں کھاتا تو ''سستی مارا'' ہو گیا، اگر سو پچاس اسائنمنٹ کسی دوست سے بنوا لئے تو لائق ہو گیا؟ اتنے ہڈ حرام تو سبھی ہوتے ہیں۔

اس کی قینچی کی طرح کی زبان مستقل چل رہی تھی، لیکن اب مجھ سے رہا نہ گیا، بات کاٹتے ہوئے بولا کہ اے پیاری! ذرا یہ تو بتا کہ تیری زبان ہے کہ آغا جان والا ڈرامہ، کیوں اپنے بھائی کی غیبتیں کئے جاتی ہے، کیا اس چکن رول سے ترا پیٹ نہ بھرتا تھا کہ تو اپنے مردار بھائی کی بوٹیاں نوچ نوچ کھا رہی ہے، اور یہ نام کیا ہے تیرے بھائی کا؟

نہ جانے کس بات کا غصہ تھا، تنک کر بولی ''رازی'' اور چلتی بنی۔

ظالم نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ کہے دیتے ''ویٹر! باجی سے ان کا بل لے لینا!''

سیّد ظفر کاظمی

جنریٹر

جنریٹر ایک ایسا لفظ ہے جسے آج کل سنتے ہی ایک خوشگوار تصور ذہن میں ابھرتا ہے، چلتے ہوئے پنکھے، جلتے ہوئے بلب اور کولر کی ٹھنڈی ہواؤں کا تصور۔۔۔

لیکن ہر آدمی ہمارے ہاں جنریٹر نہیں خرید سکتا۔ جنریٹروں کی چار قسمیں ہیں

چھوٹا جنریٹر

درمیانہ جنریٹر

بڑا جنریٹر

اور بہت بڑا جنریٹر

ہم جیسے تو چھوٹے اور درمیانے تک ہی رہتے ہیں کیونکہ آخری اقسام تو اتفاق فونڈری والے ہی لگا سکتے ہیں۔

اِس دفعہ جب گرمی کے آنے کا اشارہ ملا تو جی چاہا کہ عذاب سے بچنے کے لئے ایک عدد جنریٹر لے لیا جائے، دوست احباب نے مشورہ دیا کہ درمیانہ بہتر ہے، بہت چھوٹے کو تو خود بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ چل رہا ہے کہ نہیں۔ پس ہم درمیانہ جنریٹر خریدنے راولپنڈی سٹی صدر روڈ پر ایک کارپوریشن میں پہنچ گئے۔ وہاں کے مالک نے روداد سنی اور ہمارے لئے یاماہا شوٹا کا سات کے وی کا جنریٹر منتخب کیا۔ ہم اسے دیکھتے ہی ڈر گئے کہ اس کے لئے گیس اور اِتنا پٹرول کہاں سے لائیں گے لیکن دوکاندار نے اس کی اتنی خصوصیات بیان کیں کہ وہ جنریٹر ہمیں بہت پیارا بلکہ راج دُلارا لگنے لگا۔

خرید کر گھر لائے تو سب سے پہلا مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ اسے کہاں رکھا جائے تا کہ اہل خانہ اور محلہ اس کے شور سے محفوظ رہیں، آخر لنگر خانہ ایک ایسی جگہ نظر آئے جہاں اِسے رکھا جاسکتا تھا۔ لنگر خانے کا فرش کچا رکھا جاتا ہے اور اس میں رہنے والے مرغے اور مرغی نے اس کو مزید نرم کیا ہوا ہے۔ مکینک صاحب نے کہا کہ ابھی اسے یہیں رکھتے ہیں، اگر اس کے ٹائر نیچے بھی ہو جائیں تو زمین میں تو اوپر کا حصہ محفوظ اور ٹھنڈا رہے گا۔ تجویز پسند آئی اور جنریٹر کو نہایت ادب و احترام سے لنگر خانے کے وسط میں بنے پڑے ستون کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ پہلے دو گھنٹے چلا کر پھر اس کا تیل تبدیل کیا، آواز کچھ زیادہ تھی لیکن مکینک بولے جوں جوں چلے گا ٹھیک ہو جائے گا۔ مزید چوبیں گھنٹے اسے پیٹرول پر چلا کر گھر کے کچھ پنکھوں اور بلبوں کا بوجھ ڈالا گیا، جس کا نتیجہ اچھا تھا اور یقین ہو گیا کہ یہ ایک دن اے سی بھی چلائے گا۔

نیاز تو ہم نے جنریٹر چلانے سے پہلے ہی منگوا کر کھالی تھی۔ آخر جب اسکورنگ کے بعد گیس پر چلایا گیا اور اے سی سے جوڑا گیا تو کچھ عجیب سی آوازیں آئیں، اے سی چل تو پڑا لیکن ہوا گرم تھی۔ مکینک سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو وہ بولا "فکر نہ کریں چلے گا!" لیکن بہت کچھ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ مشین یاماہا کم اور شوٹا زیادہ ہے۔ جنریٹر کے شور کو پہلے پہل مرغے اور مرغی نے بھی ناپسند کیا لیکن اب جب وہ سٹارٹ ہوا تو کچھ دور بیٹھ کر مسکراتے رہتے ہیں۔ جنریٹر ابھی تک متحرک ہے اور اے سی اور ہم ساکن ہیں۔ اب ارادہ ہے کہ ایک کولر سرگودھے والا بنوایا جائے اور باقی زندگی ٹھنڈ میں گزاری جائے۔

حبیب احمد حبیب

ویسے تو حضرت انسان کو اس دنیا میں تشریف لاتے ہی بہت سے امراض کا سامنا کرنا پڑا جن میں سب سے قدیم مرض ہوس تھا کہ جس نے بھائی کا قتل بھائی کے ہاتھوں کروایا سو ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ انسان بے چارا ہوس کا مارا سب سے پہلے جس مرض میں مبتلا ہوا وہ ایک نفسیاتی مرض تھا۔

اب ان نفسیاتی امراض کا بھی کیا کہنا۔۔۔ یہ دماغ سے شروع ہوکر شرم گاہ تک آتے ہیں اور انسان کو کہاں کہاں ذلیل کرواتے ہیں مت پوچھئے۔ اب اگر بات مت پوچھنے کی آ ہی گئی ہے تو آپ کو ایک قصہ سناتے ہیں۔

قدیم زمانے کا قصہ ہے ایک صاحب اپنے ایک دوست کے ہاں ملنے تشریف لے گئے قریب پہنچے تو دیکھا رش لگا ہوا ہے اور لوگ باگ ٹکٹ لے کر لائن میں کھڑے ہیں کسی نہ کسی طرح اندر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں انکے دوست موصوف راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں اور کوئی تماشا دکھلا رہے ہیں اور لوگ ہیں کہ نوٹوں کی بارش کیے جا رہے ہیں تماشا بھی کیا تھا ایک عجیب منظر تھا کہ ایک دس انچ کا گھوڑا اچھدکتا پھر رہا ہے۔

جب تماشا ختم ہوا تو دوست سے پوچھا میاں یہ کیا معاملہ ہے دوست کہنے لگا کیونکہ تم پرانے یار ہو بلکہ یار غار ہو اسلئے تمکو بتلاتا ہوں سنو گھنے جنگل میں اونچی پہاڑی پر ایک بزرگ رہتے ہیں یوں تو وہ ہمیشہ حالت استغراق میں ہوتے ہیں لیکن انکی خدمت میں چلے جاؤ جس دن بھی نظر کرم ہوئی آنکھیں کھولینگے اور خواہش دریافت کرینگے من مانگی مراد ملے گی۔۔۔

مرتا کیا نہ کرتا بے چارا غم کا مارا چلا، جنگل کی اور، اور چڑھا پہاڑی پر۔۔۔ کیا دیکھتا ہے ایک بزرگ سیاہ توت جن کے عجیب تھے کرتوت، بیٹھے ہیں دھونی رمائے، پیر پھیلائے، موقع غنیمت جان، لگا ان کی خدمت میں، دن گزرے راتیں گزریں گزرے ماہ و سال اور پھر ہوا ایک دن عجب کمال، کھولیں بابے نے آنکھیں اور پوچھا مانگو کیا مانگتے ہیں۔۔۔

"بس بابا ہیروں سے بھری بوری مل جاوے تو قسمت کا سکندر کہلاؤں"۔

بابا نے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں پھر بند کیں پھر کھولیں اور پھر ان کی آنکھیں بولیں۔۔۔

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے
سوالی تھے ہاں سوالی تھے ہاں ہاں سوالی تھے
ترکت تا ترکت تا تا تا دھم۔۔۔"

اور پھر بابا جی مجرا ختم کرتے ہی گویا ہوئے:

''جا بچہ جو مانگا ہے ملے گا بلکہ دس گنا ملے گا جا بھاگ بھاگ یہاں سے بھاگ۔''

بھاگم بھاگ گھر پہنچتے تو کیا دیکھتے ہیں صحن میں قطار اندر قطار بوریاں لگی ہیں، لپکے اور جھپک کر ایک بوری کھولی اور پھر دیکھتے چلے گئے دیکھتے ہی چلے گئے۔۔۔

کھیروں سے بھری بوری منہ چڑا رہی تھی۔

بکتے جھکتے پہنچے دوست کے پاس اور لگے پوچھنے ''میاں یہ کیا حرامی پن ہے، مانگے تھے ہیرے اور مل گئے کھیرے؟''

دوست سٹپٹا کر بولا۔۔۔''اور ایک بات تو میں بتانا ہی بھول گیا بابا اونچا سنتے ہیں۔''

آپ بھی سوچ رہے ہونگے اس قصے کا کہانی سے کیا تعلق ہے چلئے اس کو سمجھنے کیلئے ایک اور قصہ سنیں۔۔۔

ایک بار ایک قوم بڑی ذلالت میں پھنسی پڑی تھی اور اس ذلت سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ نکلتا تھا کسی نے کہا کہ فلاں گاؤں چلے جاؤ، وہاں ایک لال بجھکڑ ملے گا جو وہ بولے وہی کرنا بس اسی میں تمہاری خلاصی ہے۔۔۔

ایک وفد تیار کیا گیا اور وہ وفد روانہ ہوا۔ لال بجھکڑ کی تلاش میں منزلیں مارتا ہوا جب وہ وفد اس بستی میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک لمبا سا بانس زمین میں گڑا ہے اور اس بانس پر اپنی تشریف رکھے ایک بابا چڑھا ہے۔ منہ اٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ بابا کے سر پر ایک الو بیٹھا سوچ میں غرق ہے، گلے سے ایک اچھا دھاری ناگن لپٹی ہوئی ہے گود میں ایک لنگور ہے کہ جس نے دونوں کان پکڑے ہوئے ہیں لال بجھکڑ کے، زلفیں لہراتی ہوئی زمین تک آتی ہیں جن پے چلتی ہوئی جوئیں نیچے اوپر آتی جاتی ہیں اس عجیب منظر کا دیکھنا تھا کہ گرے قدموں میں اور لگے فریاد کرنے۔۔۔

لال بجھکڑ نے نکالی پوٹلی سے نسوار اور نسوار لگاتے ہی گویا ہوا ''دیکھو میرے بچو! تمھارے مسئلے کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ ہے ''لال بتی''۔۔۔ بستی کے باہر جانے والے راستے پر کھڑے ہو جاؤ اور جیسے ہی لال بتی نظر آوے اسکا پیچھا کرنا۔''

مرتے کیا نہ کرتے نکلے بستی سے باہر اور لگے لال بتی کی تلاش میں، دوپہر گزری شام آئی شام گزری رات نے پر پھیلائے ابھی شب آدھی ہی ڈھلی تھی کہ عجیب سی آواز آئی۔۔۔ ''گرررڑ گرررڑ گڑ گڑ گڑ گھوں گھوں'' اور چمکی ایک بتی لال، ہوا کمال تو ڈالو دھمال۔

لو جی شروع ہوا لال بتی کا تعاقب، ایک جانب لال بتی کی ''گھرر گھرر'' دوسری جانب گھوڑوں کی ڈگڑ ڈگڑ۔۔۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ گلاب خان کے ٹرک کی لال بتی اُن کا منہ چڑا رہی ہے اور ٹرک شریف کے پچھواڑے پر لکھا ہے ''جلنے والے کا منہ کالا''۔

مرتے کیا نہ کرتے بکتے جھکتے پہنچے لال بجھکڑ کی بستی میں اور دیں اسے استغفی کدال اسٹائل کی گالیاں، دوسری جانب سے لال بجھکڑ چیخا ''بس بس بس۔۔۔ میرے پیارے الو کے پٹھو!۔۔۔ بس۔۔۔ اسی لال بتی میں تمھارے لیے سبق تھا، تمہاری قوم کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ ایک طرف ظلمتِ شب ہے کہ ختم ہی نہ ہووے ہے اور دوسری جانب لال بتی۔۔۔ تو لگا دو قوم کو لال بتی کے پیچھے۔''

میٹرو بس میں اوباش نوجوانوں سے بچنے کے لئے نیا مجوزہ حفاظتی لباس برائے خواتین۔

تو ہم بات کر رہے تھے "مولوریا" کی۔۔۔اجی یہ کوئی ملیریا نہیں، نہ ہی یہ کوئی لوریا(LOVERIA) ہے۔۔۔۔۔یہ تو ہے "لال بتی" المعروف مولوریا۔۔۔دور جدید کی یہ بیماری دراصل اس مریل قوم کیلئے دوا۔۔۔بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ ایک ایسی وبا ہے کہ جو لوگوں کو آنکھوں کا نہیں، عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔یہ بیماری آتی نہیں بلکہ طاری کی جاتی ہے۔لوگ کہتے ہیں جب طوفان آتا ہے تو شتر مرغ ریت میں منہ دیکر سمجھتا ہے کہ بچ جاوے گا اور ہماری قوم جب طوفان آتا ہے تو آنکھوں میں دھول جھونک کر سمجھتی ہے کہ بچ جاوے گی۔مولوریا دراصل ایک وائرس ہے جیسے ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا دکھائی دیتا ہے ایسے ہی مولوریا کے شکار کو ہر مولوی ہرا دکھائی دیتا۔

ایک مولوریا کے مریض کا نفسیاتی ٹیسٹ:

سوال تمہارا نام کیا ہے؟

جواب اوے مولوی۔

سوال کیا کرتے ہو؟

جواب ابے گدھے میں نہیں کرتا مولوی کرتا ہے۔

سوال سوال مولوی کیا کرتا ہے؟

جواب ابے تو مولوی ہے کیا۔۔۔ہاں ہاں تو مولوی ہے، ابے سالے ھاھاھش ش ش

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مولوریا ایک کیفیت کا نام ہے جو کسی بھی معقول آدمی پر کبھی بھی طاری ہو سکتی ہے۔۔۔سنیئے مولوریا کے ایک انٹلیک چول مریض سے گفتگو:

پروفیسر چورن چترویدی صاحب آپ عالمی سیاست کی تاریخ کے حوالے سے کیا کہتے ہیں؟

"ہم ہم ہم۔۔۔دیکھئے سیاست کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی تاریخ کی سیاست پرانی ہے، تاریخ میں سیاست اُس وقت داخل ہوئی کہ جب سیاست میں تاریخ داخل ہوئی جب تاریخ اور سیاست پاس سے بلکہ آس پاس سے گزریں تو اُس وقت وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھیں۔۔۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نے سیاست سے چھیڑ خانی شروع کی اب سیاست بھی کچھ ایسی دودھ کی دھلی تو نہ تھی تو سیاست نے بھی کچھ اوچھی حرکتیں ضرور کی ہوں گی۔۔۔

اچانک مولوریا کا دورا پڑتا ہے:

اور میں تمہیں بتلاؤں کہ اس سیاست کی تاریخ اور تاریخ کی سیاست کی ماں بہن کس نے ایک کی جب سے یہ مولوی اس تاریخ میں گھسا سیاست کی میا تو اسی وقت مری۔۔۔اور ہاں تو بھی مجھے مولوی ہی لگتا ہے۔۔۔ابے سالے ۔۔۔ھاھاھاھش ھش ھش ش ش ش ش۔۔۔

اور اب لگتا ہے پوری قوم کو اس مولوریا وائرس میں مبتلا کر کے ٹرک کی لال بتی کے پیچھے لگایا جا رہا ہے۔

ہر سوال کا ایک جواب۔۔۔**مولوی**

گامے کی لڑکی کیوں بھاگی۔۔۔**مولوی**

گھسن کے ہاں اولاد کیوں نہیں ہوتی۔۔۔**مولوی**

رمضان سے پہلے پندرہ روپے کلو بکنے والے آلو پچاس روپے کے کیسے ہوئے۔۔۔**مولوی**

شریف پولٹری والے کی ٹنڈ کیسے نکلی۔۔۔**مولوی**

نسوار خان کی شادی کیسے ٹوٹی۔۔۔**مولوی**

میری بھجیا کا ناڑا کون لے بھاگا۔۔۔**مولوی**

اُس کی چنریا میں داغ کیسے لاگا۔۔۔**مولوی**

ملا ملا کردی نی میں آپے ملا ہوئی
سدوّنی مینوں دھیدو ملا، ہیر نہ آکھو کوئی
ملا میں وچ میں ملے وچ، ہور خیال نہ کوئی
میں نہیں اوہ آپ ہے، اپنی آپ کرے دلجوئی
ملا ملا کردی نی میں آپے ملا ہوئی
سدوّنی مینوں دھیدو ملا، ہیر نہ آکھو کوئی
ہتھ کھونڈی میرے اگے منگو، موڈھے بھورا لوئی
بلھا ہیر سلیٹی ویکھو، کتھے جا کھلوئی
ملا ملا کردی نی میں آپے ملا ہوئی
سدوّنی مینوں دھیدو ملا، ہیر نہ آکھو کوئی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

چینی تمام شُد ، کبھی آٹا تمام شُد
چخ چخ سے بیوی کی، ہوا بھیجا تمام شُد

گھِس گھِس کے پہلے ہوگیا جُوتا تمام شُد
عاشق ہے اب تو سارے کا سارا تمام شُد

مُنہ میٹھا کرنا ٹھیک نہیں بعدِ مرگ تو
کیوں فاتحہ پہ کرتا ہے حلوہ تمام شُد

وہ گُل کھلائے دوسری بیوی نے الاماں
ہونے نہ پایا تھا ابھی سہرا تمام شُد

یہ اے بی سی کے وائرسوں کا عمل نہیں
ہے تیری بے رخی سے کلیجہ تمام شُد

ڈسپنسر کی توند تو پھیلے ہے رات دن
پڑھ پڑھ کے ڈاکٹر ہے بچارہ تمام شُد

حرص وہوس کے گھوڑے کو دے دیں ذرا لگام
اس مُلک کو کریں نہ خدارا تمام شُد

منظوم کرکے اس کو ظرافت کے نام پر
کردیتے ہیں وہ حُسنِ لطیفہ تمام شُد

ہم تو کھڑے رہے کئی گھنٹے قطار میں
جب باری آئی بولا وہ ،''سودا تمام شُد''

مظہر جلوس نکلے گا ہر دم عوام کا
ہوگا نہ ملک میں کبھی جلسہ تمام شُد

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بنام مہدی حسَن ہی ، سہی رسائی تو ہے
غزل ہماری انہیں یوں پسند آئی تو ہے

کہا لجا کے یہ اک نوے سالہ بوڑھے نے
انھوں نے بات ہماری کہیں چلائی تو ہے

جو منہ دُھلا تو مری بات کا یقین کیا
فریبِ حُسن پہ تم نے بھی منہ کی کھائی تو ہے

سلام ہے نہ دعا ہے ، کہ گھر میں آتے ہی
سوال ہوتا ہے بس یہ کہ وائی ۔ فائی تو ہے ؟

''پناما لیکس'' میں اپنا نہیں ہے نام جناب
سو اس طرح ہمیں کچھ زعمِ پارسائی تو ہے

ہمیں تو خالی صفحہ پر بھی مل گئے نمبر
یہ ممتحن نے لکھا کچھ نہ ہو صفائی تو ہے

تمہارے ہاتھ سے مَس ہو کے آئی ہے مِس کال
ہماری یاد چلو جس طرح ہو آئی تو ہے

یہ اور بات کہ احباب کچھ مکر جائیں
وگرنہ عشق میں سب نے ہی مار کھائی تو ہے

گریں نہ ہم سخن آرائی کے اکھاڑے میں
غزل میں دیکھئے عارف کی ، ٹانگ اڑائی تو ہے

تنویر پھول

جری ابنِ جری ہوں، وہ سدا اعلان کرتا ہے
بڑا رُستم بنا پھرتا ہے پر چوہوں سے ڈرتا ہے

وہ گنجا ہے، لگاتا تیل ہے، رکھتا ہے کنگھا بھی
ہمیشہ آئنے کے سامنے گھنٹوں سنورتا ہے!

نظر آتی غریبوں کو ہے ایسے خواب میں روٹی
کہ جیسے چودھویں کا چاند بادل سے اُبھرتا ہے

لگا کر گوند کُرسی سے چپک جاتا ہے یوں لیڈر
اُتارے کھینچ کر پبلک تو مشکل سے اُترتا ہے

جو گھس جاتا ہے بھوکا خر ہماری کشتِ دولت میں
دولتی جھاڑ کر وہ جلدی جلدی فصل چرتا ہے

خزانہ لُوٹ کر وہ منتقل کرتا رہے باہر
غرض اس کو نہیں ہے، کوئی جیتا ہے کہ مرتا ہے

حقیقت ہے، کہا خرگوش نے یہ ننھی بکری سے
لگا کر غازۂ خوں، شیر کا چہرہ نکھرتا ہے!

اگر باہر ملیں کُتے، وہ بھیگی بلی بن جائے
مثالِ ضیغمِ صحرا وہ گھر میں ہی بپھرتا ہے

کہا یہ پھول نے، اے پھول گوبھی کے اتری قسمت!
مری بیگم کے ہاتھوں پکنے سے پہلے بکھرتا ہے

تنویر پھول

لے گئی بچوں کو بھی، ہم کو اکیلا کر دیا
کیوں ضعیفی میں ہمیں بیگم نے تنہا کر دیا

ہو گیا بے کار جس نے جام اس کا پی لیا
عشق وہ ہے جس نے غالب کو نکما کر دیا

ہم سے بھی ہے دوستی، دشمن سے بھی ہے دوستی
دوستی میں یار! کیوں گڑبڑ گھٹالا کر دیا

آئی وہ میکے سے جلدی، ہم کو تنہا جان کر
جب نظر آئی پڑوسن، حشر برپا کر دیا

ہم تو سمجھے تھے، نگاہِ ناز ہے اپنی طرف
بھینگی آنکھوں نے تمھاری، ہائے! یہ کیا کر دیا

موٹے چوہے کی طرح تھا وہ رقیبِ رُو سیاہ
تم نے جب اُس کو بلایا، ہم نے بلوہ کر دیا

اِک قصائی نے بتایا اپنا گُر ہنستے ہوئے
گوشت پر روغن لگایا، اُس کو تازہ کر دیا

شیخ جی چمچے چُرا کر نکلے شادی ہال سے
گیٹ پر پکڑے گئے، درباں نے رُسوا کر دیا

سُن لیا بیگم نے، اب تو سر سے اُڑ جائیں گے بال
پھول! اُس نے آج اظہارِ تمنا کر دیا

عبدالحکیم ناصفؔ

گا گا کے ناچ ناچ کے ٹھمکے لگاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک
دُنیا کے غم کو آج دُھوئیں میں اُڑاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

اِس امن کے سُرور میں کِس سے ہو اِختلاف، دُشمن کلیجہ کھائے تو کر دو اُسے معاف
کُچھ نہ ملے تو شوق سے گُٹکا چباؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

کل کا مرے تو آج ہی مر جائے یہ غریب، اس کے نصیب بد ہیں مگر ہم ہیں خوش نصیب
رُپیا گھٹاؤ قیمتِ ڈالر بڑھاؤ وست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

اپنے ضمیر کی نہ کبھی سُنتا کوئی بات، رشوت، فریب، جھوٹ سے سرشار ہے حیات
صدیوں سے چل رہا ہے یہاں مُک مُکاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

قانون کا نہ رکھنا کبھی دِل میں خوف تم، اِنصاف بھی متاع کی جھنکار میں ہے گُم
پھنس جاؤ تُم کبھی تو کرو بھاؤ تاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

وائن، منی بلیک کی پیدا کرو سکت، خود چل کے پاس آئیں گی "اعیانِ مملکت"
خود بھی پیو اِنھیں بھی شرابیں پلاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

تُم بھی مگر مچھوں کی رکھو سامنے مثال، یعنی غمِ عوام میں تُم بھی رہو نِڈھال
تُم بھی اِسی مِزاج کے آنسو بہاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

منڈی ہے مال و زر کی یہاں بیچ دو سبھی، مِلتی ہے زِندگی میں "فضیلت" کبھی کبھی
ایماں کے بھی جو دام لگیں بیچ کھاؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

جب مُفلسی کے، بے حِسی کے لگ رہے ہوں گھاؤ، خود قہقہے لگاؤ زمانے کو بھی ہنساؤ
ناصفؔ کے ساتھ ساتھ یہی گُنگناؤ دوست! دھن دھن تنک تناک دھنا دھن تنک تنک

عبدالحکیم ناصفؔ

علم و فن کے چہرۂ رنگین انٹرنیٹ پر
دیکھتے ہیں آپ کیا کیا "سین" انٹرنیٹ پر

لُطف کا جویا ہے ہر شوقین انٹرنیٹ پر
دین انٹرنیٹ پر بے دین انٹرنیٹ پر

رُوس محروموں کی محرومی کا کرتا ہے علاج
صنعتیں دِکھلا رہا ہے چین انٹرنیٹ پر

لے رہی ہے "باتھ سی سائیڈ" پہ "لیڈی ٹاپ لیس"
دیکھئے یہ پیکرِ نمکین انٹرنیٹ پر

مست ہو کر پھن پھُلائے رقص میں ہیں شیش ناگ
جوگیوں کی سُن رہے ہیں بین انٹرنیٹ پر

قصرِ سُلطانی کا گنبد کیا ہے اور کیسی چٹان
تک گیا اقبالؔ کا شاہین انٹرنیٹ پر

ایسا لگتا ہے کہ کیفے میں صلیبی جنگ ہے
روز ملتے ہیں صلاح الدّین انٹرنیٹ پر

پائے مرداں آج کل اُٹھتے نہیں سُوئے حبیب
پا گئے کیا صورتِ تسکین انٹرنیٹ پر

یا الٰہی! کون سا گنجینۂ گوہر کھلا؟
شاہ انٹرنیٹ پر، مسکین انٹرنیٹ پر

دیکھ کر چینی ترقّی نکتہ چیں "نیوارک" ہے
دیکھتا ہوں ابروئے پُرچین انٹرنیٹ پر

دن میں وہ ماہِ لقا ملتی نہیں اُن کو مگر
رات کو ہوتے ہیں شمس الدّین انٹرنیٹ پر

اُس کا رُخ میں نے ہٹا کر اپنا چہرہ رکھ دیا
شاہ رُخ کی ہو گئی تضمین انٹرنیٹ پر

آہنی ہاتھوں میں ہے اوجِ ثریا آجکل
آئرن کے ساتھ ہے پروین انٹرنیٹ پر

شاعری ناصفؔ کی ہے مانا کہ ساری "نان سینس"
"نال" اُس کے "نس" گئی نسرین انٹرنیٹ پر

عتیق الرحمٰن صفی

فکرِ روشن نہ تازہ زمیں ہے میاں
تیرے اشعار میں کچھ نہیں ہے میاں

آج سے سال ہا سال پہلے تلک
تھا جہاں پر تُو اب بھی وہیں ہے میاں

ہے تری ہی وہ اِک فیس بک آئی ڈی
جو کہ عاشق تری نازنیں ہے میاں

خود کو جس شہر کا ہے بتاتا ہمیں
کب وہاں کا کوئی تُو مکیں ہے میاں

تجھ کو جس شعر پر داد سب سے ملی
اِک وہی شعر تیرا نہیں ہے میاں

تو مکینک بڑا ہی زبردست ہے
سب کو اس بات پر کُل یقیں ہے میاں

پانچ اشعار میں ہیں فقط دو ترے
وہ بھی تو کچھ نہیں آفریں ہے میاں

اک بجا بات پر بزمِ تنقید میں
کس ڈھٹائی سے تُو نکتہ چیں ہے میاں

آئنہ ہی تجھے تو دکھایا ہے بس
کیوں چڑھانے لگا آستیں ہے میاں

تیرے اوصاف اُسی کو نظر آئیں گے
پاس جس کے بھی اِک خوردبیں ہے میاں

کیا کہوں میں تری جدّتِ شعر پر
شاعری بھی یہاں شرمگیں ہے میاں

چھوڑ دے شاعری تُو کوئی کام کر
مشورہ اک یہی بہتریں ہے میاں

ڈاکٹر عزیز فیصل

یہ خرابی ہے مرے عہد کے دلداروں میں
خود کو رکھتے ہیں سدا مالی طلبگاروں میں

تو کبھی پونڈ، کبھی یورو، کبھی ڈالر ہے
تو ہے مقبول اِنہیں ناموں سے بنکاروں میں

ظلم تو یہ ہے کہ ناکارہ تریں چھوٹے لوگ
دندناتے ہوئے پھرتے ہیں بڑی کاروں میں

سونگھنے والوں کو قسمت سے ملا کرتے ہیں
پھول جڑوے تری زلف کی مہکاروں میں

سب ترے نام سے کرتے ہیں دل و جان سے پیار
ذکر کرتے ہیں کیلنڈر ترا اتواروں میں

ایک دم کتنے لٹر تو نے کمی کر دی ہے
شربت دید کی محدود سی مقداروں میں

ڈھیر کچرے کا جو گوری نے بنا رکھا ہے
خط پڑے ہوں گے مرے بھی انہیں انباروں میں

مولوی دیکھ کے پاگل نے کہا ہنستے ہوئے
یہ بھی شامل ہے محبت کے گنہ گاروں میں

ایک نقاد نے لکھ کر یہ مجھے بتلایا
کتنی اغلاط ہیں فیصلؔ ترے ''اشعاروں'' میں

وہ اِدھر سے اُدھر نہیں آتی
سیٹ کو چھوڑ کر نہیں آتی

خواب میں جب وہ ملنے آئے تو
لے کے کیوں چارجر نہیں آتی

وہ بھی ہیں ناقدین شعر، جنہیں
شاعری شعر بھر نہیں آتی

سینئر اہلیہ بھی گھر پہ ہے
''پر طبیعت اد ?ر نہیں آتی''

کتنے بچے کھڑے ہیں کوچے میں
کیوں نظر اک مدر نہیں آتی

عقد ثانی، نکاح ثالث کی
''کوئی صورت نظر نہیں آتی''

ڈھونڈتے ہیں وہ پن حسینہ کا
جن کو ہتھنی نظر نہیں آتی

گو کہ اردو میں اب وہ ایم فل ہے
اس کو اردو مگر نہیں آتی

نوید صدیقی

ہیلپر سے اس کے پوچھ نہ ایڈوائزر سے پوچھ
کاٹا ہے کیا قسائی نے خود جان ور سے پوچھ

جا کر کہاں رکے گا یہ مہنگائی کا سفر
چارہ کچھ اس کا جا کے کسی چارہ گر سے پوچھ

پوچھو نہ مجھ سے تھانے میں گزری ہے کیسے رات
"تفصیلِ واردات مری چشمِ تر سے پوچھ"

اوزان اور عروض سے بھرتا نہیں ہے پیٹ
آتا نہیں یقین تو شاعر کے گھر سے پوچھ

وہ بھی ہے اپنی بیٹی کی مانند بدمزاج
احوال ساس کا کبھی اپنے سسر سے پوچھ

نوید صدیقی

جتنا اونچا کوئی منصب دار ہے
معاف کیجیے! اُتنا ناہنجار ہے

کیا کروں تم سے حکومت کا بیاں
ہائے توبہ! ہائے استغفار ہے

ہے کنواری زندگی بھی رائیگاں
راہ شادی کی بھی ناہموار ہے

سنسنی ۔ افواہ ، موٹی سرخیاں
بس یہی کچھ آج کا اخبار ہے

کام اس کا دفعتاً ہو جائے گا
جو بڑے صاحب کا واقف کار ہے

وہ نہیں رکھتا خود اپنی سوچ تک
وہ فقط بیگم کا پیروکار ہے

بیٹھتا ہے رات بھر ایف بی پہ وہ
لوگ کہتے ہیں کہ شب بیدار ہے

کر کے میرے گال پر تھپڑ رسید
یار بولا "پیار کا اظہار ہے"

ربط ہے دس لڑکیوں سے ایک ساتھ
پھر بھی لڑکا صاحب کردار ہے

امجد علی راجا

مفلسی کے دور میں کھایا جو اک گھر کا نمک
عمر اس در پر گزاری، اس قدر بھایا نمک

باس کی کالی سی بیٹی بن گئی زوجہ مری
لے گیا آغوشِ الفت میں مجھے کالا نمک

میرے آنے کی خوشی میں وہ تو پاگل ہوگئی
ڈال دی سالن میں چینی، کھیر میں ڈالا نمک

لنچ پر مجھ کو بلا کر، چل پڑی غیروں کے ساتھ
اس طرح ظالم نے زخموں پر مرے چھڑکا نمک

سالیوں نے سامنے رکھ دی تھی "مصری" کی پلیٹ
شرم کے مارے وہ دلہا کھا گیا سارا نمک

ہے فشارِ خون بڑھنے کا سبب بیگم مری
اس لئے بیگم کا میں نے نام ہے رکھا نمک

اس کو دے دے کر صدائیں دکھ گیا میرا گلہ
خود نہ آیا پر غراروں کے لئے بھیجا نمک

فرق بیگم اور محبوبہ میں ہے نمکین سا
اک طرف پھانکا ہو جیسے، اک طرف چکھا نمک

عاشقوں کو قدر اس کی آگئی پھینٹی کے بعد
جب تکوروں کے لئے زخموں پہ تھا رکھا نمک

امجد علی راجا

اکیلے تم نہیں جس کی دھلائی ہوتی رہتی ہے
کبھی کی اپنی بیگم سے لڑائی ہوتی رہتی ہے

کرپشن جرم ہے میرا، یقیناً چھوٹ جاؤں گا
ہمارے ملک میں یہ کارروائی ہوتی رہتی ہے

وہ عمرہ ہو کہ حج، سرکار کے خرچے پہ کرتے ہیں
کہ یوں دونوں جہانوں کی کمائی ہوتی رہتی ہے

کبھی مہنگائی کی زد میں کبھی بیگم کے نرغے میں
مسلسل اپنی جیبوں کی صفائی ہوتی رہتی ہے

خدا جانے خزانے کیا چھپے ہیں روڈ کے نیچے
بھرائی ہوتی رہتی ہے، کھدائی ہوتی رہتی ہے

کہاں اک سیلری میں کار، کوٹھی، بیویاں دو دو
خدا کا شکر اوپر کی کمائی ہوتی رہتی ہے

میں ہر بچے کی پیدائش پہ منہ میٹھا کراتا ہوں
سو ہر دسویں مہینے میں مٹھائی ہوتی رہتی ہے

ہاشم علی خان ہمدمؔ

سیلفیاں روز بناتے ہو غضب کرتے ہو
اور پھر سب کو دکھاتے ہو غضب کرتے ہو

دھن چھپاتے ہو کہیں دور جو پانامہ میں
کمپنی آف دکھاتے ہو غضب کرتے ہو

کیمرہ رکھتے ہو فوکس مرے سرداروں پر
بس مجھے آنکھ دکھاتے ہو غضب کرتے ہو

یہ ولیمہ نہیں چہلم کی دعا ہے صاحب
اس قدر شوق سے کھاتے ہو غضب کرتے ہو

رات بھر شہر میں بجلی نہیں ہوتی پھر بھی
بتیاں گھر کی بجھاتے ہو غضب کرتے ہو

ڈھول ڈھپا تو محبت میں کسی کا حق ہے
ناز بیگم کے اٹھاتے ہو غضب کرتے ہو

چھیڑ بیٹھے ہو پڑوسن کو تو بھگتو بچو
جان کیوں اپنی چھڑاتے ہو غضب کرتے ہو

سب کو چوزے کی طرح قید رکھا ہے جس نے
اس کو چوہے سے ڈراتے ہو غضب کرتے ہو

"پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"
ناک مودی پہ چڑھاتے ہو غضب کرتے ہو

دوستی غیر سے رکھتے ہو بتاتے بھی نہیں
بے وقوف ہم کو بناتے ہو غضب کرتے ہو

اتنے ممنون سے بیٹھے ہو سرِ محفل تم
بات سنتے نہ سناتے ہو غضب کرتے ہو

سونے سے بھر کے سیاست کی تجوری اپنی
لوہے پہ آنسو بہاتے ہو غضب کرتے ہو

ایک بھی رول پہ جب خود ہی نہیں چل سکتے
اتنے قانون بناتے ہو غضب کرتے ہو

ایک دو تین نہیں چار سے آگے بڑھ کر
پنج غزلہ بھی سناتے ہو غضب کرتے ہو

نیوز چینل پہ حسینوں کو بلا کر ہمدمؔ
میڈیا وار کراتے ہو غضب کرتے ہو

ہاشم علی خان ہمدمؔ

ہاتھ آئے نہ خواب کی چڑیا
اُڑ گئی کیا جناب کی چڑیا

میں چڑا ہوں غریب نوکر کا
اور وہ ہے نواب کی چڑیا

پھاڑ ڈالا کلام بلے نے
رو رہی ہے کتاب کی چڑیا

گھر سے نکلی ہے چھوڑ کر پردہ
ہوگئی ہے وہ جاب کی چڑیا

ایک ٹہنی پہ ٹھہرتی ہی نہیں
چشم خانہ خراب کی چڑیا

فیس بکیئے حسین سیلفی میں
ڈھونڈتے ہیں سراب کی چڑیا

سب رسیلا کلام سنتے ہیں
کون دیکھے نصاب کی چڑیا

حسرت دید ہے ندیدوں کو
کب کھلے گی نقاب کی چڑیا

رنگ نکھرا سفید بالوں کا
اڑ گئی ہے خضاب کی چڑیا

چہچہانے لگے چڑے ہمدمؔ
موج میں ہے شباب کی چڑیا

عرفان قادر

پہلے آنکھوں میں ہیں شہتیر چھپایا کرتے
پھر اُسی لکڑی سے مسواک بنایا کرتے

جسم گر اُس کا ذرا سا متوازن ہوتا
اُس کے چلنے سے یوں بھونچال نہ آیا کرتے

فرش سے نوٹ وہ چپکا ہوا ہو سکتا ہے
ہر گری چیز نہیں یونہی اٹھایا کرتے

عین ممکن ہے کہ مُکّے اُنھیں دو چار پڑیں
رہ میں لڑتے ہوؤں کو ہیں جو چھڑایا کرتے

ٹیکس ہر بار لگا دیتے ہیں پبلک پہ نیا
ہیں نئی طرز سے جیبوں کا صفایا کرتے

ٹوپی پہنے ہوئے ہر شخص کو مُلّا نہ سمجھ
اس بہانے سے ہیں کچھ گنج چھپایا کرتے

کوئی لیلیٰ سے کہے، رُخ سے اُٹھائے نہ نقاب
اس طرح سے نہیں مجنوں کو ڈرایا کرتے

کتنی اسراف سے نفرت وہ کیا کرتے ہیں!
عید کے عید ہیں جو لوگ نہایا کرتے

پیڑ اشعار میں ہی کام نہیں آتے فقط
راہگیروں کو بھی ہیں دھوپ میں سایا کرتے

عرفان قادر

چپکے ہوئے ہیں ایسے کرپشن کے ساتھ ساتھ
جیسے کہ بوگیاں کسی انجن کے ساتھ ساتھ

دانتوں کو وہ سنوار لے گا خود ہی دیکھ کر
تحفے میں دے دو آئینہ، منجن کے ساتھ ساتھ

جانا پڑے گا چھوڑ کے اِس میزبان کو
شلجم بھی لے کے آیا ہے بینگن کے ساتھ ساتھ

سر میں جوؤں کا ہونا تو ثابت نہیں ہوا
دیکھی مگر ہیں آٹھ نو گردن کے ساتھ ساتھ

پھیلی ہوئی جہان میں ہیں رشتے داریاں
سسرال چین میں بھی ہیں اُردن کے ساتھ ساتھ

بیگم کی مار سے دے خدا سب کو ہی پناہ
اُٹھتی ہیں لہریں درد کی سوجن کے ساتھ ساتھ

حضرت! مشاعرے میں کبھی تو بُلایئے
سُن لیں گے تھوڑے شعر بھی بھوجن کے ساتھ ساتھ

مجنوں کو ہم نے پارک میں دیکھا تھا شام کو
کرتا تھا واک ''لیلیٰ چھ من'' کے ساتھ ساتھ

ٹیکسی کے پیچھے بھاگ کے، کرتا بچت مزید
آیا ہوا جو دوڑتا ویگن کے ساتھ ساتھ

جب واسطہ پڑا تو یہ کل ہم نے کہہ دیا
درزی بھی جھوٹے ہوتے ہیں درزن کے ساتھ ساتھ

مسعود قاضی

دھڑک اُٹھے کسی پر دل لڑکپن میں تو واویلا
بڑھاپے میں اضافہ ہو جو دھڑکن میں تو واویلا

غبن وہ قوم و مِلّت کا کریں تو ان کو کرنے دو
اگر پکڑے اُنہیں کوئی کرپشن میں تو واویلا

گنیں گر خوبیاں بیگم کی ہم دن رات کافی تھیں
جو دیکھیں ایک بھی خوبی پڑوسن میں تو واویلا

وہ زلفیں جو کبھی شادی سے پہلے زلفِ عنبر تھیں
نظر آئیں جواب اک آدھ سالن میں تو واویلا

سہیلی ایک جو بیگم کو جان و دل سے پیاری ہے
بدل جائے سہیلی وہ جو سوتن میں توواویلا

رقم جائز، ناجائز گھر میں لے کر آیئے قاضی
کمی آئی اگر بیگم کے فیشن میں تو واویلا

احمد علی برقی اعظمی

ملتا نہیں گر اس سے چلا جائے مجھے کیا
ہے کام اگر مجھ سے تو پھر آئے مجھے کیا

میں جیت گیا فضلِ خدا سے یہ الیکشن
مرتا ہے اگر کوئی تو، مرجائے مجھے کیا

ہے فکر مجھے اپنی کرے فکر وہ اپنی
خوش فہمی سے دل اپنا وہ بہلائے مجھے کیا

اب تک جو ہوا خرچ کمانا ہے مجھے وہ
روئے کوئی یا گائے کہ چلائے مجھے کیا

میں کم نہیں دشنام طرازی میں ہوں اس سے
کہہ دو کہ وہ منہ میرا نہ کھلوائے مجھے کیا

میں قوم کا رہبر ہوں جو چاہوں وہ کروں گا
یہ طرزِ عمل اس کو نہ بھائے تو مجھے کیا

فرصت مجھے جب ہوگی تو میں اس سے ملوں گا
گر وقت نہیں اس کو چلا جائے مجھے کیا

حق میرے عزیزوں کا ہے پنشن پہ زیادہ
وہ جرم ضعیفی کی سزا پائے مجھے کیا

روبینہ شاہین بیناؔ

سیلفیوں میں بٹا ہوا بھیجا
ایک چہرہ بنا ٹھنا بھیجا

پہلے بھیجا میاں کو تھانے میں
اور پھر ناشتہ بنا بھیجا

پھول گوبھی کا وہ بھی شاپر میں
ہائے کھڑکی سے اس نے کیا بھیجا

ہر ولیمے کے بعد پپّو نے
سب کو کھانا بچا کھچا بھیجا

وہ بھٹکتا رہا سمندر میں
آن پیپر جو کوریا بھیجا

پہلوئے زوجہ میں جو دیکھا اُسے
اس کی ماں نے اسے بلا بھیجا

یوں فرائی کڑاہی میں کر کے
حسن برگر جلا بھنا بھیجا

واپڈائی ہوا تو اپنے گھر
روشنی کے لئے دیا بھیجا

بھیجنی تو ردیف تھی بیناؔ
ایک شاعر نے قافیہ بھیجا

روبینہ شاہین بیناؔ

سجا کے پشتو میں اُردو زبان بیٹھے ہیں
چلے بھی آؤ کہ محفل میں خان بیٹھے ہیں

وہی تو آ کے بگاڑیں گے میچ کا نقشہ
پویلین میں جو لالے کی جان بیٹھے ہیں

ہمیں گمان ہوا ہے صغیر ہونے کا
ہماری سیٹ کے پیچھے پٹھان بیٹھے ہیں

پڑی ہے مار وہ بیگم سے اف مرے اللہ
وہ آج غلطی سے اماں کی مان بیٹھے ہیں

بڑھا کے بال پہنتے ہیں کان میں بالی
عجب جوان ہیں بن کر زنان بیٹھے ہیں

چڑھائے رکھتے ہو چشموں کو اپنے سر پہ یونہی
سو یہ پکڑ کے ترے دونوں کان بیٹھے ہیں

وہ اک غزل کا بہانہ بنا کے پھر بیناؔ
سنانے کے لئے پورا دیوان بیٹھے ہیں

شاہین فصیح ربانی

چھرّے جا کر گرے کبوتر پر
فیر مارا تھا اس نے تیتر پر

پاؤں پھسلا تھا بس کی سیڑھی سے
اور چڑھ دوڑے وہ ڈرائیور پر

شام کو دے پلیٹِ بریانی
دن گزارا ہے ایک برگر پر

شیر نے تینوں حصے چھین لیے
گو ہوئی ڈیل تھی برابر کی

ہاتھ تسنیم بھی نہیں آئی
اس کی نظریں لگی تھیں کوثر پر

میٹرو بس، ٹرین اورنج است
کیجیے اب سفر نہ خچر پر

ایسے استاد ہیں کئی شعراء
دیویں اصلاح سادہ پیپر پر

بدلہ لیتے ہیں سنگدل سے فصیح
نام لکھتے ہیں اس کا پتھر پر

محمد قمر شہزاد آسی

کوچۂ یار میں جب بھی کبھی جاؤں ماموں
آئے ہر گھر سے ہی آواز یہ "ماموں" "ماموں"

کہہ رہا ہے تو کہے سارا ہی گاؤں ماموں
بس نہ معشوق کے بچوں سے کہاؤں ماموں

مجھ کو جی جان سے منظور ہے رشتہ لیکن
اُس بلیو چشم کو میں کیسے مناؤں ماموں

حُور کے روپ میں لنگور چھپے ہیں جو بھی
بینڈ "ایف۔بی" پہ نہ کیوں اُن کا بجاؤں ماموں

بعد برسوں کے گئی ہے میری بیگم میکے
آج دل کھول کے میں ناچتا جاؤں ماموں

خواب خوش کُن ہے نئے عقد کا لیکن پہلے
پہلی والی سے تو جاں اپنی چھڑاؤں ماموں

راہ میں روڑے جو اٹکاتا ہے ظالم سالا
اپنے بچوں کا قمر اُس کو بناؤں ماموں

احمد علوی

شعر پڑھنے کے لیے طوعاً و کرہاً آ گیا
آپ کی بزمِ سخن میں احتراماً آ گیا

ایک جھٹکے میں ہی پھر ساری اکڑ ہوجائے گی
دل سہیلی پہ جو بیگم اتفاقاً آ گیا

شیروانی کو چبایا تھا یہی بکری تھی وہ
اس لئے بریانی کھانے انتقاماً آ گیا

دیکھ کر خونخوار کتوں کو میں اُن کے گیٹ پر
چھوڑ کر ان کی گلی کو احتجاجاً آ گیا

فخر کی نے کاٹ کر کاتب نے مجھ کو خر کیا
فرق اپنی شخصیت میں اتفاقاً آ گیا

کانوینٹ میں ہم پڑھے انگریز کی اولاد ہیں
لفظ اُردو گفتگو میں اصطلاحاً آ گیا

عالموں کا فن ہے یہ دانشوروں کا کام ہے
شعر کہنے کا ہنر ہم کو مذاقاً آ گیا

کچھ اضافہ کیجئے شعراء کے دسترخوان میں
مطلع کرنے یہ علوی اطلاعاً آ گیا

عاجز سجاد

دو چار میرے ہاتھ سے گر پھڑکیاں نہیں
ایسی تمھارے شہر میں تو لڑکیاں نہیں

گھر چور منہ اُٹھا کے جو سیدھا ہی آ گیا
معلوم تھا اُسے بھی کہ گھر کھڑکیاں نہیں

صوفہ ہے چارپائی ہے بستر بھی ہے مگر
اِس گھر میں بیٹھنے کو فقط کرسیاں نہیں

جگتیں کرو جی مار کٹائی بھی تم کرو
پر گدگدی، شرارتیں اور مستیاں نہیں

یہ طنز اور مزاح بھی دیتا نہیں مزہ
گر پیٹ میں پڑی ہوئی کچھ روٹیاں نہیں

بچپن میں ہم شریر تھے، ہوتی تھیں مستیاں
دن رات کی لڑائی نہیں پھرتیاں نہیں

چھت سے اُسے وہ تاڑنا ہوتا تھا رات دِن
اِس عمر میں وہ سیٹیاں وہ تالیاں نہیں

کچھ تو عذاب سے ملی ہم کو نجات بھی
سالی فقط ہے ایک مری سالیاں نہیں

اقبال شانہ

محبت میں تمھاری میں اگر اندھا نہیں ہوتا
ہمارے درمیاں قائم کبھی رشتہ نہیں ہوتا

بتائیں کیا کوئی ذی ہوش کرتا آپ سے شادی
خدانخواستہ جو میں اگر پیدا نہیں ہوتا

حکیموں کو وہ لے آئے ہیں یارو میری میت پر
دوا دارو سے تو مردہ کبھی زندہ نہیں ہوتا

ہمیں نے پمفلٹ بانٹے ہیں رسوائی کے خود اپنے
وگرنہ عشق کا اپنے کبھی چرچا نہیں ہوتا

زبردستی مجھے لایا گیا ہے تیری محفل میں
میں سیدھی طرح تیری بزم میں آیا نہیں ہوتا

محبت میں یہ مانا ہم نے ہوتے ہیں کئی اندھے
مگر یہ عشق تو ہرگز کبھی اندھا نہیں ہوتا

ہمیشہ منہ چڑانے کی ملی تم کو سزا ورنہ
تمھارا خوبصورت منہ کبھی ٹیڑھا نہیں ہوتا

عجب منطق ہے اور پھر موج بھی سب سے جدا اپنی
اُدھر جاتے ہیں شانہ جس طرف رستہ نہیں ہوتا

اقبال شانہ

(انٹرنیشنل غزل)

نہیں ثانی مرا جغرافیہ میں
بلوچستان ہے کمبوڈیا میں

بہت جس کو تلاشا انڈیا میں
ملا وہ ہم کو انڈونیشیا میں

محبت ہو گئی رومانیہ میں
ہوا ہے عقد موریطانیہ میں

خدا کا شکر ہے بچے کی اُن کی
ولادت ہو گئی ہسپانیہ میں

شمالی کوریا میں جب میں پہنچا
وہ جا بیٹھا جنوبی کوریا میں

ہمارے بیچ خطِ استواء ہے
میں انگولا میں وہ منگولیا میں

وہ پاکستان مین رہتا ہے آدھا
اور آدھا رہ گیا برطانیہ میں

ہماری ذات گویا بٹ گئی ہے
عرب میں جسم ہے جاں انڈیا میں

تڑپتا ہوں میں کولمبو میں یارو
مرا محبوب ہے کولمبیا میں

تمھارے عاشقوں نے جانِ جاناں
بہت مارا مجھے بلغاریہ میں

وہ کرکٹ کے دِوانے ہو گئے ہیں
نظر آتے ہیں اکثر شارجہ میں

اجازت ہو تو مینڈک پیش کردوں
بہت کھائے ہیں میں نے چاینا میں

میں اک "حبشن" پہ شانہ مرمٹا ہوں
ملی تھی مجھ کو وہ تنزانیہ میں

نورؔ جمشید پوری

روٹیاں خود ہی پکاتے ہو غضب کرتے ہو
اور بیگم کو کھلاتے ہو غضب کرتے ہو

مل گئے جب سے سسر جی کو وزارت دیکھو
ناز بیگم کے اٹھاتے ہو غضب کرتے ہو

تم سیاست کے لئے خود ہی وطن میں اپنے
مفلسی اور بڑھاتے ہو غضب کرتے ہو

کیسے بیٹے ہو کہ بیگم کی خوشی کی خاطر
دل کو تم ماں کے دکھاتے ہو غضب کرتے ہو

چاندنی رات میں تم بیٹھ کے پہلو میں مرے
مجھ کو غزلیں ہی سناتے ہو غضب کرتے ہو

اپنے احباب کو تم شعر سنانے کے لئے
محفلیں گھر میں جماتے ہو غضب کرتے ہو

شب کی تنہائی میں تم سب سے بچا کر نظریں
چاند کا نور چراتے ہو غضب کرتے ہو

خادمؔ حسین مجاہد

پیار سے جب مجھے پکارتا ہے
دل پہ ڈاکہ سا گویا مارتا ہے

کھیل ہے یہ عجب محبت کا
جو بھی کھیلے ضرور ہارتا ہے

تیرے سینڈل میں ہے کوئی تریاق
بگڑے تیور کو یہ سنوارتا ہے

میرے جغرافیہ نے بتلایا
کیپٹل مصر کا جکارتہ ہے

کل یہ بے نقط کی سنائے گا
تیرے صدقے جو اب اُتارتا ہے

وقت ہے ایک بازیگر خادمؔ
کیسے حالات سے گزارتا ہے

سیّد فہیم الدین

جنابِ شیخ کا جو عقدِ ثانی کا ارادہ ہے
سبب یہ ہے کہ دل میں قوم کا غم کچھ زیادہ ہے

ہماری قوم کے سب "نر" وہیں کو دوڑ پڑتے ہیں
شبہ جس سمت ہو جائے یہاں پر صنفِ مادہ ہے

ہمیں اکیسویں میں بھی غلامی راس آئے گی
ہماری قوم کے پیشِ نظر منزل نہ جادہ ہے

بھلا اب کوئی کیا سمجھے خباثت بے بہا اپنی
کہ اِن کپڑوں کے اوپر اِک شرافت کا لبادہ ہے

بظاہر لال مرچیں لے کے آئے ہم فہیم اُن سے
کھلا یہ راز اس میں بھی تو لکڑی کا برادہ ہے

سیّد فہیم الدین

ڈراموں میں بھی اب ہونے لگی تشہیر مجنوں کی
کہاں پر کھینچ کر لے آئی ہے تقدیر مجنوں کی

تو کیا اب راگ لیلیٰ کو سنائے گا اکیلے میں
چرا لی ہے کسی ظالم نے جو تقریر مجنوں کی

جنابِ خر سے کچھ ملتی ہوئی صورت نظر آئی
کسی نے بھیج دی لیلیٰ کو جو تصویر مجنوں کی

لو ماموں کہہ رہے ہیں ہم کو اب لیلیٰ کے بھی بچے
یہ کیسے موڑ پر لے آئی ہے تاخیر مجنوں کی

لگی ہے تازہ فیشن کی ہوا اس کو فہیم ایسی
کہ لیلیٰ بھی نظر آئی ہے اب تو "ویر" مجنوں کی

نوید ظفر کیانی

سوال اُن سے جب کیا کمال کر کے رہ گئے
جواب میں ہمیں سے وہ سوال کر کے رہ گئے

وہ ریٹ تھے کہ ہوٹلنگ کا شوق ماند پڑ گیا
ہمارے جیسے تو فقط خلال کر کے رہ گئے

جو ناکے پر پولیس کے جوان تھے چٹان تھے
اِنہیں جو مرغ بھی ملا حلال کر کے رہ گئے

چلے گئے تھے گورنمنٹ ہسپتال بھول کر
غریب تھے چنانچہ انتقال کر کے رہ گئے

عبادتیں نہ کر سکے ہیں خانۂ خدا میں بھی
ہم اپنی جوتیوں کی دیکھ بھال کر کے رہ گئے

جنابِ قیس کو خراب ہونا ہی تھا عشق میں
وہ عقد کاہے کو پئے وصال کر کے رہ گئے

جو ڈاکٹر کو دستخط کے واسطے کہا گیا
جناب اپنے پاؤں استعمال کر کے رہ گئے

یوں لیڈرانِ قوم لوٹتے ہیں ملک و قوم کو
لٹیروں ڈاکوؤں کا استحصال کر کے رہ گئے

جو ہم کو ناچ تگنی کا نچاتے آئے ہیں ظفر
ہم اُن کی بزمِ ناز میں دھمال کر کے رہ گئے

نوید ظفر کیانی

گدھے کو شیر سمجھنے سے کون باز کرے
"جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے"

وہ میڈیا جو سدا سے بلیک میلر ہے
ستم تو یہ ہے وہی غلغلۂ "لاز" کرے

ہماری زوجہ کو میک اَپ کا شوق ہے بے حد
سو اُن کا کام وہی ہے جو رنگساز کرے

جو مسجدوں میں سدا جوتیاں چرانے گیا
کہاں پہ جا کے وہ دستِ دعا دراز کرے

یہ قوم حالیؔ و اقبالؔ سے بھی کیا پائے
کلام جس کا ملے نذرِ صوت و ساز کرے

عوام نام کی اے رینگتی ہوئی مخلوق
خدا تجھے کبھی عزت سے سرفراز کرے

میں چاپلوسی کے فن سے نا آشنا ٹھہرا
کروں وہ کس طرح جو حاجی گل نواز کرے

فدائی بخت میں ہو بوزنہ سدھایا ہوا
تو اپنے حُسن پہ کیونکر نہ کوئی ناز کرے

بہت سے ایسے بھی شاعر ہیں جن کا بیت وسخن
وہی کرے جو سدا کاٹنے پہ پیاز کرے

قسطوں قسط

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

تیسری قسط

واٹر پمپ مارکیٹ

چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں اور عظیم شخصیات کے تذکروں پر مبنی ایک عظیم تحریر

صحتِ عامہ

سے متعلق واٹر پمپ پر ستر کی دہائی سے یو کے اسکوائر کے ساتھ (جہاں اب لطیف اسکوائر) اور انار کلی مارکیٹ ہے، کے ای ایس سی کے ٹرانسفارمر کے ساتھ ایک ''عتیق کلینک'' ہوا کرتا تھا، اس طرح کچھ آگے جا کر چنوں کے بھاڑ کے ساتھ ''محسن کلینک'' ہوا کرتا (محسن کلینک اس سے پہلے ساٹھ کی دہائی میں جہاں اب ٹمبر مارکیٹ ہے وہاں چاول ڈپو کے ساتھ ہوتا، اس کے بعد بھاڑ کے برابر اور پھر چالیس سال پہلے اسی لائن میں آگے جا کر موجودہ مقام پر منتقل ہوا۔ اُدھر یو کے اسکوائر کے ساتھ ''یوسف پلازہ'' کے معروف فلیٹس ہیں، اُن کے عقب میں ''اشتیاق ہڈی جوڑ کلینک''، ''ڈاکٹر صغیر کلینک'' اور مین روڈ ''ٹپ ٹاپ سپر ہائی وے'' انچولی پر ''ہائی وے کلینک'' ہوا کرتا، اس لائن میں ''گولا والا'' اور ''خواجہ حسن نظامی اسکول'' (پرائیویٹ) اسکول تھے، اُن ہی پلاٹوں پر بہت بعد میں ''ماجی ہڈیوں کا اسپتال'' قائم ہوا جو آج موجودہ شکل ''ماجی اسپتال'' واٹر پمپ کے نام سے مشہور ہے اور تقریباً ۳۶۰۰ مربع گز کے رقبے پر واقع ہے۔ آج سے تیس چالیس برس پہلے یہ شفا خانے اپنی ابتدائی شکل میں تھے اور رہے نام اللہ کا، شفا من جانب اللہ ہی ہوا کرتی۔ ''ہائی وے کلینک'' (انچولی) بالمقابل یوسف پلازہ بڑا اسپتال تھا، بعد میں اس لائن میں آگئے ''فیڈرل کلینک''، ''زہرہ اسپتال'' اور اِکا دُکا اسپتال قائم ہوئے لیکن جو بات ''ہائی وے کلینک'' کی رہی وہ کسی اسپتال کی نہ تھی۔

واٹر پمپ مارکیٹ کے مشہور معالج

سب سے مقبول ترین جنرل فزیشن تو ڈاکٹر محمد محسن (خیر سے نوے کے ہو رہے ہیں، اُردو ادب کو کئی مزاحیہ کتب دے چکے ہیں، روزناموں اور جرائد کا بھی مقبول نام رہے ہیں، اب بھی کبھی کبھار اخبارات ڈاکٹر محمد محسن کی کتابوں سے مضامین شائع کرتے رہتے ہیں ہفت روزوں میں ڈاکٹر صاحب طبّی مسائل کا جواب بھی دیا کرتے)۔ اس کے بعد ڈاکٹر عتیق (سرکاری معالج تھے، کبھی کلینک کیا کرتے اور کبھی نہیں)۔ ڈاکٹر سعود (معروف معالج، واٹر پمپ مارکیٹ کے اُس عقبی حصے میں کلینک کرتے جو اب امام بارگاہ دستگیر ٹی گراؤنڈ کے سامنے کا علاقہ ہے۔ ڈاکٹر صغیر (یوسف پلازہ کے نیچے دکانوں میں کلینک تھی)، ڈاکٹر عارف (ڈاکٹر محسن کے

ساتھ پریکٹس کرتے)، ڈاکٹر فرحت اللہ خان (ڈاکٹر محسن صاحب
کے ساتھ ہی پریکٹس کی)، ہومیو ڈاکٹر شہناز محسن (ڈاکٹر محمد محسن کی
اہلیہ)، ڈاکٹر عبدالسلام (ہومیو ڈاکٹر جو ڈاکٹر محسن کے ساتھ ہی اُن
کی کلینک کے ایک کمرے میں پریکٹس کرتے)۔ مزے کی بات یہ
کہ ڈاکٹر محسن نے اپنے شفا خانے کے پلاٹ پر تین منزلہ شفا خانہ
قائم کر کے ہر کمرہ کسی نہ کسی ایسے معالج کو بغیر کسی کرائے یا پیشگی
رقم کے دیا تھا جو اپنے ابتدائی عملی دور سے گزر رہا تھا، ان معالجوں
میں آج کے بڑے بڑے نام ہیں، اگر میں ایک دو نام بتا بھی دوں
تو کئی ایک تو ناراض ہو جائیں گے کہ جو آج سرکاری میڈیکل
جامعات کے رجسٹرار بھی ہیں، انھوں نے بھی اپنا ابتدائی سفر
"محسن کلینک" سے شروع کیا تھا۔ ایک تو ڈاکٹر مشہود صاحب
(آئی اسپیشلسٹ)، ڈاکٹر فرحت اللہ خان (امریکا)، ڈاکٹر
عارف (کناڈا)، ڈاکٹر شمع (سول)، ڈاکٹر تصور حسین (میمن
اسپتال)، پروفیسر ڈاکٹر فاروق ماجی، ڈاکٹر فاروق احمد، ڈاکٹر
طارق، ڈاکٹر عزیز (کناڈا ڈینٹل سرجن)، ڈاکٹر اویس (ماہر قلب
، امریکا) و بے شمار نام جنھوں نے پچاس برسوں میں محسن کلینک
سے استفادہ کیا اور اب ماشا اللہ "سیٹل" ہیں، اسی طرح "محسن
کلینک" ادیبوں، شاعروں اور دیگر پڑھی لکھی شخصیات کا گڑھ بھی
رہا، اکثر اُس کی چھت پر شامیانہ لگا کر، قناتیں گاڑ، کئی ادبی
پروگرام منعقد کیے جاتے۔ روزنامہ "امت" نیا نیا نکلا تھا، اُس کے
مدیر جناب معین کمالی اور وجیہہ صدیقی بھی آ جاتے، ساتھ "بی ایڈ
کالج" بلاک ۱۶ سے پروفیسر غفران و دیگر ماہرینِ تعلیم بھی تشریف
لاتے، معراج الدین عباسی (پی ٹی وی کے انجینئر، بعد میں
پروڈیوسر ہوئے)، قاسم جلالی، ماہنامہ سیپ کے "نسیم درانی"، سہ
ماہی روشنائی کے "احمد زین العابدین"، کئی پروفیسرز، اسکالرز،
سب کے نام میرے ذہن میں بھی نہیں آ رہے ہیں، وہ سب محسن
کلینک میں آتے اور ڈاکٹر صاحب کے دوستوں میں شامل ہو
جاتے، صبا اکرام (انڈیا سے رسالہ شب خون اُنھیں کے توسط سے
ہم لوگوں تک پہنچتا)، مسلم شمیم صاحب، جان ایلیا، اور بہت
سارے بڑے بڑے نام، گلنار آفریں، شبیہ الحسن شبیہ، تنویر پھول،

غلام گردش

ایک بار مرزا غالبؔ نواب فتح الملک بہادر سے ملنے ان کے
یہاں گئے تو خدمت گاروں نے صاحب عالم کو اطلاع دی
"مرزا نوشہ صاحب آ رہے ہیں۔"
وہ کسی کام میں مشغول تھے اس لیے فوراً باہر نہ جا سکے۔ جبکہ مرزا
صاحب کچھ دیر وہیں ٹہلتے رہے۔ اتنے میں صاحب عالم نے
پکار کر ملازم سے پوچھا "ارے مرزا صاحب کہاں ہیں؟"
ان کی آواز جب غلام گردش میں ٹہلتے ہوئے مرزا صاحب کے
کان میں آئی تو انہوں نے وہیں سے جواب دیا "غلام گردش
میں ہے!"

ابنِ آس، مظہر یوسف زئی علیگ و دیگر۔ مجیب ظفر انوار حمیدی
(ہاہاہا، کہہ سکتے ہیں آپ مشہور ناموں کے حوالوں سے)، محمود شام
صاحب۔ "تکبیر" کے مولانا صلاح الدین اور بڑے بڑے
اسکالرز، شفیع عقیل صاحب، یہ سب "محسن کلینک" میں تشریف
لاتے رہے، علاج کے لئے بھی اور ڈاکٹر محسن کی دوستی کی وجہ سے
بھی۔ ڈاکٹر محسن صاحب کی شخصیت پر تو شکور پٹھان صاحب ہی
کچھ لکھیں گے، میں نے تو صرف رسیدی دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی
کلینک پر میں ۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ بحیثیت مریض گیا اور پھر ڈاکٹر
صاحب میری اُردو کہانیوں کا بھی علاج کرتے رہے، اُس زمانے
میں تعلیم و تربیت، نونہال، پھول پرچوں کا عروج تھا، اخبار جہاں
کے بچوں کا صفحہ، حریت کا شمع زیدی صاحبہ کا "بچوں کا حریت"
وغیرہ، سب پر ڈاکٹر محمد محسن صاحب مجھ سے لکھواتے رہے اور
کہانیوں کی نوک پلک سنوارتے رہتے۔ طریقہ یوں ہوتا کہ کلینک
پر مریضوں کا دس بجے صبح سے شام پانچ چھ بجے تک تانتا بندھا رہتا
، ڈاکٹر صاحب دو گھنٹوں بعد تازہ دم ہو کر نماز و کچھ کھانے سے
فراغت پا کر شام سات یا رات آٹھ سے دو بجے تک پھر کلینک
کرتے۔ اس دوران میں اُن کی کرسی کے سامنے بیٹھا مختلف ملکی اور
غیر ملکی بچوں کی کتابیں، بڑوں کی کتابیں اور رسائل دیکھتا رہتا، لکھتا

رہتا اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ لیتا رہتا، اُس وقت کہاں تھے یہ موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ؟ سب کچھ کاغذات پر لکھا پڑتا اور واٹر پمپ کی فرید اسکوائر پر واقع اکلوتی فوٹو اسٹیٹ کی دُکان "فرید فوٹو اسٹیٹ" کی باوا آدم کے زمانے کی فوٹو مشینوں پر دس پیسے، بیس پیسے یا تیس پیسے میں فوٹو کاپی نکلوانا پڑتی، پاؤڈر فوٹو کاپی کی لذت سے بھی لکھنے والے بعد میں آشنا ہوئے ورنہ پہلے غریب طالب علم اور اہلِ قلم کاربن پیپر پر مسودہ کی نقل رکھ لیا کرتے۔ "نوٹس" کو فوٹو کاپیوں کا بخار وبائی صورت اختیار نہیں کیا تھا، جامعات تک کے طالب علم قلمی نوٹس کتابوں کی مدد سے تیار کرتے۔ ڈاکٹر محسن طالب علموں کی تعلیم میں بھی خوب دلچسپی لیا کرتے، ڈاکٹر عارف، ڈاکٹر فرحت، ابن آس، ڈاکٹر سلام، پروفیسر مجیب ظفر انوار، ڈاکٹر شمع، ڈاکٹر تصور حسین، ڈکٹر فاروق ماجی، ودیگر، ان "پڑھے لکھے لوگوں" کو کتابیں ڈاکٹر صاحب ہی فراہم کیا کرتے۔

زمانہ بدلا تو گویا سب کچھ بدل گیا، "محسن کلینک" آج بھی واٹر پمپ میں ہے، آج کل ڈاکٹر محسن خاصے ضعیف ہو چکے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی "تشخیص" میں بھی غضب کا نکھار آتا جا رہا ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب سے ضد کر کے اُنھیں "بزمِ سائنسی ادب" (زیرِ انتظام: پروفیسر عظمت علی خان) ساتھ جانے پر مجبور کیا، جس ادبی پروگرام میں جاتا، ڈاکٹر محسن صاحب سے اس لئے ساتھ چلنے کی ضد کرتا کہ اُن کی آرام دہ کار میں سفر ہوتا اور ڈاکٹر صاحب کو لوگ دیکھ بھی لیا کرتے کہ: "اچھا یہ ہیں ڈاکٹر محمد محسن!" ڈاکٹر صاحب تقریبات سے دور رہنے والے افراد میں سے تھے، مضامین کے ساتھ اپنی تصاویر بھی شائع نہ کرواتے۔ خیال کرتے کہ ہمارا فرنٹ، سائڈ، ترچھے رُک سے لیا گیا پوز اچھا نہیں آتا، باقی سارے اچھے آتے ہیں، ہاہاہاہا، ہاہاہاہا۔۔۔"فرید پبلشرز" کے کتب میلے تو بہت بعد میں لگنا شروع ہوئے ماہِ رمضان میں (اُن کا اپنا مزا تھا)۔ بے شمار یادیں ہیں سال دو سال مضمون کیا کتاب بن جائے "واٹر پمپ کے اُس خاص ماحول سے متعلق"۔

محسن کلینک کے پلیٹ فارم پر کئی کمپاؤنڈر لڑکوں نے بھی طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر ہونے کا اعزاز حاصل کیا، اُن میں ڈاکٹر نظام اور ڈاکٹر شعیب بھی شامل ہیں، ڈاکٹر متین نے ہومیو پیتھک پڑھی، خود میں نے "انصاری ہومیو کالج" سے ڈی ایچ ایم ایس ۱۹۹۱ء میں کیا، پریکٹس "محسن کلینک" میں کی لیکن اپنا کلینک کبھی نہ کیا، مجھے انسانی جانوں سے دن دیہاڑے اپنے علم کے ذریعہ کھیلتے ڈر لگتا ہے، تاہم کچھ کم خطرناک و جان لیوا پیشہ اختیار کیا یعنی اسکول و کالج میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔

واٹر پمپ مارکیٹ کے مشہور میڈیکل اسٹور

کئی میڈیکل اسٹور تھے، یوسف پلازہ کے نیچے "بھائی بھائی میڈیکل اور جنرل اسٹور" (اب بند ہو گیا)، یو کے اسکوائر واٹر پمپ کے عقب میں "ہلال میڈیکل اسٹور"، یو کے اسکوائر کے فلیٹوں کے نیچے ہی "ہلال میڈیکوز" محسن کلینک کے سامنے "سلام میڈیکل اسٹور"، ساتھ ساتھ واٹر پمپ کی مشہور "ادویہ ہول سیل مارکیٹ" میں "پرنس فارما"، "بابر میڈیکل" وغیرہ۔ ماجی اور ہائی وے اسپتالوں کے میڈیکل اسٹور "ماجی میڈیکوز" اور "ہائی وے میڈیکل سنٹر" چوبیس گھنٹے کھلا کرتے، اب اگلی قسط میں آپ کو واٹر پمپ مارکیٹ کے اسکولوں کے بارے میں بتائیں گے۔ فی الحال اجازت، دن بھر تو وقت ملتا نہیں۔ محترمہ حمیرا اطہر سے لکھنے کا وعدہ کر کے پھنس چکا ہوں ہاہاہا۔۔۔۔اب رات چار بجے اُٹھ جاتا ہوں، کمپوزنگ کرتا ہوں، اس بہانے "تہجد" کا اعزاز بھی اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور فجر پڑھ کر کچھ چہل قدمی کرتا ہوں، ناشتہ کھاتا کر کے کالج کی راہ لی، شام کو واپسی ہوئی، انتہائی تھک جاتا ہوں، عشاء پڑھ اور کھانا کھا سو رہتا ہوں، وقت یہی ملتا ہے۔ آج کل بلدیاتی صوبائی الیکشنوں کا بھی موسم ہے، اُس کی سرکاری ذمہ داریوں میں بھی دن گزر جاتا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ فیڈرل بی ایریا کا وہ وسیع علاقہ جو "واٹر پمپ" کہلاتا ہے، وہاں مَیں نے اپنی زندگی کے چالیس سے زائد سال گزارے اور تقریباً بیس برسوں سے ایک ویرانے میں پڑا ہوں جسے لوگ "گلبرگ" کہا کرتے ہیں۔

محمد خلیل الرحمٰن

جیون میں اک بار آنا سنگاپور

ہم سنگاپور کیا گئے، ہماری دیکھا دیکھی رجب علی بیگ سرور صاحب بھی ہمارے پیچھے سنگاپور ہو لیے اور اس کا سارا حال اپنی کتاب فسانۂ عجائب میں لکھنؤ اور سرزمینِ ختن کے خیالی شہر، فسحت آباد کے نام سے لکھ مارا۔ لکھتے ہیں:۔

"عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر باوضع قطع دار ہے۔ دورویہ بازار کس انداز کا ہے۔ ہر دکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر چند ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان مہیا ہے پر (ڈائی نے سٹی ہوٹل) سے (ویسما ایٹریا، لکی پلازہ) اور (سنگاپورہ پلازہ) تک، کہ صراطِ مستقیم ہے، (اور آرچرڈ روڈ) کہلاتی ہے کیا جلسہ ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:۔

"باشندے یہاں کے ذکی، فہیم، عقل کی تیز اگر دیدہ انصاف اور نظرِ غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہان کے دید کی حسرت نہ رہے۔ آنکھ بند کرے (شعر، سرور صاحب سے معذرت کے ساتھ)

سنا! رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ (سنگا پور ہی) کی سر زمیں ہے

آگے ذرا برسات کا حال سنیے:۔

"برسات کا اگر موسم ہے، شہر کا یہ عالم ہے، ادھر مینہ برسا، پانی جا بجا بہہ گیا، گلی کوچہ صاف رہ گیا، ساون بھادوں میں زرروزی جوتا پہن کر پھرے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ فصل بہار کی صنعت، پروردگار کی قدرت، رضوان جن کا شائق، دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشے کا میلہ، ہر وقت چمن کا جلسہ"

(فسانۂ عجائب از رجب علی بیگ سرور)

بھائی! ہم تو باز آئے اپنی منظر کشی سے، آئیندہ جب کبھی سنگاپوری جلوہ حُسن کے متعلق لکھنا ہو تو کہہ دیں گے، دیکھئے فسانہ عجائب، صفحہ فلاں۔

مزید برآں کچھ، اسی قسم کا ظلم ہمارے ساتھ جناب قمر علی عباسی صاحب نے بھی روا رکھا۔ انھوں نے تو ہماری دیکھا دیکھی سنگاپور کا سفرنامہ تک لکھ ڈالا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اِن دونوں شخصیات کو علم ہو چکا تھا کہ ہم سنگاپور کا ایک عجائب روزگار سفرنامہ لکھنے والے ہیں۔

ہائے سنگاپور، وائے سنگاپور
بھاڑ میں جائے سنگاپور

سنگاپور جو سرزمینِ ماورائے الہند یعنی شرق الہند میں ملائشیاء کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے، ۱ڈگری ۲۰ منٹ شمال طول البلد اور

۱۰۳ ڈگری ۵۰ منٹ عرض البلد مشرق میں واقع ہے اور خط استوا سے کوئی ۱۳۷ کلومیٹر کے فاصلے پر آبنائے ملاکا کے دہانے پر ہونے کی وجہ سے مشرق و مغرب کے درمیان ایک اہم بندرگاہ ہے۔ اس کا نام سنگاپور کیسے پڑا، اس کے بارے میں بھی ایک لوک داستان بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس علاقے کے ایک شہزادے کا دل ایک جل پری پر آ گیا اور اس نے اس جل پری سے شادی رچالی اور ہنسی خوشی رہنے لگا۔ اس کے تین بیٹے ہوئے جو جوانمردی اور بہادری میں اپنی مثال آپ تھے۔ منجھلے بیٹے نیلا اُتم نے ایک دن سمندر پار ایک جزیرے کو دیکھا تو اس کی جستجو میں ایک بحری جہاز لے کر نکلا۔ سمندر میں طوفان آ گیا اور اس کا جہاز ڈوبنے لگا۔ شہزادے نے بڑی مشکل سے جان بچائی اور کنارے پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے ایک عجیب جانور دیکھا جو در حقیقت ایک شیر تھا۔ اس نئے جزیرے کو اپنی مملکت میں شامل کیا اور اس پہلے نظارے کی یاد میں اس جزیرے کا نام سنگاپورا یعنی شیر کا شہر رکھ دیا۔ اہلِ سنگاپور آج بھی اس شہزادے کو نہیں بھولے اور اس کی یاد میں مرلائن کو سنگاپور کا قومی نشان قرار دیا جس کا سر شیر کا اور دھڑ اس جل پری کے بیٹے کی یاد میں مچھلی کا ہے۔

یہی کچھ وہ اسمال ٹاک یعنی گپ شپ تھی جسے روا رکھتے ہوئے ہم نے اس شام بری بجرے پر قدم رنجا فرمایا اور چار گھنٹے کے اس حسین و رنگین سفر میں جاری رکھا جس کی منزل واپس سنگاپور ہاربر تھی۔ چار گھنٹے کا یہ کروز جس میں ایک عدد شاندار قسم کا ڈنر یعنی طعامِ شبینہ بھی شامل تھا، ہماری کمپنی کی جانب سے ہم مہمانانِ گرامی قدر کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ ہم گنتی کے جو چند مسلمان اس میں شامل تھے، ہمارے لیے علیحدہ حلال کھانے کا انتظام تھا۔ بحری بجرہ بین الاقوامی مہمانوں یعنی سیاحوں سے بھرا ہوا تھا، لہٰذا ہم سمندر اور اس کے قدرتی جزیروں کے خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ، ابنِ صفی کے قول کے مطابق انسانی جزیروں کی سیر سے بھی بدرجہ اتم لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''اور کیا جناب!۔۔۔اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر میں کیا رکھا ہے۔ خواہ وہ پہلی صدی عیسوی ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔ یہ جھیل اور اس کے ساحل بھی لاکھوں سال پرانے ہیں۔ میں تو آپ کو وہ نایاب جزیرے دکھاؤں گا، جو آج ہیں کل نہ ہوں گے یا اگر ہوں گے بھی تو اس قابل نہ رہ جائیں گے کہ ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا کیا جا سکے!'' (پوائنٹ نمبر بارہ۔ عمران سیریز۔ از ابنِ صفی)۔ ۱۸۱۹ء میں سر اسٹیمفورڈ ریفلز یہاں پہنچے تو اس وقت جزیرے کی آبادی صرف چند نفوس پر مشتمل تھی۔ سر اسٹیمفورڈ ریفلز کے جزیرے پر قدم رکھتے ہی یہ شہر سلطان آف جوہر بھارو کی عملداری میں ہونے کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی منڈی کے طور پر جانا گیا۔ چاروں طرف سے لوگ اس کی جانب امڈ پڑے اور آج (۱۹۸۵ء) میں اس کی آبادی پچیس لاکھ ہے۔

ہم نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ٹوور گائیڈ ہمیں اپنے پبلک ایڈریس سسٹم پر ارد گرد پھیلے ہوئے جزیروں کا جغرافیہ اور سنگاپور کی تاریخ سے آگاہی دلوا رہا تھا۔ تاریخ، جغرافیہ اور معاشرتی علوم میں ہم ویسے ہی کچھ اور کورے رہے ہیں اس لیے ہم نے اس کی ان خرافات کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ ان جزیروں کا حال ہم گائڈ کتابوں میں پڑھ ہی لیں گے۔ یہ وقت تو ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا تھا جو اس سے ہمارے چاروں اور پھیلے ہوئے تھے۔ سبحان تیری قدرت۔ ہم نے اپنی یادوں کی پٹاری کھولی تو اس میں اس شام کی یاد ان الفاظ کے ساتھ محفوظ تھی۔ ''سنگاپور کی ایک شام جو بہتر انداز میں بسر ہوئی۔''

اگلے دن ہمارے سب ہم جماعتوں نے استاد صاحب کے ساتھ مل کر تفریح کرنے کا پروگرام بنایا اور کلاس ختم ہوتے ہی دو ٹیکسیاں پکڑ کر سیدھے آرچرڈ روڈ پہنچ گئے۔ آرچرڈ روڈ سنگاپور کا سب سے بڑا خریداری کا علاقہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ صاحب کی لکھی ہوئی تعریف ہم پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ سمجھ لیجے کہ یہ بازار سنگاپور کا طارق روڈ یا لبرٹی ہے۔ اہلیان کراچی اور لاہور سمجھ گئے ہوں گے، دوسرے علاقوں کے مکین اپنے علاقائی ماحول کے مطابق کچھ اور تصور کر لیں۔ چونکہ اس پہلے دن ہم نے ڈائی نے سٹی ہوٹل کے قریب ٹیکسی سے اتر کر پیدل آوارہ گردی کا آغاز کیا تھا،

لہٰذا اس کے بعد ہمارے لیے آرچرڈ روڈ اسی نکتے سے شروع ہوتی تھی۔ پیدل ٹہلتے ہوئے چلے تو راستے میں آنے والے کئی شاپنگ سنٹر دیکھ ڈالے۔ ان دنوں لکی پلازا کا بڑا چرچا تھا، لہٰذا وہاں پہنچے اور زیادہ توجہ کے ساتھ دکانوں کا معائنہ شروع کیا۔ اِکٹھے آٹھ لوگ کسی بھی دکان میں گھستے تو دکاندار سٹپٹا جاتے۔ اِن کی سمجھ میں نہ آتا کہ کس کی طرف توجہ کریں اور کس کی نگرانی کریں۔ ایک دکاندار تو اس قدر گھبرایا کہ ہر ایک کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ جب کافی دیر تک اِدھر اُدھر اشیاء کا بغور معاینہ کرنے کے باوجود بھی ہم میں سے کسی نے کسی شے کو خریدنے کا عندیہ نہ دیا تو وہ کچھ مشتعل سا نظر آنے لگا۔ ہم چونکہ اپنی کالی رنگت کی بناء پر ویسے ہی سب کی توجہ کا مرکز تھے، اس کے غصے کا محور بھی بن گئے اور اس نے ہمیں دیکھ کر ایک نعرہ مستانہ بلند کیا ''ہے یو؟'' یعنی ''ارے تم! کیا چاہیئے تمھیں؟'' ہم غریب شہر کیا کہتے، تک اسے دیکھا کیے، لیکن گورے استاد نے دکاندار کو تسلی دی کہ ہم سب اکٹھے ہیں اور سب ہی غیر ملکی ہیں۔ اس بات پر اسے کچھ تسلی ہوئی لیکن پھر جب یہ دیکھا کہ سب ہی بناء خریداری کیے دکان سے باہر جارہے ہیں تو اس کا موڈ پھر بگڑ گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب ہم نے کسی سنگاپوری شہری کو اس طرح خراب موڈ میں دیکھا، ورنہ ہمیشہ سب ہی ہمیں خوش اخلاقی سے ملے۔

جس زمانے کا یہ قصہ ہے اس دور میں سنگاپور میں بھاؤ تاؤ کرنے کا بہت زیادہ رواج تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، اگر آپ دکاندار کی بتائی ہوئی قیمت پر بھروسا کر کے خریداری کر لیتے، تو گویا آپ لٹ چکے ہوتے۔ فارمولا یہ بتایا گیا کہ دکاندار جتنی قیمت بتائے، آپ اس کی آدھی قیمت سے بحث کا آغاز کریں۔ پھر جہاں پر بات بن جائے، وہیں بات ختم کر کے پیسے ادا کر دیں۔ بھاؤ تاؤ کا طریقہ بھی مخصوص تھا۔ دکاندار جس قیمت پر آپ سے بھاؤ تاؤ شروع کرنا چاہتا، وہی قیمت کیلکولیٹر پر لکھ کر آپ کے سامنے کر دیتا۔ آپ اپنی من پسند قیمت اسی کیلکولیٹر پر لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیتے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ جو قیمت آپ کے نزدیک مناسب ہوتی اس پر پہنچ کر آپ اپنے

بٹوے سے پیسے نکالتے جنھیں دیکھتے ہی دکاندار رام ہو جاتا اور آپ سے پیسے پکڑ کر خریدی ہوئی شے آپ کے حوالے کر دیتا۔ آرچرڈ روڈ اور خاص طور پر لکی پلازا اس قسم کی خریداری کے لیے مشہور تھے۔ سرنون روڈ پر مصطفےٰ سنٹر میں البتہ ہر شے پر قیمت لکھی ہوئی تھی اور دھوکے کے امکانات کم تھے۔ لہٰذا ہم نے اصولی طور پر، طے کر رکھا تھا کہ اپنی تمام خریداری مصطفےٰ سنٹر ہی سے کی جائے گی علاوہ معدودے چند اشیاء کے، جن میں کمپیوٹر سرِ فہرست تھا۔ (ایک ہفتے بعد فونان سنٹر سے ہمارا خریدا ہوا کمپیوٹر ہمارے حوالے

کر دیا گیا تھا اور ہم اسے اپنے ہوٹل کے کمرے میں تختہ مشق بنائے ہوئے تھے)۔ واپسی پر سڑک پار کر کے دوسری جانب ہوگئے اور ویسما ایٹریا سمیت اس طرف کے تمام خریداری مرکز دیکھ ڈالے اور ہوٹل واپسی کا پروگرام بنایا۔

اگلی مرتبہ جب ہم اور چودھری صاحب اکیلے دکیلے ہی آرچرڈ روڈ پہنچے تو اس مرتبہ ہم نے ڈائی نے سٹی ہوٹل سے دوسری جانب اسکاٹس روڈ پر چلنا شروع کیا اور تیسری بلڈنگ ''اسکاٹ سنٹر کے تہہ خانے میں بنے ہوئے ایک صاف ستھرے فوڈ سنٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور مزے لے لے کر پیلی کھچڑی کے ساتھ حلال سالن تناول کیا اور اس کا لطف اٹھایا۔ اس سے آگے چلے تو فار ایسٹ پلازا نے ہمارا راستہ روکا اور ہمیں چہل قدمی کی دعوت دی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ایم آر ٹی ابھی نہیں بنی تھی۔ بعد میں جب ہم ۲۰۱۰ء میں سنگاپور پہنچے تو آرچرڈ روڈ کے اسٹیشن پر اتر کر ان سب جگہوں کو تلاش کرتے رہے جہاں کبھی ہم نے وقت گزارا تھا۔ اسکاٹ سنٹر کی یہ عمارت غائب تھی اور ساتھ ہی یہ فوڈ سنٹر بھی۔ لکی پلازا اتنا دلکش نہ لگا، جتنا کبھی لگا تھا، کیوں کہ راستے میں دونوں اطراف کئی ایک خوبصورت شاپنگ سنٹرز بن چکے تھے۔ خاص طور پر سنگاپورا پلازا جو آرچرڈ روڈ کی تقریباً دوسری جانب ’دھوبی گھاٹ‘ نامی ایم آر ٹی جنکشن کے اوپر بنایا گیا ہے بہت خوبصورت اور با رونق ہے۔

۲۰۱۰ء میں ہم چوتھی مرتبہ سنگاپور پہنچے تو پچھلی دفعہ سے زیادہ سنگین واردات ہمارے ساتھ ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ خان صاحب ہمارے ہمسفر تھے۔ اس مرتبہ ہم کسی بھی تفریحی مقام کی سیر کو نہ نکل سکے، اس لیے کہ خان صاحب کو تربیتی مرکز سے ہوٹل واپسی کے بعد کہیں اور جانے کے لیے آمادہ کرنا کارِ دارد تھا۔ ہم لاکھ انھیں مناتے کہ بھائی کہیں تو نکل چلو، لیکن وہ اپنے کمرے میں، لیپ ٹاپ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے، اپنی محبوبہ سے چیٹ یعنی ہوائی پینگیں بڑھایا کرتے۔ ہم چونکہ اس بار چائنا ٹاؤن کے ایک ہوٹل فوراما سٹی سنٹر میں ٹھرے تھے، لہٰذا ہر روز رات کا کھانا کھانے کے لیے انھیں سرنگون روڈ کھینچ کر لے جاتے۔ کھانا ختم کرتے ہی، وہ ہمیں ٹرین اسٹیشن کی جانب اور ہم انھیں شاپنگ سنٹر کی جانب کھینچتے۔ زیادہ تر جیت ان کی ہی ہوتی کیونکہ وہ ہم سے درخوست بھی کر رہے ہوتے تھے کہ وہ اپنی محبوبہ دلنواز کو انتظار کرتا چھوڑ آئے ہیں اور واپس پہنچ کر اس کے غصے کو برداشت کرنے اور اسے منانے کا خوشگوار کام بھی انھی کو سرانجام دینا ہے۔

پاکستان واپس آ کر ہم نے ہمجولیوں میں ان کی شکایت کی کہ خان صاحب کا تو سنگاپور میں ایک ہی مشن تھا۔ اپنی محبوبہ دلنواز سے باتیں۔ ساتھی کہنے لگے ''بھئی! ہم نے تو انھیں ایک بالکل ہی مختلف مشن پر بھیجا تھا۔ خدا جانے وہ اس مقصد و مدعا میں کامیاب ہو پائے یا نہیں۔''

ہم نے حیران ہو کر پوچھا ''وہ کیا مشن تھا؟''

جواب ملا ''ان کا مشن اپنے ''ٹی اے۔ ڈی اے'' کے پیسے مکمل طور پر بچا کر، کھانے کے لیے آپ کے ''ٹی اے۔ ڈی اے'' پر انحصار کلی تھا۔''

ہم حیران رہ گئے۔ ہم ہنس دیے۔ ہم چپ رہے۔ کچھ اس کا سبب چپ تھا، کچھ اس کا سبب باتیں۔

خیر صاحب وہ لے بخیر گزشت۔ جن جگہوں کو ہم پچھلی مرتبہ دیکھ نہ پائے تھے، وہ ان دیکھی ہی رہ گئیں اور جن مقامات کو ایک مرتبہ دیکھ چکے تھے، انھیں دوسری بار دیکھنے کی ہوس رہ گئی۔ ان چند جگہوں میں خاص طور پر سینتوسا آئی لینڈ بھی شامل ہے۔

اگلے اتوار ہم اور چودھری صاحب جلد ہی اٹھ کر تیار ہوگئے اور مفت ناشتے کے فوائد حاصل کرتے ہوئے ٹیکسی پکڑ کر کوہ فیبر پہنچ گئے۔ وہاں سے ان دنوں سینتوسا آئی لینڈ کے لیے کیبل کار روانہ ہوتی تھی۔ ہم نے فوراً ٹکٹ کٹایا اور کیبل کار میں بیٹھ کر فضائی نظارے کے مزے لیتے ہوئے سینتوسا جزیرے پر اتر گئے۔ آج کل مرینہ مال سے اس جزیرے کے لیے چھوٹی ٹرین چلتی ہے جو سمندر پر بنے ہوئے ایک پل سے گزرتی ہے۔ سینتوسا سنگاپور میں جزیرے کے جنوب میں واقع ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جسے سیاحوں اور سیر کے رسیا افراد کے لیے ایک مکمل تفریحی مقام میں تبدیل

کردیا گیا ہے۔اس اعتبار سے یہ گویا موجودہ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے, ۲۰۱۰ء میں اس جزیرے میں دو دلچسپیوں کا اور اضافہ کیا گیا جن میں سے ایک یونیورسل اسٹوڈیو کا ڈسپلے اور فن سنٹر اور دوسرا ایک عدد کسینو ہے۔کسینو کی یہ خوبی بیان کی جاتی ہے کہ یہاں پر سیاحوں کے لیے داخلہ بالکل مفت اور مقامی شہریوں کے لیے سوڈالر داخلہ فیس کے ساتھ ہے۔اگر یہ کسینو اس زمانے میں بھی موجود ہوتا تو ہمارے چودھری صاحب لازمی اس کی سیر کرتے اور ہمیں؛ مجبوراً ان کا ساتھ دینا ہی پڑتا۔سب سے پہلے ہم نے یہاں پر بنایا ہوا میوزیم دیکھا اور اس کے مظاہر میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی۔

آئی لینڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مفت مونو ریل چلتی ہے۔لہٰذا ہم دونوں اس سہولت کا خوب فائدہ اٹھاتے رہے اور اس ریل میں بیٹھ کر بار بار مفت سیر کا لطف اٹھایا۔ایک جگہ سمندر کے کنارے پیڈل بوٹ نظر آئی تو چودھری صاحب مچل گئے۔ہم نے مونو ریل کے قریبی اسٹیشن پر اتر کر وہاں سے دوڑ لگائی اور ایک ایک پیڈل بوٹ کرائے پر لے کر تقریباً دو گھنٹے تک پیڈل مارتے رہے۔عجیب واہیات سواری ہے۔اس وقت کچھ احساس نہیں ہوتا، بعد میں خوب پتا چلتا ہے۔دو گھنٹے گزار کر اس سے اترے تو اگلے دو دن تک لنگڑاتے رہے اور اس گھڑی کو کوستے رہے جب چودھری صاحب کو پیڈل بوٹس نظر آئی تھیں جھٹپٹے کے وقت تک اسی طرح مختلف تفریحات میں مشغول رہے۔اندھیرا پھیلنے لگا تو ٹکٹ لیکر میوزیکل فاؤنٹین کے چھوٹے سے اسٹیڈیم میں جا بیٹھے۔درمیان میں ایک تالاب میں کئی فوارے پانی اچھال رہے تھے۔ اندھیرا چھا گیا تو شو شروع ہوا۔ مختلف رنگوں کی روشنیاں میدان میں رقص کرنے لگیں ، بہترین ساؤنڈ سسٹم پر موسیقی شروع ہوئی تو رنگ و نور کا ایک طوفان آ گیا اور تمام فوارے اور رنگ برنگی روشنیاں اس موسیقی کی تال پر رقص کرتے ہوئے پانی سے کھیلتے رہے۔ہم اس اسٹیڈیم میں موجود تمام تماشائیوں کے ہمراہ دم بخود اس حسین نظارے کو دیکھتے رہے۔کوئی ایک گھنٹے کے اس شو میں انھوں نے کئی انگریزی ، چائنیز اور ہندوستانی گانوں کی تال پر رقص کیا اور داد سمیٹی۔آخر میں جب انڈین فلم قربانی کا مشہور یہ گانا چھیڑا گیا

’’ قربانی، قربانی، قربانی
اللہ کو پیاری ہے قربانی‘‘

تو فواروں، رقص و موسیقی اور روشنی کے اس طوفان میں ہم بھی جھوم اٹھے۔گانا، موسیقی، رنگ و نور اور فواروں کا رقص اپنے عروج پر پہنچ کر یکبارگی تھم گیا، لیکن ناظرین کی تالیاں اگلے دس منٹ تک فضاء کو گرماتی رہیں۔واقعی یہ ایک ایسا نظارہ تھا جو ہمیں مدتوں یاد رہے گا۔

اب تو سنا ہے کہ انڈر واٹر ورلڈ کے نام سے ایک اور مظہر وجود میں آ چکا ہے لیکن ہماری ۲۰۱۰ء کی سیر کے پروگرام میں خان صاحب کی محبوبہ آڑے آئیں اور ہم اس جزیرے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکے۔ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے

ہم نے بارہا خان صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ سنگاپور سے واپسی تک اپنی محبوبہ دلنواز کو خدا حافظ کہہ دیں کہ واپسی پر تمہارے لیے ٹافیاں لے کر آئیں گے، لیکن وہ نہ مانے۔

آخری دن ہم اپنی شاپنگ لسٹ سنبھال کر مصطفٰے اور شمس الدین پہنچ گئے اور بشمول ایک عدد بڑے سوٹ کیس، تمام اشیاء وہیں سے بازار سے بارعائت خریدیں اور خوش خوش سنگاپور سے وطن واپس لوٹے۔

کراچی ائر پورٹ پر کسٹم آفیسر نے ہمارا سوٹ کیس اور اس کے ساتھ کمپیوٹر اور مانیٹر کے دو ڈبے دیکھے تو بظاہر گھبرا کر اور بباطن خوش ہوتے ہوئے سوال کیا۔’’کیا کیا خرید لیا بھائی جان؟‘‘

ہم نے سوالیہ انداز میں ان کی جانب دیکھا تو وہ اور زیادہ خوش ہو گئے۔ مرغا پھنس گیا، انھوں نے شاید یہ سوچ کر ہمارا سامان کھلوا لیا، لیکن اسے دیکھتے ہی ان کا منہ بن گیا اور انھوں نے مزید وقت ضائع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ہمیں جانے کا اشارہ کر دیا۔ادھر کئی کھیپیے لائن میں موجود تھے جن پر آفیسر صاحب کی نظر کرم ٹھہر گئی۔

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

تیسرا اور آخری ایکٹ

نوید ظفر کیانی / بی سی لیز

اِس طرح تو ہوتا ہے

منظر وہی جو پہلے اور دوسرے ایکٹ میں تھا۔

میریکیل (اسٹیج کے عین وسط میں ہے اور اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے) کوئی فائدہ نہیں (اخبار میز پر رکھ دیتا ہے) میرے خیالات منتشر ہو کر رہ گئے ہیں، ایک بے چینی سی ہے جس نے میرے قویٰ معطل کر کے رکھ دیے ہیں۔۔۔ چلیں میں ایک اور کوشش کرتا ہوں، ممکن ہے کہ اس بار میں وہ سب کچھ بھولنے میں کامیاب ہو جاؤں (اخبار اٹھا لیا ہے اور اُسے آگے پیچھے سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے اور مطالعہ کی کوشش کرتا ہے) نہیں، مجھ سے اب یہ نہیں ہونے والا، لگتا ہے کہ جیسے مجھے کبھی تازہ خبروں میں دلچسپی رہی ہی نہ ہو، اور تو اور، اب تو ریسلرز کی خبروں سے بھی جی اوبھ کر رہ گیا ہے۔۔۔ اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ڈِک کی بیوی؟؟ لیکن ڈِک تو کہتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہے، کس کی بات پر یقین کیا جائے؟ کچھ بھی ہو، خاتون کبھی کسی بھی حال میں غلطی پر نہیں ہو سکتی۔۔۔ ممکن ہے کہ ڈِک کے لئے اس شادی کو دوسروں کے سامنے مشتہر کرنے میں کسی قسم کے تحفظات لاحق ہوں، لیکن ایسا کیوں ہے، میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ (کسی خیال کے تحت چونک پڑتا ہے) ارے باپ رے، اب میں سمجھا، ڈِک اپنی ملازمہ سے شادی رچا بیٹھا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات دوسروں کے سامنے تسلیم کرنے والی نہیں ہے چنانچہ ہینکیاں پینکیاں مارتا پھر رہا ہے، اور ویسے بھی اُس کے چچا خاصے پرانے خیالات کے مالک ہیں اور اس قسم کی شادیوں کے تو سرے سے ہی خلاف ہیں اور یہ شادی کا وقوعہ بھی کوئی زیادہ پرانا نہیں لگتا کیونکہ ابھی ایک برس قبل کا ذکر ہے کہ اُس کی منگنی کسی دوسری خاتون سے ہوئی تھی۔۔۔ کیا بھلا سا نام تھا اُس کا؟ نہیں، اب نہیں یاد آنے والا اُس کا نام، بالکل ہی محو کر کر رہ گیا ہے دماغ سے۔ غالباً یہی ہوا ہوگا کہ اُس خاتون نے ڈِک کی اپنی ملازمہ میں دلچسپی کی بابت سُن لیا ہوگا اور اُس نے خود ہی منگنی توڑ دی ہوگی، ظاہر ہے جانتے بوجھتے مکھی کون نگلتا ہے۔

(صدر دروازے سے ہیرس داخل ہوتا ہے)

ہیرس سیلی سے آپ کی بات ہوئی جناب؟ میں نے اُسے آپ کی طرف بھیجا تھا۔

میریکیل ہاں آں، میں اُس سے مل چکا ہوں، مسز کمفرٹ کہاں ہیں؟

ہیرس: پتہ نہیں جناب، مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہیں، ہاں البتہ اس بات کا مجھے پتہ ہے کہ وہ کمفرٹ صاحب سے سخت ناراض ہیں، اور اُن دونوں میں جھڑپ بھی ہوئی ہے۔

میریکیل: میں کمفرٹ صاحب کی چچی کی بات نہیں کرر ہا ہوں۔

ہیرس: مجھے پتہ ہے کہ آپ اُن کی بات نہیں کر رہے ہیں، میں بھی اُن کی بات نہیں کرر ہا ہوں۔

میریکیل: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ممکن ہے اسے ڈک کی شادی کے بارے میں علم ہی نہ ہو۔ یہ ڈک بہت کائیاں بندہ ہے، مجھے بھی اس معاملے میں ذرا احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑے گا (ہیرس سے) میری مراد اُن کی ملازمہ سے تھی، میرا مطلب ہے سیلی سے!

ہیرس: جی جناب، مجھے پتہ ہے کہ سیلی اُن کی ملازمہ ہے، آپ نے کہا تھا مسز کمفرٹ کہا تھا تو میں اُن کے بارے میں بات کرنے لگا تھا۔ اور میرا نہیں خیال کہ کمفرٹ صاحب کسی بھی صورت پسند فرمائیں گے کہ اُن کی بیوی کو ملازمہ سمجھا جائے، یہ میرا ذاتی خیال ہے جناب۔

میریکیل: ظاہر ہے، کون شخص پسند کرے گا کہ اُس کی بیوی کو ملازمہ سمجھا جائے۔

ہیرس: لیکن آپ نے کچھ ایسا ہی تاثر دیا ہے جناب، پہلے آپ نے پوچھا ہے کہ مسز کمفرٹ کہاں ہیں اور پھر کہا ہے کہ آپ کی سیلی کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔

میریکیل: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اِسے تو اس بارے میں رتی برابر بھی شبہ نہیں ہے، لگتا ہے کہ ڈک نے اس معاملے کو بہت زیادہ خفیہ رکھا ہوا ہے۔

ہیرس: اور سیلی تو مسز کمفرٹ کی جوتیوں سے بھی نہیں ملتی جناب۔

میریکیل: کس کی مسز سے؟

ہیرس: جی جناب

میریکیل: تم کہہ کیا رہے ہو؟

ہیرس: جوتیوں سے جناب۔

میریکیل: نہیں، میں پوچھ رہا تھا کہ سیلی کس کی جوتیوں سے نہیں ملتی؟

ہیرس: مسز کمفرٹ کی جناب۔

میریکیل: تمھاری مراد اُن بوڑھی خاتون سے ہوگی۔

ہیرس: مسز کمفرٹ بوڑھی تو ہرگز نہیں ہیں جناب۔

میریکیل: خیر، یہ تو تمھارا نقطۂ نظر ہے۔

ہیرس: وہ تو جوان ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔

میریکیل: خوبصورت۔۔۔خیر، یہ بھی تمھارا اپنا نقطۂ نظر ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ہاہاہا، ذرا سوچیئے تو کہ کوئی ڈک کی چچی کو بھی نوجوان اور خوبصورت کہہ سکتا ہے (ہیرس سے) بہر حال میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا اور اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمھارا ذوقِ نظر ہے اور میں تمھارا ذوقِ نظر بھی قابلِ علاج ہے۔

ہیرس: لیکن جناب، اگر کمفرٹ صاحب کا خیال ہوتا کہ اُن کی بیوی خوبصورت نہیں ہیں تو وہ ہرگز ہرگز اُن سے شادی نہیں کرتا، وہ اس معاملے پر سمجھوتے کے قائل نہیں، وہ تو وہ، میں بھی ایسا نہیں سوچ پاتا۔

میریکیل: کیا کہہ سکتا ہوں میں، بس وہ بڈھا سٹھیا گیا ہوگا اگر اُس نے اُن خاتون میں کسی قسم کا حسن دریافت کرلیا ہوگا۔

ہیرس: بڈھا جناب؟

میریکیل: (جھنجلاتے ہوئے) ہاں ہاں، بڈھا، کیا تم بہرے ہوگئے ہو؟

ہیرس: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں جناب؟

میریکیل: اور میں پوچھتا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو، انتہائی احمق اور ماٹھے ہو تم، کمفرٹ کا خیال بالکل ٹھیک ہے تمھارے بارے میں۔۔۔حد ہوگئی، خود بھی الجھی الجھی باتیں کرتے ہو اور مجھے بھی چکرا کر رکھ دیتے

ہو۔

ہیرس جیسی آپ کی مرضی جناب (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) مجھے تو لگتا ہے کہ یہ صاحب سٹھیا گئے ہیں، بھلا یہ ہمارے کمفرٹ صاحب کو بڈھا کیسے کہہ رہے ہیں (میریکیل سے) میں رچرڈ صاحب کے بارے میں بات کرر ہا ہوں جناب۔

میریکیل نہیں، تم رچرڈ کے بارے میں نہیں بلکہ تم کہہ رہے تھے کہ سیلی تو مسز کمفرٹ کی جوتیوں سے بھی نہیں ملتی۔

ہیرس وہ واقعی ایسی ہی ہیں جناب۔

میریکیل واہ بھئی واہ، ثابت کرتے ہو کہ تم اول تا آخر سکاٹ ہو، تمہیں پتہ بھی ہے کہ اُس کی بیوی کون ہے۔

ہیرس بالکل جناب، مجھے تو ایک سال پہلے سے پتہ ہے کہ مسز کمفرٹ کون ہیں۔

میریکیل ایک سال سے، لیکن وہ ایک سال سے تو نہیں ہیں یہاں پر؟

ہیرس جی جناب، جب سے اُن کی منگنی ہوئی، اس بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا گیا تھا، میں نے بھی اس معاملے کو ویسا ہی سیکرٹ رکھا ہے جیسا مس ایڈتھ نے!

میریکیل مس ایڈتھ، کون مس ایڈتھ؟

ہیرس میں مس ایڈتھ کی بات کرر ہا ہوں جناب، مس ایڈتھ بارلے کی، اگر چہ اب تو اُن کو اس نام سے کم ہی لوگ پکارتے ہیں، ظاہر ہے کہ شادی کے بعد خواتین کے نام بدل جاتے ہیں۔

میریکیل ایڈتھ بارلے، بالکل، اب یاد آیا، یہی وہ خاتون تھیں جس کے ساتھ ڈک کی نسبت طے ہوئی تھی۔

ہیرس بالکل جناب، میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔

میریکیل لیکن ڈک تو اب شادی شدہ ہے۔۔۔ (کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

ہیرس ظاہر ہے جناب کہ ایسا ہی ہے، میں یہ بھی بتا چکا ہوں آپ کو۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ہوں، تو ثابت ہوا کہ اس بندے کو ڈک کی شادی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں (ہیرس سے) اور اب مسز کمفرٹ کہاں ہیں؟

ہیرس پتہ نہیں اس وقت کہاں ہیں وہ۔ کہیں آس پاس ہی ہوں گی، وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی ہیں، سوائے اس کے کہ جب اُنہیں اپنی والدہ سے ملنے کے لئے قصبے جانا پڑے اور یہ موقع ہفتے میں کم از کم ایک بار تو ضرور آتا ہے۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) مجھے ابھی اور اسی وقت کمفرٹ سے ملنا ہو گا اور اس بارے میں وضاحت طلب کرنی ہو گی، پتہ نہیں کیا گورکھ دھندہ پھیلاتا پھر رہا ہے یہ بندہ۔ (ہیرس سے) کمفرٹ سے کہو کہ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں، آج اُس سے دو دو باتیں ہو ہی جائیں۔

ہیرس جی جناب (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لگتا ہے کہ انہیں دودو باتیں کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ (صدر دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)۔

میریکیل دو دو بیویاں، ڈک ہمیشہ سے شوقین مزاج رہا ہے لیکن یہ تو حد ہی ہو گئی، یعنی کہ دو دو بیویاں اور وہ بھی ایک وقت میں، واہ بھئی واہ، اور اوپر سے موصوف اس امر کے بھی دعویدار ہیں کہ انہوں نے سرے سے شادی ہی نہیں کی، کیا کہنے ڈک کے واہ بھئی واہ۔

(میڈر اور مسز میڈر داہنی طرف کے دروازہ نمبر ۲ سے داخل ہوتے ہیں)

میڈر چچا ٹھیک ہے کلیمنٹائن، مجھے تمھارا ہر مطالبہ منظور ہے۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ایک اور انہونی، مجھے میڈر صاحب سے ڈک کے بارے میں بات کرنی پڑے گی۔

میڈر چچا تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے، کمفرٹ کو

وضاحت پیش کرنی پڑے گی۔

میریکیل اور آپ کے خیال میں، میں کیا کہہ رہا ہوں جناب؟

میڈرچا (میریکیل پر نظر پڑتی ہے تو آواز میں غصیلا پن آ جاتا ہے) بھلا تمھیں کیا حق ہے کہ تم اس معاملے میں کچھ سوچو مسٹر؟

میریکیل (بوکھلاتے ہوئے) ح ح حق جناب، میرا خیال ہے کہ۔۔۔

میڈرچا حد ہو گئی۔

مسز میڈر بالکل، یہ تو حد ہو گئی۔

میڈرچا کیا تم نے یہ اپنا فرض سمجھ لیا ہے کہ ہر شخص کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاؤ۔۔۔تم نے تو میرے اور میری بیوی کے درمیان بھی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے، آخر تم چاہتے کیا ہو۔

میریکیل یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، میں نے تو حتیٰ المقدور کوشش کی ہے کہ آپ دونوں کے بیچ جو معاملات ہیں اُس میں بہتری پیدا کی جائے اور۔۔۔

مسز میڈر بالکل نہیں، مکے سے کبھی کیل نہیں ٹھونکی جا سکتی۔

میڈرچا اور اگر ایسا کرو گے تو نہ صرف اپنے ہاتھ کا ستیاناس کرو گے بلکہ مکو بھی کہلاؤ گے۔

میریکیل لیکن میں نے تو بڑی نیک نیتی سے۔۔۔

میڈرچا (بات کاٹتے ہوئے) تمھاری نیک نیتی کو شہد لگا کر چاٹا جائے صاحبزادے؟ تمھاری کوششوں کا کوئی نتیجہ نکلا؟

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ویسے ہے تو یہ سچ کہ میں بیکار ہوا میں تیر چلاتا رہا ہوں۔

میڈرچا جب تک پانی کی گہرائی کا اندازہ نہ ہو، بندے کو ڈبکی لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

میریکیل آپ ٹھیک فرما رہے ہیں جناب۔

میڈرچا (قدرے تیز لہجے میں) تب پھر آپ بھی حماقت فرمانے سے پرہیز فرمائیں۔

میریکیل ٹھیک ہے جناب، اب میں احتیاط کروں گا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اِن لوگوں کو لڑتا مرتا دیکھوں گا تو رُخ موڑ کر گزر جاؤں گا، لیکن لگتا ہے کہ اِن دونوں میاں بیوی میں کوئی انہونا سا سمجھوتہ ہو چلا ہے (میڈرچا سے) لیکن جناب، ایک معاملہ ایسا بھی ہے جس پر میں بات۔۔۔

میڈرچا میرے پاس تصنع اوقات کے لئے وقت نہیں۔

میریکیل اگر آپ کی بیوی ذرا سی دیر کے لئے یہاں سے تشریف لے جائیں تو میں۔۔۔

میڈرچا میری بیوی چلی جائے، بھلا وہ کس خوشی میں؟

مسز میڈر اب ہمیں کوئی سازشی جدا نہیں کر سکتا۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) واہ، کیا ڈائیلاگ مارا ہے بڑھیا نے، تو پھر ٹھیک ہے، میرے بھی ٹھینگے سے، اگر یہ دونوں اِتنے ہی لیلیٰ مجنوں بنے ہوئے ہیں تو (میڈرچا سے) مجھے آپ دونوں میاں بیوی میں اس قدر حسنِ اتفاق دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے لیکن۔۔۔

میڈرچا میں اپنی بیوی سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔

مسز میڈر (میریکیل کی طرف دیکھ کر، مسکراتے ہوئے) اور اگر یہاں سے کسی کو کوچ کرنے کا شوق ہو رہا ہے تو وہ جا سکتا ہے۔ (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

میڈرچا بالکل، میری طرف سے پوری پوری اجازت ہے۔

(کمفرٹ اسٹیج کے داہنی طرف والے پہلے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ایڈتھ تو مفاہمت پر کسی طور بھی آمادہ نہیں۔

میریکیل ارے ڈِک! شکر ہے تمھاری شکل تو نظر آئی، مجھے تم سے کسی۔۔۔۔کسی موضوع پر بہت ضروری بات کرنی ہے۔

میڈرچا بھتیجے، مجھے تمھارے قیمتی وقت سے چند لمحے درکار

ہیں۔

کمفرٹ: واہ، مری تو بہت ضرورت پڑ گئی ہے دنیا والوں کو۔

میریکیل: یار، اگر تم میرے ساتھ سٹنگ روم میں چلو تو میں۔۔۔

میڈر چچا: نہیں رچرڈ، تم یہیں رکو۔

میریکیل: لیکن میں اِنہیں کافی دیر سے بلوا رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ۔۔۔۔

میڈر چچا: تم اپنے فضول خیالات کو رہنے دو میاں۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اب آپ لوگ ہی کہیئے کہ میں کیا کروں۔۔۔ چکرا کر رکھ دیا ہے اِن لوگوں نے!

میڈر چچا: تمھارے چچا ہونے کی حیثیت سے میرا حق فائق ہے کہ تم میری بات پہلے سنو۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) بہتر ہے کہ میں یہیں رہوں اور مقدور بھر کوشش کروں کہ طوفان ٹل جائے (میڈر چچا سے) چچا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں، سب سے پہلے اِنہیں کو استحقاق حاصل ہے کہ یہ مجھ سے باز پرس کریں، میں انہیں مطمئن کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔

میڈر چچا: خوشی کی بات ہے کہ تمھیں اب بھی مراتب کا خیال ہے۔ سامنے بیٹھ جاؤ۔

کمفرٹ: میں یہیں ٹھیک ہوں

میڈر چچا: میں کہہ رہا ہوں بیٹھ جاؤ۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لگتا ہے کہ طوفان خاصا تیز رفتار ہے، مجھے اپنے قدم زمین پر سختی سے گاڑنے ہوں گے۔

(میڈر چچا کے داہنی والی کرسی پر براجمان ہو جاتا ہے)

میڈر چچا: بھتیجے، تمھیں اب تک ہونے والے تمام واقعات کی وضاحت پیش کرنی پڑے گی۔

کمفرٹ: جیسا آپ فرمائیں چچا جان، میں حاضر ہوں ہر خدمت کے لئے۔

میڈر چچا: سوال تم نہیں میں کروں گا، اور سب سے پہلے تم سے اس امر کی وضاحت چاہوں گا کہ یہاں میری بیوی کی توہین کی گئی ہے، کیوں؟

مسز میڈر: توہین اور وہ بھی اِس گھر کی ایک معمولی ملازمہ نے۔

کمفرٹ: کیا۔۔۔ ناممکن!!

میڈر چچا: تم کہنا کیا چاہتے ہو بھتیجے، ایسا ہی ہوا ہے اور میں تم سے اس کی وضاحت چاہتا ہوں۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ارے یہ تو طوفانِ بادو باراں ہے (میڈر چچا سے) لیکن چچا جان، میں تو چچی جان کی توہین کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

میڈر چچا: نہیں، تم نے ایسا ہی کیا ہے اور اگر تم نے خود نہیں بھی کیا ہے تو جو کچھ ہوا ہے تمھاری اجازت اور رضامندی سے ہوا ہے، چنانچہ دونوں ایک ہی بات ہیں۔

مسز میڈر: مطلب یہ کہ تمھیں نے اُس ملازمہ کو رکھا ہوا ہے۔

کمفرٹ: ہاں وہ ہے تو میری۔۔۔

میڈر چچا: اُسے فوراً سے پہلے چلتا کرو۔

کمفرٹ: لیکن چچا جان۔۔۔

مسز میڈر: تو تم اُسے برخواست کرنے سے انکار کر رہے ہو (میڈر چچا سے علیحدگی میں) لگتا ہے ہمارے شک میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔

میڈر چچا: اور بھتیجے، ایک اور معاملہ بھی ہے۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لو جی، اب تو یہ سیلاب سر سے گزرتا جا رہا ہے۔

میڈر چچا: تم اپنی شادی سے متعلق میرے خیالات سے آگاہ ہی ہو، اب ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمھاری ملازمہ یہ کیوں کہہ رہی تھی کہ وہ تمھاری بیوی ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟؟

کمفرٹ: لیکن میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا ہے ناں چچا جان۔

میریکیل: لیکن ڈک، تم جانتے ہو کہ۔۔۔۔

میڈر چچا: تم کون ہوتے میاں، ہماری باتوں میں مداخلت

کرنے والے؟ (کمفرٹ سے) اُس ملازمہ نے جوکہاہے تم اُس کی بات کرو۔

کمفرٹ مم۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں چچا جان، سوائے اس کے کہ وہ کچھ کھسکی ہوئی ہے۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) توبہ، توبہ، یہ تو جھوٹوں کا سردار ہے۔

میڈر چچا تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم نے اُس خاتون سے شادی نہیں کی ہوئی ہے؟

کمفرٹ میں نے کسی بھی خاتون سے شادی نہیں کی ہوئی ہے۔

میریکیل ڈِک، تم کیسے بندے ہو، کس ڈھٹائی سے اپنے موقف پر کھڑے ہوئے ہو جبکہ۔۔۔

میڈر چچا (میریکیل سے، خشک لہجے میں) اپنے کام سے کام رکھو میاں (کرسی سے اٹھتے ہوئے) تمھارا اس سے کیا تعلق کہ رچرڈ کھڑا ہوا ہے یا بیٹھا ہوا ہے، تمھاری بلا سے اگر میرے بھتیجے نے ایک چھوڑ دس ہزار عورتوں سے شادی رچا رکھی ہو۔

مسز میڈر اسے حق پہنچتا ہے کہ یہ جس سے چاہے شادی کرے ۔۔۔

میڈر چچا ہم سے پوچھے بغیر؟

کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اس سے پہلے کہ میں اس طوفان میں کسی تنکے کی طرح بہہ جاؤں، مجھے حسب ماتقدم کے طور پر یہاں سے کھسک لینا چاہیئے (اٹھتا ہے) (میریکیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے) کیا بات ہے، تم مجھ سے اکیلے میں کیوں ملنا چاہتے تھے؟

میریکیل اگر تم برا نہ مناؤ تو ہم کچھ دیر کے لئے سٹنگ روم چلے چلتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ تمھارے چچا اور چچی میری یہاں موجودگی کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔

مسز میڈر اور یاد رکھو رچرڈ، تمھیں ہر حال میں اُس ملازمہ کو نکال باہر کرنا ہوگا۔

لوٹا ای اوئے۔۔۔

(لمرک)

عبرت کہ دنیا میں کیسے کیسے نہلے ہیں دہلے
میری حالت پر تو ہنس لے، جو جی چاہے سو کہہ لے
تھینک یو ویری ویری مچ
لیکن یہ بھی بات ہے سچ
میں بھی تھا بندے کا پُتر لیڈر بننے سے پہلے

نوید ظفر کیانی

میڈر چچا بالکل، میں قطعاً برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی میری بیوی کی توہین کرے اور اُسے اُس کی قرار واقعی سزا نہ دی جائے۔

کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) خود اپنی بیوی کو ہی نکال باہر کروں؟ اب میں کیا کروں؟؟

(کمفرٹ اور میریکیل اسٹیج سے باہر نکل جاتے ہیں)

مسز میڈر میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، اُس عورت نے واضح طور پر کہا تھا کہ رچرڈ اُس کا شوہر ہے، بھلا وہ کس برتے پر ایسا کہہ رہی تھی؟

میڈر چچا یہ معاملہ تو کچھ زیادہ ہی پُر اسرار ہوتا جا رہا ہے۔ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) لیکن رچرڈ بھی تو کہہ رہا ہے

کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں، تم خود ہی سُن چکی ہو اور ظاہر ہے ہمیں ایک معمولی باورچن کے مقابلے میں اپنے بھتیجے کی بات پر یقین کرنا ہے۔ مجھے بھی یہ عورت کچھ کھسکی ہوئی سی لگ رہی ہے، کیا پتہ یہ خاتون ہمارے بھتیجے پر ریجھ گئی ہو اور اس سے شادی کرنا چاہ رہی ہو اور اُس کی یہ خواہش اس کے لاشعور پر اس قدر حاوی ہوگئی ہو کہ وہ شعوری طور پر سچ مچ خود کو اُس کی بیوی سمجھ بیٹھی ہو۔

مسز میڈر لیکن اگر وہ ایسی ہی پاگل ہے تو رچرڈ اُس کو نکال باہر کرنے میں ہچکچاہٹ سے کیوں کام لے رہا ہے۔

میڈر چچا یہی بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے، بہر حال، میں دیکھوں گا کہ وہ عورت کس طرح اس گھر میں رہتی ہے۔ میں ہر گز برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی ایرا غیرا میری بیوی کی توہین کرتا پھرے۔

مسز میڈر ایرا غیرا، تو کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ واقف کار لوگ میری توہین کر سکتے ہیں۔

میڈر چچا اوہ ہر گز نہیں، کبھی نہیں۔

مسز میڈر اور تم اب مجھ سے جھگڑا بھی نہیں کرو گے؟

میڈر چچا نہیں آئندہ ایسا نہیں ہوگا، لیکن ڈیر، یاد رکھو، تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

مسز میڈر کبھی کبھی ایک ہاتھ سے بھی بج جاتی ہے۔

میڈر چچا نہیں، اگر دوسرا بندہ نہ چاہے تو کوئی تنِ تنہا ہر گز نہیں لڑ سکتا۔

مسز میڈر لیکن کوئی تنِ تنہا لڑائی کا آغاز تو کر سکتا ہے۔

میڈر چچا ہاں یہ بھی سچ ہے، لیکن اب ماضی کو بھول جاؤ، میں تمھیں کوئی الزام تو نہیں دے رہا ہوں۔

مسز میڈر الزام اور مجھے، تمھارے پاس مجھے الزام دینے کو ہے ہی کیا؟

میڈر چچا میں تمھاری لڑائی جھگڑوں کے کئی حوالے دے سکتا ہوں۔

مسز میڈر میرا کبھی کوئی قصور نہیں رہا ہے۔

میڈر چچا چھوڑو بھی کلیمنٹینہ، ہم دونوں ہی۔۔۔

مسز میڈر صرف اپنی بات کرو۔

میڈر چچا تمھارا پارہ تو ایک دم ہی چڑھ جاتا ہے۔ تم سے تو کوئی عقل والی بات کرنا ہی فضول ہے۔

مسز میڈر بالکل، اور جب وہ تمھاری عقل والی بات ہو تو پھر تو کبھی بھی نہیں۔

میڈر چچا دیکھو کلیمنٹینہ، اب تم دوبارہ وہی کچھ شروع ۔۔۔

مسز میڈر ہاں ہاں، کہو کہو، میں دوبارہ تم سے لڑنا چاہ رہی ہوں **(طنزیہ انداز میں)** اور تم مجھ سے لڑنا ہی نہیں چاہ رہے، کیوں؟ ہاہاہا، بات دراصل یہ ہے کہ تمھیں اپنے حواسوں پر کنٹرول رہا ہی نہیں ہے۔

میڈر چچا **(آہستگی سے)** تو اب میں کیا کہہ۔۔۔

مسز میڈر تمھیں جرأت کیسے ہوئی مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کی **(اُٹھتے ہوئے)** تم ایک ناسور ہو، ایک ایسا ناسور، جس کا پارہ ہمیشہ بانس پر چڑھا رہتا ہے، اس وقت بھی تمھاری آنکھیں شعلے اُگل رہی ہیں۔ تمھاری باتوں میں زہر گھلا رہتا ہے، تمھارے لہجے میں سانپ لوٹتے ہیں۔۔۔تم۔۔۔تم۔۔۔ **(میڈر چچا کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں)** خبردار جو مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی، ایک لفظ بھی مت نکالنا اپنی زہریلی زبان سے، میں نے تمھاری کوئی بات نہیں سُنی۔ **(سامنے والے دروازے کے کمرہ نمبر ۲ سے باہر نکل جاتی ہے)**

میڈر چچا اور سُنئے اور سر دھنئے، میری زبان زہریلی ہے، میرا پارہ بانس پر چڑھا رہتا ہے، لڑائی کا آغاز میں کرتا ہوں، میری آنکھیں شعلے اُگلتی ہیں، بھلا میری آنکھوں میں کسی قسم کا کوئی غصہ دکھائی دے رہا ہے، کتنے افسوس کی بات ہے، ابھی تو ہم میں اچھی خاصی ہم آہنگی پیدا ہوئی تھی اور محترمہ نے ایک منٹ میں لٹیا

ڈبو کر رکھ دی۔ اب کچھ بھی ہو جائے، میں نے کسی قسم کی لچک نہیں دکھانی، جب میرا اس معاملے میں کوئی قصور ہے ہی نہیں تو میں کیوں معذرتیں کرتا پھروں۔ (ڈرائنگ روم سے میریکیل اندر داخل ہوتا ہے)

میریکیل (دروازے کی طرف منہ کر کے باآوازِ بلند) ٹھیک ہے ڈک، میرا اب اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں، میں ۔۔۔

کمفرٹ (کمرے داخل ہوئے بغیر) تو پھر ٹانگ کیوں اڑاتے پھر رہے ہو؟

میریکیل (دوبارہ دروازے کی طرف منہ کر کے باآوازِ بلند) تمھارا طرزِ عمل ہی کچھ اس قسم کا تھا، اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔

کمفرٹ (کمرے داخل ہوئے بغیر) جب میں جانتا ہوں تو تم مجھے بتانا کیا چاہتے ہو؟

میریکیل (خودکلامی کے انداز میں) کتنا ڈھیٹ اور کمینہ بندہ ہے یہ ڈک بھی، ٹھیک ہے، اب میں بھی اسے ٹھینگے پر رکھوں گا، ڈوبتا ہے تو ڈوبے، میری بلا سے۔

میڈرچا رچرڈ نے تمھیں مدد کے لئے پکارا تھا؟

میریکیل نہیں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، جب کسی بندے کا جھاکا عورتوں کے معاملے میں کھل جائے تو وہ دو شادیاں کرے تو دس شادیاں، اُسے کون منع کر سکتا ہے، پھر وہ کسی کی سنتا ہی کب ہے۔

میڈرچا تم عجیب الجھی الجھی سی باتیں کر رہے ہو، کچھ عقل کو ہاتھ مارو۔

میریکیل کاش میں ڈک کے کسی کام آسکوں۔۔۔

میڈرچا یہ شادیوں سے تمھاری کیا مراد ہے؟ رچرڈ کا اس سے کیا لینا دینا ہے؟؟

میریکیل سامنے کی بات ہے، ڈک انکار کر رہا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے جبکہ میرا دعویٰ ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔

میڈرچا ظاہر ہے اُس نے انکار ہی کرنا ہے، اُس نے جب شادی کی ہی نہیں تو بھلا وہ کیسے مانے کہ۔۔۔

میریکیل ڈک نے نہ صرف اپنی ملازمہ سے شادی کر رکھی ہے بلکہ اُس کی ایک اور بیوی بھی ہے۔

میڈرچا ہیں، کیا، دو دو شادیاں، ناممکن (میڈر چا اُٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں)

میریکیل یہ آپ کا خیال ہے، میں تو کہتا ہوں کہ یہ ممکن ہے بلکہ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ اُس نے دو دو شادیاں رچا رکھی ہیں۔ اور مجھے اس پر پورا پورا یقین ہے۔ اب اگر کوئی سوال ہے تو یہ ہے کہ اُس نے اس سلسلے کو کس حد تک پہنچایا ہوا ہے، میرا مطلب ہے کہ کتنی شادیاں کر رکھی ہیں۔

میڈرچا مجھے تو تمھاری کسی بات پر بھی یقین نہیں آ رہا، بھلا تم ایسا کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟

میریکیل پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ اُس خاتون نے ایسا خود کہا ہے۔

میڈرچا ایک ایسی عورت نے جو کھسکی ہوئی ہے۔

میریکیل یہ آپ کا خیال ہے جناب، میں اُن خاتون سے بات چیت کر چکا ہوں اور میں نے اُن کے انداز سے اخذ کیا ہے کہ اس بات میں اس قدر صداقت ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔

میڈرچا بکواس۔۔۔ بھلا تم نے ایسا کیا سُن لیا ہے اُس عورت سے؟

میریکیل اِتنا کہ جو میرے شبے کی تصدیق کے لئے کافی تھا، اور جب سے میں نے ڈک کی باتیں سُنیں تو میرا شک یقین میں بدل گیا ہے۔

میڈرچا اور وہ کیا تھا؟

میریکیل یہی جو میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ڈک نے دو دو شادیاں کر رکھی ہیں۔

میڈرچا مجھے تمھاری باتوں پر رتی برابر بھی بھروسہ نہیں لیکن

میریکیل (طنزیہ لہجے میں) تمھاری معلومات اور مشاہدات دونوں عدیم المثال ہیں۔ اور وہ دوسری خاتون کون ہیں؟

میریکیل وہی لڑکی جس سے ایک برس قبل ڈک کی نسبت طے ہوئی تھی۔

میڈر چچا یہ کیسے ہوسکتا ہے، رچرڈ نے خود مجھے بتایا تھا کہ اُس کی نسبت جن خاتون سے طے ہوئی تھی وہ معاملہ کب کا ختم ہو چکا ہے، اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ تمھارے شکوک وشبہات بالکل بے بنیاد ہیں۔

میریکیل ٹھیک ہے ڈک نے ایسا ہی کہا ہوگا آپ سے لیکن کیا وہ جھوٹ نہیں بول سکتا؟

میڈر چچا (غصے سے) خاموش ہو جاؤ، مجھ سے جھوٹ تم بول سکتے ہولیکن رچرڈ، ہرگز نہیں۔۔۔اب تم ذرا یہ تو بتاؤ کہ اُس نے اگر یہ شادیاں کی ہوئی ہیں تو ہم سے چھپانے کی اُسے ضرورت ہی کیا ہے؟

میریکیل بظاہر تو کوئی وجہ نہیں لیکن کیا پتہ اُسے آپ کی طرف سے شدید ردِعمل کا خطرہ ہو، اس لئے وہ اس سارے معاملے کو چھپانا چاہ رہا ہو۔

میڈر چچا میری جانب سے تو شدید ردِعمل کا خطرہ اُسے ہونا بھی چاہیئے، وہ اس ضمن میں مجھے اچھی طرح جانتا ہے، تو کیا واقعی تم درست کہہ رہے ہو، میں اس کا پتہ لگا کر رہوں گا (صدر دروازے کی طرف جاتا ہے) لیکن نہیں، تمھارے شبہات پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا، اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے مزید ٹھوس شواہد کی ضرورت ہے۔ یہ ملازمہ کہاں ہے، سب سے پہلے میں اس سے ملنا چاہوں گا۔

میریکیل آپ یہیں ٹھہریئے، میں اُسے آپ کی طرف بھیجتا ہوں، آپ خود دیکھیں گے کہ میرا دعویٰ کتنا درست ہے۔ (باہر نکل جاتا ہے)

میڈر چچا یہ تو ایک سکینڈل ہوا، صریحاً سکینڈل، یعنی کہ حد ہوگئی، لیکن نہیں، یہ محض شبہ ہی ہے، اس میں صداقت نہیں ہوسکتی، میرا دل کہتا ہے کہ یہ سب کسی قسم کی غلط فہمی کا شاخسانہ ہے۔۔۔دو دو بیویاں، اگر ایسا ہے تو مجھے تو غریب رچرڈ پر ترس آ رہا ہے، کیا تماشہ ہوتا ہوگا جب وہ اُن دونوں بیویوں سے بیک وقت لڑائی کر رہا ہوتا ہوگا، یا، یا وہ دونوں اُس سے بھڑ پڑتی ہوں گی، غضب کا طوفانی منظر دکھائی دیتا ہوگا۔

(مسز کمفرٹ داہنی والے دروازے نمبرا سے داخل ہوتی ہیں، میڈر چچا منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لو جی، یہ ملازمہ تو حاضر ہوگئی پیشی کے لئے، ویسے دیکھنے میں تو یہ کچھ ایسی بھی بُری نہیں ہے۔ (مسز کمفرٹ سے، انتہائی نرم لہجے میں) دیکھیں محترمہ، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا ہوں (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) بہتر ہے کہ ابھی اِن خاتون سے پیار دُلار سے بات کی جائے۔

مسز کمفرٹ آپ ہی مسٹر میڈر ہیں، ڈک کے چچا؟

میڈر چچا جی بالکل، میں ہی رچرڈ کا چچا ہوں۔

مسز کمفرٹ ڈک نے مجھے بتایا تھا کہ آپ ہمارے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

میڈر چچا تم دونوں میں اِتنی بھی بے تکلفی نہ ہوگی کہ تم اُسے کمفرٹ صاحب کہنے کے بجائے "ڈک" کہہ کر پکارو۔

مسز کمفرٹ اُفوہ، معذرت، میں بھول گئی، واقعی دوسروں کے سامنے مجھے اُنہیں کمفرٹ ہی کہنا چاہیئے تھا۔

میڈر چچا لیکن ایک ملازمہ کو تو اس امر کا استحقاق حاصل نہیں کہ وہ اپنے مالک کو اُس کے سامنے بھی اُس کے نام سے پکارے۔

مسز کمفرٹ میں ملازمہ نہیں ہوں بلکہ کمفرٹ کی بیوی ہوں۔۔۔آپ مجھے ملازمہ کیوں سمجھ رہے ہیں، کیا کمفرٹ نے آپ سے کہا ہے کہ میں ملازمہ

ہوں۔۔۔میں یقیناً ملازمہ بن کر رہ جاؤں گی اگر کمفرٹ نے دوسرا بیاہ کر لیا ہو گا (رونے لگتی ہے)۔

میڈرچچا اب روؤ تو نہیں۔(منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اب میں کیا کروں، روتی ہوئی عورت اور غصیلی گھوڑی پر قابو پانا کسی خاص جادو ٹونے کا متقاضی ہے، جس میں کم از کم میں تو واقف نہیں۔(مسز کمفرٹ سے) رچرڈ کی کوئی بیوی نہیں، اس بات کی تو قسم کھائی جاسکتی ہے (پھر تیزی سے) سوائے تمھارے، اگر تم ہو تو۔۔۔

مسز کمفرٹ (بھرائی ہوئی آواز میں) لیکن اُس کی دوسری بیوی بھی ہے، مم، میں جانتی ہوں کہ وہ۔۔۔

میڈرچچا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) جب کسی خاتون کسی بات کو جاننے کا دعویٰ کرے تو اُس کو کوئی دوسری بات بتانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

مسز کمفرٹ وہ اسی گھر میں موجود ہے، میں ڈک اور اُسے بغلگیر ہوتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔

میڈرچچا کیا کہا، تم اُسے دیکھ چکی ہوں، یہاں، اس گھر میں، ناممکن، کیا تمھیں یقین ہے؟

مسز کمفرٹ جی، میں نے خود دیکھا تھا۔

میڈرچچا کیا تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم رچرڈ کی بیوی ہو، میرا مطلب ہے کوئی نکاح نامہ ہے تمھارے پاس؟

مسز کمفرٹ جی ہاں، میرے کمرے میں پڑا ہوا ہے۔

میڈرچچا اور تم نے اُس نالائق کو کسی دوسری عورت سے بغلگیر ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟ کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ کوئی عورت ہی تھی؟؟

مسز کمفرٹ مجھے سو فیصد یقین ہے۔

میڈرچچا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) میرا میٹر پھرکی کی طرح گھوم رہا ہے اور غصہ ضبط کی آخری حدود کو چھو رہا ہے، میری آنکھیں تو بالکل انگارہ بن کر رہ گئی ہوں گی۔۔۔رچرڈ رچرڈ رچرڈ، یہ تم نے کیا کیا، میرے اعتماد کو اس بری طرح دھچکا کیوں لگایا ہے تم نے (مسز کمفرٹ سے) سیلی، کیا تم جانتی ہو کہ۔۔۔

مسز کمفرٹ جی میرا نام ایڈتھ ہے۔

میڈرچچا ایڈتھ؟ اُس نے تو مجھے تمھارا نام سیلی بتایا تھا۔۔۔ایک اور دھوکہ۔۔۔ایڈتھ، کیا تم جانتی ہو کہ تمھارا شوہر کرتا کیا ہے، میرا مطلب ہے کہ اُس کی کمائی کا ذریعہ کیا ہے؟

مسز کمفرٹ فی الحال تو کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔اُس نے مجھے بتا رکھا ہے کہ آپ اُسے سالانہ خطیر رقم دیتے ہیں گھر کے خرچے کے لئے، کیا یہ درست ہے؟

میڈرچچا ہاں، افسوس کہ یہ درست ہے، لیکن کیا تم جانتی ہو کہ یہ رقم اُسے کس شرط پر ملتی ہے؟

مسز کمفرٹ نہیں، مجھے کسی شرط کا علم نہیں۔

میڈرچچا شرط یہ تھی کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔

مسز کمفرٹ ایسی تو کوئی بات نہیں بتائی اُنہوں نے مجھے۔

میڈرچچا ظاہر ہے، وہ بتا بھی کیسے سکتا تھا، انتہائی مکار ہے وہ۔۔۔گویا کہ ایک اور دھوکہ، دیکھ لو ایڈتھ، میرا اپنا بھتیجا مجھ سے کیسا سلوک کرتا رہا ہے، وہ بھی ایسا بھتیجا جس سے میں بے پناہ محبت کرتا ہوں۔میرے لئے ناقابل برداشت ہے یہ بات، خیر، جو اُس سے ہو سکا وہ اُس نے کیا، اب میری باری ہے۔اُس نے جتنا میرے ٹین باندھنا تھا باندھ چکا، اب جو ٹین میں اُس کے باندھوں گا وہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔

مسز کمفرٹ اوہ چچا جان، پلیز ڈک کے ساتھ کچھ ایسا ویسا مت کیجئے گا، میں اب بھی اُس سے اُسی قدر چاہتی ہوں جتنا پہلے چاہتی تھی، میری محبت کا کوئی رنگ پھیکا نہیں پڑا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس میں اُس کا کوئی قصور

نہیں ہوگا، یہ سب اُس مکروہ اور مکار بڑھیا کا کیا دھرا ہے، اُسی نے اسے پٹیاں پڑھائی ہوں گی، اگر ڈک واقعی اُسے ۔۔۔ اُسے ۔۔۔

میڈر چچا ڈک نے اُسے شہ دے رکھی ہوگی، کہاں ہے وہ، میں خود اُسے نکال باہر کروں گا۔

مسز کمفرٹ (جذباتی ہوکر میڈر چچا کا ہاتھ تھام لیتی ہے) آپ بہت مہربان شخص ہیں، پلیز، ڈک کو کچھ مت کہئے گا۔

میڈر چچا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یہ تو بہت ہی پیاری بچی ہے (مسز کمفرٹ سے) نہیں، میں اُسے معاف نہیں کر سکتا۔

(مسز میڈر داہنی طرف والے دروازہ نمبر ۲ سے کسی طوفان کی مانند داخل ہوتی ہیں)

مسز کمفرٹ پلیز، میری خاطر۔

میڈر چچا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) میری بیوی کا کیا ردِ عمل ہوگا اگر وہ ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ لے (مسز کمفرٹ سے) چلو، میں کوشش کروں گا کہ تمھاری خاطر اُسے کچھ زیادہ سزا نہ دوں لیکن ایک بار اُس کے ہوش ضرور اُڑاؤں گا، یہ تو طے ہے، بلکہ میں ابھی اُس کی خبر لیتا ہوں، وہ اس وقت سٹنگ روم میں ہے۔ (سٹنگ روم کی جانب جاتا ہے)

مسز کمفرٹ اس سارے معاملے میں اُس کا کوئی قصور نہیں ہوگا، مجھے یقین ہے اس بات کا۔

مسز میڈر (پھنکارتے ہوئے) لیکن تمھارا قصور تو بہر حال ہے، تم، تم ۔۔۔ پتہ نہیں تمھیں ایسی کن شرائط پر یہاں رکھا گیا ہے لیکن میں تمھیں ہرگز ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ تم اپنے آپ کو کمفرٹ کی بیوی کہو اور اُس کو بدنام کرتی پھرو۔ ہاں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی دوسری عورت کے خصم پر ڈورے ڈالو اور اپنا مطلب نکلواؤ۔

مسز کمفرٹ میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں تمھیں ابھی تک سمجھ نہیں پائی ہوں کہ تم ہو کیا شے، اور تمھیں مجھ سے اس انداز مین باتیں کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔

مسز میڈر سچی بات کرنے کی جرأت ہے مجھ میں۔

مسز کمفرٹ تم جانتی ہو کہ تم جھوٹ بول رہی ہو، میں پھر تمھیں حکم دیتی ہوں فوراً یہاں سے چلتی بنو۔

مسز میڈر میں تمھاری بات کیوں مانوں (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) تم دیکھتی جاؤ کہ میں کرتی کیا ہوں، میں یہاں بیٹھی ہوئی ہوں اور اُس وقت تک بیٹھی رہوں گی جب تک میرا دل چاہے گا۔

مسز کمفرٹ تو تم یہاں سے جانے سے انکار کر رہی ہو۔

مسز میڈر بالکل! میں صرف اُسی کی بات سنوں گی جس کے پاس اس بات کا استحقاق ہوگا۔

مسز کمفرٹ تو پھر ٹھیک ہے، تم میری بات نہیں مان رہی ہو تو پھر وہی تم سے آ کر نمٹ لے گا جو تمھیں یہاں سے اُٹھا کر باہر پھینکنے کی قوت رکھتا ہے۔

(سٹنگ روم کی طرف چلی جاتی ہے)

مسز میڈر یہ تو واقعی بالکل ہی پاگل ہے۔

(سٹنگ روم کے دروازے سے مسز کمفرٹ اور میڈر چچا داخل ہوتے ہیں)

میڈر چچا (مسز کمفرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے) کہاں ہے وہ؟

مسز کمفرٹ (میڈر چچا کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ سامنے بیٹھی ہوئی ہیں، کہہ رہی ہیں کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔

میڈر چچا (بدستور مسز کمفرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا، ایسا کہہ رہی تھی وہ، اب نہیں کہہ سکے گی، میں ابھی اُسے نکال باہر کرتا ہوں۔ (مسز میڈر سے، اُس کی طرف غور کئے بغیر) تم نے ان معزز خاتون کی بات ماننے سے انکار کر رہی ہو، ٹھیک ہے، اب تم میرا حکم تو مانو گی، اس گھر سے فوراً اور ہمیشہ کے لئے نکل جاؤ اور اگر آئندہ تم نے یہاں آنے کی کوشش کی تو ۔۔۔

(مسز میڈر اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور میڈر چچا کی نظر اُن پر پڑتی ہے)۔۔۔مم میری بیوی۔۔۔

مسز میڈر (انتہائی نخوت کے ساتھ) ٹھیک ہے جناب، میں آپ کی بات مانے لیتی ہوں اور اس کمرے سے کیا اس گھر سے ہی چلی جاتی ہوں، ابھی اور اسی وقت، ہمیشہ کے لئے (داہنی طرف کے دروازہ نمبر۲ سے باہر نکل جاتی ہیں، میڈر چچا بے حال ہو کر کرسی پر گرتے ہیں اور دھنس کر رہ جاتے ہیں)

میڈر چچا (کراہتی ہوئی آواز میں) میری بیوی۔

مسز کمفرٹ ایں، آپ کی بیوی، خدا کی پناہ، یہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوگئی۔

میڈر چچا اور مجھ سے کیسی غلطی سرزد ہوگئی۔

مسز کمفرٹ مجھے تو بتایا گیا تھا کہ یہ مسز کمفرٹ ہیں، کمفرٹ کی بیوی۔

میڈر چچا ہائے، مین بھی کتنا بدنصیب بندہ ہوں، یہ تو گرینڈ کلائمکس ہوا، اب تک کئے گئے تمام جھگڑوں کا آخری انجام، وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے (بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں) اُسے نہیں جانا چاہیئے، مجھے اُس سے بات کرنی پڑے گی۔ (تیزی سے دروازہ نمبر۲ کی جانب لپکتا ہے لیکن پھر ٹھہر جاتا ہے) لیکن اُسے میری بات پر ہرگز ہرگز یقین نہیں آئے گا۔۔۔اور وہ یقین کرے بھی تو کیوں، خود مجھے اپنی بات پر یقین نہیں آئے ایسے موقع پر۔۔۔

مسز کمفرٹ اوہ چچا جان، مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔

میڈر چچا افسوس تو مجھے بھی ہے لیکن اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں، تمھیں غلط اطلاع دی گئی تھی، خود مجھے دیکھنا چاہیئے تھا کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں، یونہی انھے واہ انٹ شنٹ بولتا گیا لیکن اب کیا ہو، تمھیں میری مدد کرنی ہوگی، چلو ہم دونوں چلتے ہیں اور اُس سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں، شائد وہ سمجھ جائے۔

مسز کمفرٹ لل لیکن چچا جان۔۔۔

میڈر چچا (اُسے بائیں طرف والے دروازہ نمبر۲ کی طرف تقریباً دھکیلتے ہوئے) تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا میری بچی، اُسے میری بات پر یقین نہیں آئے گا۔۔۔چلو (میریکیل صدر دروازے سے داخل ہوتا ہے)

میریکیل سیلی ابھی آتی ہے۔۔۔

میڈر چچا سیلی کو دفع کرو اور ہٹ جاؤ میرے راستے سے، فوراً (میریکیل کو ایک طرف دھکیلتا ہوا مسز کمفرٹ کو لیتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

میریکیل یا وحشت، کیا پتا پڑی ہے اِن بڑے میاں پر کہ اس قدر طوفانی انداز سے کوچ فرمایا ہے اُنہوں نے، ابھی تو سیلی سے گفتگو کرنے کے لئے بیقرار ہو رہے تھے۔(صدر دروازے سے کمفرٹ داخل ہوتا ہے)

کمفرٹ (میڈر چچا کو نہ پا کر اطمینان کا سانس لیتا ہے) ان لوگوں نے تو مجھے پاگل ہی کر کے رکھ دیا تھا اپنی لایعنی باتوں سے۔

میریکیل میرا خیال ہے کہ وہ تمھارا ضمیر ہوگا جس نے تمھیں پاگل بنا رکھا ہوگا۔

کمفرٹ ایں، بھلا وہ کس لئے؟

میریکیل یا پھر ہوسکتا ہے کہ وہ اب تک مر ہی چکا ہو۔

کمفرٹ (خشک مزاجی سے) میریکیل، تم اول درجے کے احمق ہو۔

میریکیل (آہستگی سے) شکریہ۔

کمفرٹ تم نے مجھ سے اکیلے میں ملنے کا کہا تھا، اکیلے میں تم نے اس قدر واہیات باتیں کی ہیں کہ میرے سر میں درد ہوگیا ہے، کس احمق نے تمھیں بتایا ہے کہ میں نے دو دو شادیاں کر رکھی ہیں۔۔اب تم نئی بجھارتیں لے کر بیٹھ گئے ہو، کوئی نیا لطیفہ گھڑ لیا ہے کیا تم نے، اگر ایسا ہے تو نہایت ماٹھا لطیفہ ہے یہ۔۔۔میں سمجھ نہیں پا رہا

ہوں کہ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔

میریکیل لیکن ڈک، تم اس بات سے مطلق انکار نہیں کر سکتے کہ ۔۔۔

کمفرٹ کہ میری دو بیویاں ہیں، میں اس سے صریحاً انکار کروں گا، ارے بھئی جب ایسا ہے ہی نہیں تو میں کیوں نہ انکار کروں۔

میریکیل ظاہر ہے تم نے تو ایسا ہی کہنا ہے۔

کمفرٹ (غصے سے) اور میں ایسا ہی کہتا رہوں گا، میں تمھاری اِن لایعنی باتوں سے ناکوں ناک آچکا ہوں، اور یہ تم نے میری بیوی سے کیوں کہہ دیا تھا کہ۔۔۔

میریکیل تو تم اقرار کرتے ہو کہ تمھاری کوئی بیوی بھی ہے۔

کمفرٹ بالکل ہے، لیکن صرف ایک۔

میریکیل لیکن تم تو اس سے بھی انکاری تھے۔

کمفرٹ اس کی بھی ایک وجہ تھی جس کا تم سے دور کا بھی تعلق نہیں، دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے چچا کو میری شادی کی سُن گن ملے، وہ اس معاملے میں بہت حساس ہیں۔ اب جبکہ اُنہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے بلکہ "سب کچھ" سے بھی کچھ زیادہ معلوم ہو چکا ہے، کیونکہ تم نے اپنی حماقتوں سے اُنہیں یقین دلا دیا ہے کہ میں دو دو شادیوں کے جرم میں ملوث ہوں۔ اور یہ تم نے ایڈتھ سے کس خوشی میں کہہ دیا تھا کہ میں نے دو دو شادیاں کر رکھی ہیں۔

میریکیل ایڈتھ؟ میری تو اُس سے ابھی تک ملاقات ہی نہیں ہوئی ہے۔

کمفرٹ خیر یہ تو تم سچ نہیں بول رہے۔

میریکیل نہیں میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں ڈک، میں تو تمھاری دوسری والی بیوی سے ہی مل پایا ہوں اب تک، میرا مطلب تمھاری ملازمہ سے ہے۔

کمفرٹ وہی تو ایڈتھ ہے، میں اُسے ملازمہ اس لئے کہا تھا تا کہ چچا جان کو پتہ نہ چل جائے کہ میں شادی شدہ ہوں۔

میریکیل ارے۔۔۔ تب تو میں بالکل ہی گھامڑ ہوں۔

کمفرٹ وہ تو تم ہو۔

میریکیل اور میں نے تمھارے چچا جان سے بھی کہہ دیا تھا کہ تم نے دو دو شادیاں کر رکھی ہیں۔

کمفرٹ تبھی میں کہوں کہ وہ ایسی الٹی اُلٹی باتیں کیوں کر رہے ہیں کیونکہ وہ تو اِتنے خر دماغ کبھی بھی نہ رہے تھے، تو یہ بھی تمھاری ہی کارستانی تھی (طنزیہ انداز میں) میریکیل، میں تمھاری تمام تر خرافات پر تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میریکیل لیکن میں نے تمھاری ملازمہ کو، میرا مطلب ہے کہ تمھاری بیوی سے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ تمھاری ایک اور بیوی بھی ہے۔

کمفرٹ تم نے اُس کے سامنے کسی خاتون کا حوالہ دیا تھا، پتہ نہیں کس خاتون کا۔۔۔ اور اُسے مسز کمفرٹ پکارا تھا۔

میریکیل بالکل کہا تھا لیکن میرا ایسا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ تمھاری چچی ہیں، اُنہیں اُن کے خاندانی نام سے پکارا تھا۔

کمفرٹ میری چچی؟ لیکن اس نام سے تو میری کوئی چچی نہیں ہیں، ارے کہیں تمھاری مراد کلیمنٹینہ چچی سے تو نہیں؟

میریکیل نہیں، میری مراد اُس خاتون سے ہیں جو خود کو مسز میڈر کہتی ہیں۔

کمفرٹ ظاہر ہے کہ انھوں نے خود کو مسز میڈر ہی کہنا تھا، یہی اُن کا نام ہے۔

میریکیل لیکن یہ اُن کا اصلی نام تو نہیں ہے ناں۔۔۔ میرا خیال تو تھا کہ وہ خاتون بیگم۔۔۔ خدا کی پناہ، میرا خیال تھا کہ اُن کے شوہر بھی تمھاری طرح کمفرٹ خاندان سے ہوں گے۔

کمفرٹ تمھاری طرح کا چغد بھی زمانے نے کم ہی پیدا کیا ہو

گا، تم بھی اپنی نوعیت کے ہی ایک ہو۔

میریکیل تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھ سے تو واقعی عظیم حماقت سرزد ہوگئی تھی۔

کمفرٹ عظیم سے بھی کچھ بڑھ کر۔۔۔

میریکیل مجھے بہت افسوس ہے یار، مم، میں۔۔۔

کمفرٹ اب میں تمھارے افسوس کا کون سا چورن بناؤں کہ جو اس معمے کو ہضم کرنے میں میری مدد کرے۔ اب میں کیا کروں کہاں جاؤں، اب میری گزر اوقات کیسے ہوگی، چچا جان کے سالانہ الاؤنسز پر میری گزر بسر ہو رہی تھی اور وہ بھی اس شرط پر کہ میں شادی نہیں کروں گا، اب تو اس باب کو بھی ختم سمجھو۔

میریکیل اب تو مجھے بھی لگ رہا ہے کہ تمھارے چچا نے میرے بارے میں بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ میں واقعی تمھارے لئے اچھا دوست ثابت نہیں ہوا ہوں۔

کمفرٹ تم میرے حق میں بہتر ثابت ہوتے اگر ایک دانا دشمن ہوتے۔

میریکیل ایسا نہ کہو ڈک، کم از کم مجھے اپنی نظروں سے اس قدر تو نہ گراؤ، میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔

کمفرٹ ہوئے تم دوست جس کے اُس کا دشمن آسماں کیوں ہو۔۔۔ تم نے تو مجھے تقریباً پاگل کر کے رکھ دیا ہے (میز پر دھرے ہوئے کاغذات پر نظر پڑتی ہے) لو، اب اِسی کو دیکھ لو، میں نے تو اپنی کامیڈی کھیل کو ادھورا ہی چھوڑ رکھا ہے۔۔۔ بالکل ہی فراموش کر بیٹھا ہوں اِسے۔

میریکیل تم نے کسے ادھورا چھوڑ رکھا ہے؟

کمفرٹ کامیڈی کھیل کو، میں ایک ڈرامہ تحریر کر رہا ہوں۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یہ تو واقعی باؤلا ہو چکا ہے۔

کمفرٹ اس کھیل کو آج رات تک مکمل ہو جانا چاہیئے تھا لیکن اب کافی دیر ہوگئی ہے۔ اس کھیل کے دوران میری حقیقی زندگی میں اتنی دخل اندازیاں ہو چکی ہیں کہ اسے مکمل کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر یہ کھیل کامیڈی کی جگہ ٹریجڈی کا ہوتا تو یقیناً میں اس میں اپنے حالات کا مسالہ ڈال لیتا اور اسے شاہکار قسم کا ٹریجڈی کھیل بنا دیتا، جس میں میرا اپنا کردار بنیادی نوعیت کا ہوتا۔

میریکیل یہ سارا کیا دھرا میرا ہے، اور مجھے اپنے کئے پر اس قدر شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ میں بھی اس کے کسی کردار کی طرح زہر کھا کر مر جانا چاہتا ہوں۔

کمفرٹ زہر۔۔۔ ہا، زہر، کیا اس گلاس میں بھی زہر بھرا ہوا ہے؟ (میز سے پانی سے بھرا ہوا گلاس اُٹھاتا ہے، اسی اثناء میں سیلی سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہوتی ہے) (مزید پُرجوش انداز میں) زہر، ایسے حالات اور ایسا زہر، واہ، کیا شاندار موت ہوگی، کتنا سکون ملے گا اسے پی کر، تمام دکھوں اور پریشانیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔۔۔ زہر، میں ابھی یہ سارا گلاس پی جاتا ہوں، غٹاغٹ۔۔۔ (سیلی کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے اور کمفرٹ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ جاتا ہے)

سیلی انہوں نے زہر پی لیا ہے (دوبارہ چیخ مارتی ہے) قتل قتل، مدد مدد۔۔۔ (میریکیل سے) ارے آپ مدد کیوں نہیں کرتے، کسی ستون کی طرح کھڑے ہوئے ہیں وہاں پر، کچھ کریں پلیز، مالکن کہاں ہیں، میں ابھی اُنہیں بتاتی ہوں جا کر۔۔۔ (سیلی داہنی طرف والے دروازہ نمبر ۲ سے باہر نکل جاتی ہے)

میریکیل یہ چغد سمجھتی ہے کہ تم نے زہر پی لیا ہے۔ (کمفرٹ گلاس اُٹھانے کے لئے جھکتا ہے)

(مسز کمفرٹ اور سیلی دروازہ نمبر ۲ سے داخل ہوتی ہیں)

سیلی یہ رہے کمفرٹ صاحب جناب، سارا زہر پی لیا ہے

انہوں نے۔

مسزکمفرٹ (بھاگتی ہوئی کمفرٹ کی طرف جاتی ہے) اوہ ڈک، یہ تم نے کیا کر دیا، کیوں کیا تم نے ایسا؟ یہ سب میرا قصور ہے ہے، میں۔۔۔ میں۔۔۔

کمفرٹ لیکن ایڈتھ میں نے۔۔۔

مسزکمفرٹ بولنے کی کوشش مت کرو اس سے تم مزید متاثر ہو جاؤ گے، یہاں بیٹھ جاؤ، اس کرسی پر (اُسے کرسی کی طرف دھکیلتی ہے) جلدی سے، کوئی پانی تو لا دے، جلدی سے۔۔۔

کمفرٹ نہیں، کوئی ضرورت نہیں ہے پانی کی، اب اور نہیں پینا میں نے پانی۔۔۔ میں بتا رہا ہوں کہ۔۔۔

مسزکمفرٹ تم مر جاؤ گے۔

کمفرٹ نہیں، میں نے نہیں مرنا۔۔۔

مسزکمفرٹ پلیز ڈک، میں تم سے منت کرتی ہوں، زندہ رہو، پلیز، میری خاطر۔۔۔

کمفرٹ ایسی کوئی بات نہیں ہے ایڈتھ، میرا فی الحال مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

مسزکمفرٹ اٹھو نہیں، پلیز اٹھو نہیں، اُس وقت تک مت اٹھو جب تک بالکل ٹھیک نہ ہو جاؤ (جھکتے ہوئے) ڈک، پلیز مجھے معاف کر دو۔۔۔

کمفرٹ معاف کر دوں، لیکن کیا کیا ہے تم نے؟

مسزکمفرٹ میں نے تمھیں بالکل غلط سمجھا، کتنی بے رحمی کا سلوک کیا ہے تمھارے ساتھ، تم پر شبہ کیا، تمھارے جیسے شخص پر شبہ، خدا کی پناہ، پلیز ڈک، مجھے معاف کر دو۔۔۔

کمفرٹ نہیں ایڈتھ، تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے جس کی تمھیں معافی مانگنی پڑے (دائیں طرف والے دروازہ نمبر ۲ سے میڈر چچا اور مسز میڈر اندر داخل ہوتے ہیں) لل۔۔۔ لیکن کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟

مسزکمفرٹ آ آپ پ نے کیا کیا ہے؟

کمفرٹ ہر وہ برا کام کیا ہے جو کر سکتا تھا۔ میں نے انتہائی بزدلی کا ثبوت دیا ہے، میں اِتنا بزدل تھا کہ چچا جان کو یہ بھی بتانے کی ہمت نہیں کر پایا کہ تم میری بیوی ہو، ایسا نہیں ہے کہ مجھے تمھیں بیوی کہتے ہوئے کسی قسم کی کوئی شرمساری لاحق تھی، نہیں، ہرگز نہیں، مجھے صرف اور صرف چچا جان کے غصے کا خوف تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ اُنھیں پتہ چل جائے کہ میں شادی شدہ ہوں۔

مسزکمفرٹ لیکن یہ سب میری خاطر ہی تو تھا۔

کمفرٹ ہاں، تھا تو تمھاری خاطر ہی لیکن بر حال میں نے بزدلی کا ثبوت تو دیا تھا، کاش میں تم سے اُسی وقت سب کچھ بتا دیتا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔

مسزکمفرٹ چھوڑو بھی ڈک، اب اسے جانے بھی دو۔ اب تو سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔

کمفرٹ ہاں ایڈتھ، اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ بس یہ ہے کہ اب مجھے کوئی ملازمت ڈھونڈنا ہو گی تا کہ میں تمھاری کفالت سے عہدہ برا ہو سکوں۔ شائد یہ ڈرامہ جو میں لکھ رہا ہوں، اس سے مجھے کچھ خاطر خواہ رقم مل جائے۔ اب مجھے توقع نہیں ہے کہ چچا جان۔۔۔

میڈر چچا (آگے بڑھتے ہوئے) نہیں رچرڈ، اب تمھیں مجھ سے کچھ نہیں ملنے والا۔ میں تمھیں اس بات کا الزام نہیں دے رہا ہوں کہ تم نے اس لڑکی سے شادی کیوں کی، یہ تو ہیرا ہے ہیرا۔۔۔ قسم سے، اگر تم نے اس سے شادی نہ کی ہوتی تو میں خود کر لیتا۔

مسزمیڈر ارے!

میڈر چچا مم میرا کہنے کا مطلب ہے کہ اگر میں تم جیسی نفیس خاتون سے پہلے اس سے ملا ہوتا تو۔۔۔ (کمفرٹ سے) لیکن رچرڈ، مجھے تم سے شکایت ہے کہ تم اپنی بیوی پر قطعاً بھروسہ نہیں کرتے اور اس سے اپنے مسائل کا اشتراک نہیں کرتے، اور جہاں تک تمھاری اس بات کا تعلق ہے کہ اب تمھیں مجھ سے کسی قسم کی

مالی امداد کی توقع نہیں رہی تو تم غلطی پر ہو، ہاتھ ملاؤ رچرڈ! (اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے) میں تمھیں معاف کرتا ہوں، دل کی گہرائی سے معاف کرتا ہوں۔

کمفرٹ جی۔۔۔کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟

میڈر چچا ہاں، ایسا بھی ہوسکتا ہے لیکن صرف اور صرف تمھاری بیوی کی خاطر۔

کمفرٹ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں، مجھے توقع نہیں تھی کہ۔۔۔

میڈر چچا اگر معاملہ تمھارا ہوتا تو شائد میں تمھیں معاف نہیں کرتا۔

مسز میڈر تمھاری بیوی تمھارے لئے ایک رحمت سے کم نہیں رچرڈ!

کمفرٹ مجھے پہلے ہی پتہ تھا اور اب تو ثابت بھی ہوگیا ہے۔

میریکیل مسز میڈر، میں سوچتا ہوں کہ۔۔۔

میڈر چچا میں تمھیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں نوجوان، اور وہ یہ ہے کہ تم سوچا نہ کرو، کم از کم تمھاری حد تک یہ ایک بہت بُری عادت ہے۔ اور رچرڈ، یاد رکھو، ڈرامہ نویسی سے اتنی رقم حاصل نہیں ہوتی کہ جس سے زندگی سہل انداز سے گزر سکے جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری زندگی خوشیوں سے بھرپور ہو۔ تم اپنی خوشی اور طمانیت کے لئے ضرور ڈرامے لکھو لیکن جہاں تک مصارفِ حیات کا تعلق ہے تو اس کے لئے تم اپنے اس چچا پر کُلی تکیہ کر سکتے ہو۔ میں ہر قدم پر تمھارے ساتھ ہوں۔ (کمفرٹ فرطِ انبساط سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)۔

چوکے ہی چوکے

ارمغانِ ابتسام

ہنساؤ ، ہنسو ، قہقہے بھی لگاؤ
نیا آ گیا "ارمغانِ تبسم"
پڑھا جب اِسے، گدگدی ہورہی ہے
رگوں میں رواں کاروانِ تبسم

تنویر پھولؔ

پیر جی

باغی مرید بولا ، عجب ہیں یہ پیر جی!
بارِ مریدی ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا
غصے میں اُن کی آنکھیں ہیں شعلے اگل رہی
"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

تنویر پھولؔ

الیکشن

شرمندہ ہم ہیں تجھ سے، پیارے وطن کے پرچم!
ہیں دیکھتے تماشا ، اہلِ جہاں ہمارا
ہوتا ہے جب الیکشن ، چنتے ہیں ڈاکوؤں کو
"سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا"

تنویر پھولؔ

پانامہ لیکس

ہے بے وقوف قوم مگر اتنی بھی نہیں !
کہتا نہیں ہے کوئی بھی باتیں یہ بے سبب
ہے لیڈروں کے پیٹ میں گڑبڑ مچی ہوئی
"پانامہ لیکس" بن گیا "پاجامہ لیکس" اب

تنویر پھولؔ

ساقی

پیٹ اپنا خراب ہے ساقی!
ہم نے کھایا کباب ہے ساقی!
تو نے ہے مے میں کیا ملاوٹ کی؟
کس لئے آب آب ہے ساقی؟

تنویر پھولؔ

الیکشن

ایمان چلا جائے تو عزت نہیں رہتی
حیرت کو بھی پھر تو کوئی حیرت نہیں رہتی
جو قوم شب و روز بنے فول مزے سے
اس کو یکم اپریل کی حاجت نہیں رہتی

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

خالد عرفان کے نام

کوششیں آپ بھی کر لیجئے جتنی چاہے
پر چلیں گے نہ کبھی چین کے جاپان کے فین
داد کے جھونکوں سے گرمی یہاں کم ہوتی ہے
اب تو کام آتے ہیں بس خالدِ عرفان کے

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

آپریشن تھیٹر میں

"میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں"
مریضِ سرجری کے لب پہ تھے یہ افسانے
یہ ڈاکٹر ہیں کہ ڈاکو تمیز مشکل ہے
"نقاب پوش پھریں ہیں پہن کے دستانے"

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

پری

ہمت بندھائی اُس نے بڑھے اپنے حوصلے
تعریفِ حُسن کرنے ہم اُس کے قریں چلے
اچھائی کا مگر وہ زمانہ کہاں رہا
ہم نے کہا پری تو وہ بولی "پرے پرے"

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

گیس

ماہرِ امراضِ معدہ ایک دن کہنے لگا
جس کو دیکھو گیس کے آزار میں ہے مبتلا
مُلک میں ہے گیس کی قلّت کا چرچا ان دنوں
استفادہ کیوں نہیں کرتا کوئی ان سے بھلا

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

کمربستہ

کروں کیا منکشف اب آپ پر یہ رازِ سربستہ
کلاس اوّل میں اِک من کا اُٹھاتا تھا پسر بستہ
جھکی اس کی کمر، بھاری تھا اس کا اسقدر بستہ
مرا بچہ ہوا تعلیم پر ایسے کمربستہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

میں

انا پرستی کی حد ہوگئی کہ اب ہم لوگ
کسی کو جانتے ہیں اور نہ کچھ سمجھتے ہیں
ہے گرچہ صورتِ انساں، صدا ہے بکری کی
جسے بھی دیکھو وہی کر رہا ہے "مَیں مَیں مَیں"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

زردہ

ہے لت پڑی ہوئی کہ کروں ایک کو میں دو
دولت کا شوق ہے میں کماتا ہوں اس لئے
میٹھے کا کوئی شوق نہیں ہے مجھے جناب
زردہ میں زر ہے دس دفعہ، کھاتا ہوں اس لئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پہلے اور بعد میں

ایک سے پاگل تھے دونوں میں نے پوچھا کون ہیں؟
ڈاکٹر بولا ہوا یہ حال بربادی کے بعد
ایک مجنوں ہوگیا جب "ش" کی شادی ہوئی
ایک دیوانہ ہوا ہے "ش" سے شادی کے بعد

امجد علی راجا

اچھا شوہر

جی جان سے بیوی کی جو خدمت نہیں کرتا
سسرال میں اس کی کوئی عزت نہیں کرتا
شوہر وہی اچھا ہے زمانے کی نظر میں
"جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا"

امجد علی راجا

وہ

اس کی عادت سی ہے لڑکوں سے شرارت کرنا
اس نے ویسے ہی کہیں آنکھ لڑائی ہوگی
چھوڑ دے گی وہ کسی اور کی خاطر مجھ کو
"یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی"

امجد علی راجا

دھوکے کھایئے

عقل بڑھ جاتی ہے دھوکے کھانے سے انسان کی
صاحبِ دولت ہوں یا مزدور، دھوکے کھایئے
فلسفہ گہرا ہے اس کا عقل کی یہ بات ہے
سیب ہو، امرود یا انگور دھو کے کھایئے

امجد علی راجا

---تو کیا نام نہ ہوگا

قائم ہے کرپشن کے طفیل اپنی حکومت
میرٹ پہ کسی طور کوئی کام نہ ہوگا
لعنت بھی اگر قوم سے ملتی ہے تو کیا غم
"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

امجد علی راجا

چور

بڑا بیٹا ہے MA، منجھلا ہے MBA میرا
مگر افسوس چھوٹا چور ہے، ہر شے چراتا ہے
اسے گھر سے نکالوں بھی تو کیونکر، مسئلہ یہ ہے
بڑے بیکار پھرتے ہیں وہی تو گھر چلاتا ہے

امجد علی راجا

خوش فہمیاں

مجھ کو کسی نے "فُول" بنایا تھا دوستو!
ویسے تو باشعور ہوں، جاذِب ادا ہوں میں
اپریل کی یکم، کو ہُوا تھا مرا نکاح
کیسے مجھے یقین ہو شادی شدہ ہُوں میں؟

عبدالحکیم ناصف

انکشاف

شاعری بھی ہے ایک مزدوری
یہ بھی سریا، سمنٹ، ریتی ہے
جب کہ بیگم ہے اینٹ غزلوں کی
داد اولاد لاد دیتی ہے!

عبدالحکیم ناصف

F.B. Language

"پکس" دینا "پرائیویسی" میں
"آن پبلک" یہ "سینڈ" مَت کرنا!
تُم کو کرتا ہُوں میں بہت "لائک"
تُم مجھے "اَن فرینڈ" مَت کرنا!

عبدالحکیم ناصف

ہوائی جہاز میں مکالمہ

ہر مسافر کی طرف جاؤ نہ بھاگی بھاگی
کیا ''ایر بس'' ہے ''ٹھرک'' اِنکی مٹانے کے لیے؟
''پائلٹ'' سے یہ ''ایر ہوسٹسیں'' کہنے لگیں
''ہم تو چلتیں ہیں تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے''

عبدالحکیم ناصف

شاعرہ

لپک لیتے ہیں ہر اک شاعرہ کو سارے کنوینر
کبھی معروف اردو انجمن ان کو بلاتی ہیں
ہمیں تو چھ کتابوں پر کوئی شاعر نہیں کہتا
یہ بس دو تین غزلوں پر کناڈا گھوم آتی ہیں

احمد علوی

نسل در نسل

خدا کا فضل ہے یہ خاندانی کام ہے اپنا
وہیں بنیان دھلتا تھا چچا دھوبن کے عاشق تھے
اگر ہم عشق میں پاگل ہوئے ہیں کیٹرینا کے
ہمارے قبلہ و کعبہ بھی تو ہیلن کے عاشق تھے

احمد علوی

قرض

کبھی نہ ڈھونڈھ پائے گی پولس کیا سی بی آئی بھی
زمین و آسماں سے اس طرح ہو جائیں گے غائب
عزیز و اقربا کے ساتھ بس اک کام کرنا ہے
ضرورت میں انہیں کچھ قرض دیدیجے فقط صاحب

احمد علوی

من کی بات

جھوٹے وعدوں پر بھی شرمندہ نہیں
جو نہیں سنتا کسی کے من کی بات
حال و مستقبل ہے اس کے ہاتھ میں
جو نہیں سنتا کسی کے من کی بات

احمد علوی

اب

اب ہیں وصال یار کے کتنے ہی راستے
ہم نیٹ پر ہیں شب کو شبستاں کیے ہوئے
اب دور وہ نہیں رہا علوی تمام رات
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

احمد علوی

انجم عثمانی

قد کے بونے ہو بھوتانی لگتے ہو
جانے کس کس کی نادانی لگتے ہو
اے ٹی ایم بتاتے ہو خاتونوں کو
سو فی صد انجم عثمانی لگتا ہو

احمد علوی

ضرورت

روپ بہروپ کی ضرورت ہے
جوس کی، سوپ کی ضرورت ہے
آپ تو گوری چمڑی والے ہیں
آپ کو دھوپ کی ضرورت ہے

شاہین فصیح ربانی

سیاست

غرض کا کھیل کھیلا جا رہا ہے
کسی کو پھر دھکیلا جا رہا ہے
سیاست کی کوئی تو انتہا ہو
لگا جو ہاتھ پیلا جا رہا ہے

انجینئر عتیق الرحمٰن

آزادیٔ صحافت

ہے ملک میں اس وقت کرپشن، بڑی لعنت
آزاد صحافت ہے کرپشن سے حفاظت
چھڑنا ہے ترقی کا اگر تم کو یہ زینہ
لازم ہے کرو ملک میں آزاد صحافت

انجینئر عتیق الرحمٰن

شیطان

اس دور میں مشکل ہوئی انسان کی پہچان
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے یہ انسان
ہے روپ بدلنے میں یہ استادوں کا استاد
لگتا ہے فرشتہ مگر اندر سے ہے شیطان

انجینئر عتیق الرحمٰن

لیکس

لیکس نے کر دی نئی آفت کھڑی
چل رہی ہے دم بدم ٹک ٹک گھڑی
الٹی گنتی ہو گئی آخر شروع
دیکھیں کرتی ہے اشارہ کیا چھڑی

انجینئر عتیق الرحمٰن

صداقت حسین ساجد

سوالنامے کا کمال

وہ شہر کا مشہور ہسپتال تھا جس کے استقبالیہ پر ایک نرس سفید کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر سے بے کار بیٹھی تھی، اس لیے اس پر سستی طاری تھی اور وہ بار بار جمائیاں لے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

''اُف خدایا! یہ بوریت تو مجھے پاگل کر دے گی۔۔۔ اب تک کوئی بھی ایسا نہیں آیا جسے پاگل کتے نے کاٹا ہو۔۔۔ اگر کوئی آ جاتا، تو میں کم سے کم اس سے باتیں ہی کر لیتی۔۔۔ میری سہیلی کی ملازمت کتنی دل چسپ ہے کہ صبح سے رات گئے تک مریضوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔۔۔ ایک میں ہوں کہ اتنے بڑے شہر کے اتنے مشہور ہسپتال میں بیٹھی بور ہو رہی ہوں۔۔۔ ابھی تک کسی پاگل کتے نے کسی انسان کو نہیں کاٹا ہے۔''

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس کی طرف بڑھا۔

''مس! بات یہ ہے کہ۔۔۔''

''جی۔۔۔ جی! فرمائیے۔۔۔ کیا بات ہے؟''

''کل میں ایک دوست کے گھر گیا تھا۔''

''تو اس میں کیا خاص بات ہے؟۔۔۔ لوگ اپنے دوستوں کے گھر جاتے ہی رہتے ہیں۔''

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ایک کتا پال رکھا ہے۔۔۔''

''اچھا! تو میں اب سمجھی کہ اس کتے نے آپ کو کاٹ لیا ہے۔۔۔ لیجیے! یہ سوال نامہ پر کر دیں۔''

یہ کہہ کر نرس نے میز کے دراز میں سے ایک کافی لمبا سا فارم نکالا۔ یہ فارم کئی صفحوں پر مشتمل تھا۔ اِتنا بڑا فارم دیکھ کر اس شخص کے چھکے چھوٹ گئے۔

''اف! اگر میں یہ فارم مکمل کرنے بیٹھ گیا، تو مجھے دفتر سے دیر ہو جائے گی۔۔۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھے صرف ایک ٹیکا لگا کر فارغ کر دیں؟''

''جی نہیں۔۔۔ یہ ممکن نہیں۔۔۔ آپ اپنا نام بتائیے؟''

''نعیم شامی''

''مسٹر نعیم! آپ کو کس نے کاٹا ہے؟''

''ٹامی نے!''

''یہ آپ کے کسی رشتے دار کا نام ہے؟''

''نرس! تمیز سے بات کریں۔۔۔ ٹامی کتا ہے اور میں اشرف المخلوق یعنی انسان ہوں۔''

''سوری! آپ مجھے انسان ہی دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔

اصل میں شامی اور نامی ملتے جلتے نام ہیں ناں! اس لیے غلطی ہو گئی ہے۔۔۔اچھا! یہ بتائیے کہ آپ کا پیشہ کیا ہے؟"

"منیجر۔۔۔"

"کس کمپنی میں؟"

"نیشنل بنک میں"

"کون سا بنک؟"

"نیشنل بنک"

"کیا۔۔۔کون سا بنک؟"

"نیشنل بنک"

"نیشنل۔۔۔کیا؟"

"نیشنل بنک۔۔۔نیشنل بنک۔۔۔نیشنل بنک۔۔۔نیشنل بنک۔۔۔" نعیم شامی جھلا کر چیخ پڑا۔

"ہاں۔۔۔تو مسٹر شامی! آپ کو میرے سوالوں کی سمجھ آرہی ہے؟"

"ہاں۔۔۔لیکن کیا آپ میرے جوابات کو سمجھ رہی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔"

"تو اس کے باوجود بھی آپ لکھتی جا رہی ہیں؟"

"آپ کو اس بارے میں ذرا بھر بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔۔۔صرف میرے سوالوں کا جواب دیجیے۔۔۔اس پہلے بھی آپ کو کسی جانور نے کاٹا تھا؟"

"اگر میرا جواب ہاں میں ہو، تو پھر؟"

"یہ بتائیے! کس نے کاٹا تھا؟"

"مجھے کھٹمل کاٹتے رہتے ہیں۔"

"میں ان کی بات نہیں کر رہی۔۔۔کسی جانور نے آپ کو کبھی کاٹا ہے؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"ہو سکتا ہے۔۔۔انھیں میرا ذائقہ پسند نہ آیا ہو۔۔۔ہو سکتا ہے۔۔۔انھیں بھوک ہی نہ لگی ہو!!"

"اچھا! یہ بتائیے۔۔۔آپ کی بہنیں ہیں؟"

کس کے دیکھے سے یوں آجاتی ہے منہ پر رونق؟

’’نہیں!‘‘

’’بھائی؟‘‘

’’نہیں!!‘‘

’’کیا انھیں کبھی کسی نے نہیں کاٹا؟‘‘

’’کیا فضول سوال ہے۔۔۔جب بہن بھائی ہیں ہی نہیں، تو انھیں کاٹتا کون؟‘‘

’’دیکھئے! آپ میرے سوالوں کے جواب بدتمیزی سے دے رہے ہیں۔۔۔اگر آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا، تو مجھے مجبوراً ہسپتال کے ملازموں کو زحمت دینا پڑے گی کہ وہ آپ کو آکر رسیوں سے باندھ دیں گے۔۔۔کیا آپ کے والدین کو کسی نے کاٹا تھا؟‘‘

’’اوہ۔۔۔میرے خدایا! ان کو کاٹنے کی ہمت کون کر سکتا تھا؟‘‘

’’میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔شاید ان کے کسی دوست۔۔۔‘‘

’’دوستوں کے بارے میں آپ کا اندازہ درست نہیں‘‘

’’میں کہتی ہوں کہ میرے سوالوں کے جواب دیں۔۔۔آپ کو کس جانور نے کاٹا ہے؟‘‘

’’ایک پلے نے۔۔۔میں یہ بات پہلے بھی بتا چکا ہوں۔‘‘

’’سرکاری زبان میں پلے نام کوئی جانور موجود نہیں!‘‘

’’اوہ۔۔۔اسے کتا کہہ لو۔۔۔پلا، کتے کا بچہ ہی ہوتا ہے۔‘‘

’’وہ نر تھا یا مادہ؟‘‘

’’کتیا!‘‘

’’یہ کیا بکواس ہے؟ تمیز سے بات کرو۔‘‘

’’میں کتیا کو کتا کیسے کہوں؟ وہ کتیا ہی تھی۔‘‘

’’اوہ۔۔۔تم پاگل ہو۔۔۔دیوانے ہو۔۔۔مجھے ملازم بلانے ہی پڑیں گے!‘‘

’’پاگل تم آپ ہو۔۔۔تم کسی دیوانے کتے کی کاٹی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔‘‘

’’بکواس مت کرو۔۔۔میں یہاں تین سال سے کام کر رہی ہوں اور آج تک مجھے کسی نے نہیں کاٹا۔‘‘

نعیم شامی نرس کی طرف تیزی سے بڑھا اور وحشت بھرے لہجے میں سرگوشی کرنے لگا۔

’’اگر تمھیں آج تک کسی نے نہیں کاٹا، تو آج میں ضرور کاٹوں گا۔۔۔تم پر لعنت ہو!!‘‘

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس پر جھپٹا۔اس کے منہ سے غرانے کی آوازیں نکلنے لگیں۔

نرس چلاتے ہوئے وہاں سے نکل بھاگی۔

’’اوہ۔۔۔اوہ! اس پر پاگل کتے کا اثر جلد ہو گیا ہے۔‘‘

نعیم شامی جنون کے عالم میں کمرے میں موجود ہر چیز کو توڑنے پھوڑنے لگا۔میز کرسی الٹ دی، کاغذات پھاڑ ڈالے اور پھر وہ باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نرس نے کمرے میں جھانکا، تو اسے ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی دکھائی دی۔

’’شکر ہے۔۔۔وہ بھاگ گیا۔۔۔مجھے یہی امید تھی۔۔۔اب وہ بازاروں میں دیوانوں کی مانند وہاں موجود لوگوں کو کاٹنے کی کوشش کر رہا ہوگا اور دکانوں کا سامان توڑ پھوڑ چکا ہوگا۔‘‘

پھر اس نے تیزی سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔جب رابطہ ہوا، تو تیزی سے کہنے لگی۔

’’ہیلو۔۔۔ہیلو۔۔۔ایمبولینس سروس پلیز! سنیے۔۔۔یہ ہنگامی صورت حال ہے۔۔۔ایک دیوانے کتے نے ایک آدمی کو کاٹ لیا ہے اور اب وہ شخص بازار کی طرف بھاگ گیا ہے۔۔۔ہاں۔۔۔! وہ لوگوں کو کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔کیا۔۔۔؟ جی نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔وہ مجھے کیسے کاٹ سکتا تھا؟ نہیں۔۔۔جی! یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔۔۔ہم لوگ ایسے مریضوں سے نبٹنے کا طریقہ اچھی طرح جانتے ہیں۔۔۔آپ کو معلوم ہے ناں۔۔۔! ہم تو تربیت یافتہ نرسیں ہیں۔۔۔ہاں۔۔۔! ہم تو انھیں پانچ منٹ میں پاگل بنا کر کمرے سے نکل کر بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔۔۔ہاں۔۔۔! آپ کو معلوم ہے ناں۔۔۔! اس کام کے لیے تو ایک عدد سوال نامہ ہی بہت ہے۔۔۔‘‘

ابنِ منیب

سوبا ہوا محل

گاؤں والے سخت تنگ آ چکے تھے۔ ڈاکو دن دیہاڑے آتے اور کسی کو بھی لوٹ کر چلتے بنتے۔ مریض کلینک کے باہر "بند ہے" کا بورڈ دیکھ کر واپس چلے آتے۔ بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ سرکاری اہلکار کٹائی کے وقت گاؤں آتے اور شاہی حکمنامہ دکھا کر دو تہائی فصلیں قبضے میں کر لیتے۔ اگر کبھی کچھ لوگ ہمت کر کے اِن سے مشکل حالات کی شکایت کرتے تو یہ اہلکار اُنہیں ایک بار پھر شاہی حکمنامہ دکھا کر کہتے کہ وہ صرف لگان اکٹھی کرنے پر مامور ہے۔ اِن اہلکاروں کی نقل و حرکت اور اِن کا کام بھی عجیب تھے۔ نہ جانے کہاں سے عین کٹائی کے وقت یہ گاؤں پہنچ جاتے اور پھر اگلی کٹائی تک دوبارہ نظر نہ آتے۔ لگان میں لی ہوئی فصلوں کو بیل گاڑیوں پر لاد کر گاؤں کے قریبی دریا تک لے جاتے اور وہاں بڑے بڑے لکڑی کے جڑے ہوئے تختوں پر رکھ کر دریا کے بہاؤ پر روانہ کر دیتے۔ یہ دریا آگے کہاں تک جاتا تھا، گاؤں والوں کو ٹھیک طرح سے معلوم نہیں تھا۔ کچھ بوڑھوں کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے اپنی جوانی میں اِس دریا کے ساتھ ساتھ کئی دن تک سفر کیا ہے۔ اور یہ کہ گاؤں سے کم از کم پانچ دن کی مسافت پر یہ دریا چار چھوٹے دریاؤں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور وہ دریا کہاں جاتے ہیں؟ یہ جاننے کی کوشش کسی نے کبھی نہیں کی تھی۔ صرف اتنا کہا جاتا تھا کہ اِن چار دریاؤں پر ایک طلسماتی اور قدرے خوفناک سی دھند چھائی رہتی ہے۔ چوپال میں جب کبھی اِن دریاؤں کا ذکر آتا تو گاؤں کا دیوانہ اچانک ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ناچنے لگتا۔ طرح طرح کے منہ بناتا اور انگوٹھا بند کر کے ہاتھ کی چار اُنگلیاں ہوا میں لہراتا۔ پھر ایک ایک انگلی بند کرتا اور کچھ عجیب سے الفاظ بکتا، جیسے دریاؤں کے نام گنوا رہا ہو۔

"سوئٹزرلینڈ، لندن، دبئی، ڈیفینس"

گاؤں والوں کو یقین تھا کہ یہ نام اُس کے مفلوج ذہن کی پیداوار ہیں اور بالکل بے معنی ہیں۔ دیوانہ تو خیر دیوانہ تھا، مگر اب حالات کے ہاتھوں گاؤں والے بھی پاگل ہوتے جا رہے تھے۔ بالآخر پنچائت نے طے کیا کہ گاؤں کے پانچ نوجوانوں کو بادشاہ کے دربار میں بھیجا جائے گا۔ مگر یہ کام اِتنا آسان نہیں تھا۔ پہلا اور سب سے اہم مسئلہ تو یہ تھا کہ اُن میں سے کسی نے بھی دارالحکومت اور بادشاہ کا محل نہیں دیکھے تھے۔ پھر اُنہیں اِس بات کا بھی ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ دربار میں اپنی شکایات کیسے پیش کی جاتی ہیں، یا پیش کی بھی جا سکتی ہیں یا نہیں؟ (گاؤں میں رعایا کے حقوق کے بارے میں کبھی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔ اور جس دور میں کچھ عرصے

تک گاؤں کا اسکول چلتا رہا تھا وہاں بچوں کو طوطا مینا کی کہانیاں ہی پڑھائی جاتی تھیں، جنھیں بچے لفظ بہ لفظ یاد کر لیتے اور بغیر توجہ دیئے لفظ بہ لفظ سُنا دیتے)۔ چار و ناچار اُنھوں نے گاؤں کے نجومی سے راستے کا اندازہ لگوایا اور نوجوانوں کو اِس راستے پر روانہ کر دیا۔ نجومی نے اُنہیں دو اہم نشانیاں بتائی تھیں، چار دریا اور دورنگا پہاڑ۔ سفر کے پہلے حصے میں اُنہیں دریا کے ساتھ ساتھ گاؤں سے مغرب کی طرف چلتے جانا تھا۔ جب چار یا پانچ دن کی مسافت کے بعد دریا چھوٹے چھوٹے چار دریاؤں میں تقسیم ہوتا نظر آئے تو اُنہیں عین بائیں یعنی جنوب کی جانب مُڑ کر ناک کی سیدھ میں سفر کرنا تھا، یہاں تک کہ اُنہیں دورنگا پہاڑ نظر آ جائے۔ نجومی کا دعویٰ تھا کہ پہاڑ سے آگے اُنہیں محل کا راستہ خود مل جائے گا۔ اور ہُوا بھی ایسا ہی۔ چار دریاؤں کے پھوٹنے کے مقام پر نوجوان بائیں مُڑے اور مزید تین دِن کے سفر کے بعد دو رنگے پہاڑ تک پہنچ گئے۔ یہ وسیع و عریض پہاڑ بھی ایک عجیب معمہ تھا۔ جس جانب سے وہ اِس تک پہنچے تھے وہ بالکل بنجر اور ویران تھی۔ جبکہ اِسکا عقبی رُخ (جو پوری طرح چوٹی پر چڑھ کر نظر آتا تھا) کسی عظیم الشان باغ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پہاڑ کے اِس رُخ پر موجود خوبصورت درخت اور بوٹے پہاڑ کے دامن پر ختم نہیں ہوتے تھے بلکہ تاحدِ نگاہ ایک جنت نظیر میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اِسی سر سبز میدان میں پہاڑ سے بہت دور بادلوں اور دھند میں گھرے ہوئے بلند و بالا میناروں کی ہلکی سی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ یہی بادشاہ کا محل تھا۔ نوجوان اِن میناروں کی جانب سفر کرتے ہوئے بالآخر محل کے قریب پہنچ گئے۔ اب اُنہیں پورا محل اپنی مکمل شان و شوکت میں نظر آ رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُنہیں ایک مشکل درپیش تھی۔ محل کے چاروں طرف ایک گہری خندق کھدی ہوئی تھی جس میں نصف گہرائی تک پانی چل رہا تھا۔ اِس خندق پر ایک ہی پُل تھا جو محل کے بڑے دروازے تک جاتا تھا۔ پُل کا داخلی کنارہ ایک بھاری زنجیر سے بند کر دیا گیا تھا اور اِس کی ایک جانب ایستادہ ایک قدرے چوڑی اور قدِ آدم سے اونچی سنگِ مرمر کی سِل پر شاہی حکمنامہ درج تھا ’’یہاں سے آگے جانا منع ہے۔ بادشاہ سلامت اور اُن کے وزیر پانچ سال کے لئے سو رہے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی مشکل درپیش ہے تو بالکل فکر نہ کریں، پانچ سال بعد بادشاہ سلامت خود آپ کے گھر پر حاضر ہو کر آپ کی دادرسی کریں گے۔‘‘

میں نے اتنی اچھی سیٹنگ کی ہے لیکن وہ نوٹس ہی نہیں لے رہے ہیں!

حنیف سید

چمچے اسٹیبل کے

پاگل ہے دنیا۔ دنیا نہیں، تو میں۔ میں نہیں، تو وہ؛ یعنی کہ میری بیوی، رجنی۔ ہم تینوں میں، ہے ضرور کوئی پاگل۔ تینوں بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ تو فلاسفرز کا کہنا ہے اور ڈاکٹرز کا بھی "دنیا کا ہر شخص پاگل ہے۔ کوئی کم تو کوئی زیادہ۔"

میں نے جب اپنے الیکشن کی کنویسنگ میں ڈائس پر کہا "امریکا وغیرہ تو چاند پر پہنچے، ہماری سرکار بنی، تو سورج پر جائیں گے، ہم۔ وہاں بھی جیون ہے۔" اتنا کہنا تھا کہ ٹماٹروں کی بارش ہونے لگی اور مجھ کو دُم دبا کر بھاگنا پڑا، ڈائس سے۔

بس اُسی دن سے سمجھ گیا کہ دنیا پاگل ہے۔۔۔اور جاہل بھی۔ اِس کو اتنا تک نہیں پتا کہ سورج پر بھی جیون ہے۔ اگر ہم سمندر میں نہ اُترے ہوتے، تو کیا تصور کر سکتے تھے کہ پانی کے اندر بھی جیون ہو سکتا ہے اور اگر پانی کے اندر جیون ہو سکتا ہے، ہوا میں جیون ہو سکتا ہے، مٹی کے اندر جیون ہو سکتا ہے تو آگ میں کیوں نہیں؟ یعنی کہ سورج میں۔ اور پھر لغت تو چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ آتش پرستوں کے آتش کدوں میں چوہوں جیسی شکل کے کیڑے پائے جاتے ہیں جن کو سمندر کہتے ہیں جو صرف آگ کھاتے ہیں اور آگ سے باہر نکلنے پر مر جاتے ہیں۔ اِس کے متعلق حالی نے بھی کہا ہے:

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اُس کے جینے کا پھر نہیں مقدور

جب اُن چھوٹے چھوٹے آتش کدوں میں سمندر ہیں تو سورج میں تو کروڑوں برسوں سے آگ دہک رہی ہے، وہاں نہ جانے کتنے طرح کے جیودھاری ہوں گے اور آکسیجن تو ہے ہی وہاں۔ کیوں کہ آکسیجن کے بنا آگ ہونا ممکن نہیں، آکسیجن ہے جہاں، جیون ہے وہاں۔ بس اُسی روز سے لوگ پاگل کہنے لگے مجھ کو اور میری بیوی نے لاکھوں ووٹوں سے مجھ کو ہرا کر الیکشن نکال لیا۔ حالانکہ پاگل تو وہ تھی، پوری طرح۔ اَب سے نہیں، بچپن سے۔

جب مجھے زیادہ تر لوگ پاگل کہنے لگے، تو مجھے خود پر شک ہوا اور میں فوراً پی۔ جی۔ آئی۔ جا پہنچا۔ پہلے تو نیورسرجن اور مریضوں کے درمیان کی گفتگو سنتا رہا۔ جب میرا نمبر آیا، تو میں نے نیورسرجن سے فلاسفرز اور ڈاکٹرز والی بات دُہرا دی۔

"تو کیا، میں بھی پاگل ہوں۔؟" نیورسرجن سنجیدہ ہو گیا۔

"جی ہاں....!" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"وہ کیسے....؟" اُس کے تیور چڑھ گئے۔

"میں دیکھ رہا ہوں، آپ مریضوں سے، مریضوں کے اِستر

کی بات نہ کر کے؛اپنے اسٹر کی بات کر رہے ہیں: جب کہ ڈاکٹرز کو لازم ہے، کہ وہ مریض اور مرض کو ملحوظ رکھتے ہوئے مریضوں کے اسٹر کی بات کرے۔'' بات چونکہ سچ تھی، لہٰذا بنا حرکت مجھے گھورنے لگا وہ۔۔۔جیسے ہارٹ فیل ہو گیا ہو، اُس کا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، ہر شخص تھوڑا بہت پاگل ضرور ہوتا ہے ،میں بھی ہوں۔'' اُس نے کمپیوٹر پر کچھ فیڈ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سوچا ''میں پاگل تو ہوں، لیکن نہیں کے برابر؛ یعنی کہ دنیا اور رجنی کی بہ نسبت، بہت کم۔'' اب رجنی اور ساری دنیا کا علاج کروانا تو میرے بس کا تھا نہیں۔ ہاں، میں ضرور تھوڑے بہت علاج کا مستحق تھا۔ لہٰذا خود کو تھوڑا بہت پاگل سمجھ کر پی۔جی۔آئی۔سے اپنے ہی شہر کے نیورو سرجن کے پاس آ گیا۔

جب میں نے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نمستے کیا۔ پہلے تو اُس نے اپنا چہرہ اُٹھا کر مجھے غور سے دیکھا، پھر کھڑے ہو کر نمستے کا جواب دیتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے میرے آنے کا سبب دریافت کیا۔

''ڈاکٹر کے پاس مریض ہی آتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

پہلے تو اُس نے میری بات ہنسی میں اُڑا دی، پھر میری تواضع کے واسطے اپنے ملازم کو آواز دی، کیوں کہ میں معمولی انسان تو تھا، نہیں، بلکہ ایک پرائم منسٹر کا شوہر تھا۔ بہر حال میری ضد پر ڈاکٹر صاحب نے دو چار سوالات کرنے کے بعد مجھ کو میرے بالکل ٹھیک ہونے کا یقین دِلا دیا، پھر میرا ذہن رجنی کی جانب لپکا، لیکن بے سود۔ کیونکہ اُس کے الیکشن جیتتے ہی میں نے اُسے پاگل ڈکلیئر کر کے مقدمہ کر دیا تھا، کیونکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلے اور پڑھے بھی تھے۔ میں نے ایم۔ایس۔سی۔کر لیا تھا اور وہ آٹھویں کلاس میں فیل ہو گئی تھی۔

وہ اکثر پاگل پن کی حرکتیں کرتی تھی، مثلاً ایک بار ہم دونوں کے بچپن میں یوں ہوا کہ جب اُس نے کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا: ''ارے۔۔۔! کنویں میں ہاتھی۔۔۔!'' اس کے کہنے پر جیسے ہی میں نے کنویں میں جھانکا، اُس نے دھکا دے دیا اور اُچھل اُچھل کر تالیاں بجاتی ہوئی بھاگ لی۔ یہ کہو کہ پانی کم تھا ورنہ اُسی روز میرا کام تمام ہو جاتا۔

ایک بار ہم دونوں نے کھیل کھیل میں گھروندے بنائے۔ جب اُس کے گھروندے سے میرا گھروندا بہتر بنا؛ تو وہ میرا گھروندا بگاڑ کر بھاگ لی۔

ایک بار اُس کی ماں نے میرے لیے کھیر بھیجی، جیسے ہی میں نے پہلا چمچہ مُنہ میں رکھا؛ تو نمک ہی نمک، وہ بڑے اہتمام سے ڈھانپ کر لائی تھی۔ اِس طرح کبھی برتنوں میں اینٹ پتھر نکلتے تو کبھی اُچھلتے ہوئے مینڈک۔ ایسی حرکتوں پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی وہ، اور میں ہکا بکا رہ کر اُس کو تکتا رہ جاتا۔

وہ کبھی کسی کی ہانڈی میں نمک جھونک آتی، تو کبھی مرچ۔ موقع دیکھ کر عورتوں کے مجمع میں گھُس جاتی۔ کبھی کسی کے نیچے پانی سے بھیگا کپڑا رکھ دیتی، تو کبھی دو عورتوں کی چوٹیاں باندھ دیتی؛ کبھی کسی کے بیٹھنے کے مقام پر چپکے سے پان کی پیک اُگل دیتی۔ اِن سب حرکتوں کے بعد خوب اُچھل اُچھل کر تالیاں بجاتی، اور ہنستی ہنساتی نکل جاتی۔

محلّے کے شاطر سے شاطر کتّے، اُس کو دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگ لیتے۔ اگر کبھی کسی سوتے ہوئے کتّے پر اُس کی نظر پڑ جاتی، تو فوراً اُس کی پچھلی ٹانگیں پکڑتی، گھماتی اور پھینک دیتی۔ پھر تو دور دور تک قیوں قیوں کی آوازیں ہی سنائی پڑتیں۔

چڑیاں، اُس کو دیکھتے ہی اُڑ جاتیں، کبھی کوئی چڑیا، اُس کو دیکھنے میں چوک جاتی، تب تو اُس کا نشانہ نہ چوکتا؛ غلیل میں غُلّہ لگایا اور چڑیا نیچے۔

کبھی کوئی بکری یا بکرا نظر آیا، کان پکڑا اور اور اُس کی پیٹھ پر۔ جہاں کسی دھوبی نے اپنا گدھا باندھنے کی چوک کی؛ اُس نے فوراً اُس کی دُم میں ٹوٹا پیپا باندھ دیا۔

لڑکوں کی گلّی ڈنڈے میں، وہ شامل۔ کبڈّی میں، اُس کو دخل۔ کرکٹ میں، چوکے چھکے۔ تیراکی، میں وہ ماہر۔ پتنگ بازی میں تو لڑکوں کو اُس کا چرخا ہی تھامنے بنتا؛ ورنہ ڈور توڑی، اور پتنگ چھوڑ دی۔

پان، ہر وقت چبائے رہتی وہ۔ لڑکوں کا نئے کپڑے پہن

کر نکلنا محال تھا۔ جہاں کوئی چوکا، پیک کپڑوں پر۔
ماسٹر صاحب، اُس کو اسکول کے دروازے پر دیکھتے ہی، ڈنڈا سنبھال لیتے، ورنہ اسکول کے بچّوں کی کتابوں پر چیل کوّے بنا ڈالتی۔

رکشے والوں نے محلّے میں آنا بند کر دیا تھا۔ کبھی کوئی آنکلا، تو اُس کے رکشے کے پہیّے کی تیلیوں میں ڈنڈا۔ سائکل والے تو دور سے ہی دیکھ کر اُتر لیتے۔

راستہ چلتے کسی کو مُنھ چڑایا، کسی کے لتّی ماری اور کسی کو دھکا دے دیا۔ لوگوں نے اُس کی گلی سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ وہ اکثر دیوار پر لٹکی رہتی۔ کوئی بھولے سے اُدھر آ گیا فوراً ٹوپی اُتار کر زناٹے دار ٹیپ جانے دی۔

خوانچے والا، جیسے ہی گلی سے گزرا، مال غائب۔ پھر تو خوب اُچھل اُچھل کر سارا مال بچّوں کو بانٹ بانٹ کر کھاتی کھلاتی۔

شیر خوار اکثر اُس کی گود میں کھیلتے کھیلتے اُس کے چٹکی لینے سے چیخ پڑتے؛ سمجھ دار بچّے تو اُس کو دیکھتے ہی اپنی ماؤں کو بلبلا کر چمٹ جاتے۔ جس گلی میں نکل جاتی کہرام مچ جاتا۔ بچّے، اپنے گھروں میں سہم جاتے۔ لوگوں کے گھروں کے پیڑ پودے نوچ ڈالتی؛ بھگائی جاتی۔

پڑوسن تھی وہ میری؛ اور کچھ کچھ دور کی رشتے داری کے ساتھ ٹھیکرے کی منگیتر بھی۔ حالاں کہ میں اُس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کرتا رہا، لیکن ماں کے آگے ایک نہ چلی اور میری ماں، اُس اکلوتی کو دولت کی رانی کے ناتے بیاہ لائیں۔ دولت کا انبار تو میرے یہاں بھی تھا؛ لیکن وہ ہر معاملے میں مجھ سے سوا تھی۔ پہلی ہی رات میں اُس نے مجھ کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ اُس نے کہا ”آدمی اور عورت برابر کا درجہ رکھتے ہیں، میاں۔ تم بھی میرے جیسے کپڑے اور زیورات پہن کر سنگار کرو۔!“ میں نے انکار کیا تو وہ چیخنے لگی۔ مجھے اپنی عزت بچانی تھی؛ لہٰذا اُس نے جو کہا: مجھے سب کرنا پڑا۔ حالاں کہ صبح ہوتے ہی میں نے اپنی ماں سے احتجاج کیا، کہ میں اُس سے نباہ نہ کر سکوں گا، لیکن اُن کی گھڑکی نے میری زبان میں تالا ڈال دیا، آخر کار ماں کو ایک دن کہنا پڑا: ”تھی

اُف یہ آج کل کے بچے

TEXT BOOK

اسے ایک بڑا سا ٹیکسٹ میسج سمجھ کر ہی پڑھ لو!

تو پاگل، لیکن میں سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی، اب ٹھیک نہ ہوئی؛ تو تیری قسمت۔ چراغ جلانے اور خاندان چلانے کو دو بیٹے تو ہوگئے۔ گھر میں کام کاج کے لیے ہیں تو چار چار نوکرانیاں سمجھ لے ایک پاگل پڑی ہے، گھر میں۔ خدا نے دُکان اِسی لیے تو دِیے ہیں؛ ایک سے سُن اور دوسرے سے نکال۔ اِسی میں عافیت ہے، تیری۔ اُس کے والد خود نہ لڑ کر اب کے تجھ کو اُتاریں گے الیکشن میں۔“

جب الیکشن آیا تو آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے تال ٹھوک کر میرے مقابل اُتر آئی وہ۔ میرے خاندان کے علاوہ اُس کے والدین نے بھی بہت سمجھایا، لیکن رہی کتے کی دم، آدم کی پسلی؛ یعنی کہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی۔ یہ میں خوب جانتا تھا کہ جیتوں گا میں ہی الیکشن، کیوں کہ اُس کے والد میرے ہی سپورٹر تھے۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اُس کے جیتنے سے میری عزت سرِ عام نیلام ہو جائے گی، کیوں کہ میری بیوی پاگل ہے۔ حالاں کہ جب سے بیاہ کر گھر لایا، کوئی کسر نہ چھوڑی اُس کے علاج میں، لیکن اُس کا پاگل پن، دِن دُونا، رات چوگنا بڑھتا گیا؛ بھرشٹا چار کی طرح۔ آتنک وادی کی مانند۔

آخر کار اُس نے اپنی گاڑی سنبھالی اور کنویسنگ کو نکل پڑی۔

میرے پاس پانچ کی پانچ ہی رہیں، گاڑیاں۔ اُس کی مدد کو تیس چالیس گاڑیاں اور ہولیں۔

میں الیکشن کی تقریر میں، سورج پر جیون ہونے کی بات کرتا، تو ٹماٹر برستے۔ وہ کچھ بھی کہتی، تو لاد دی جاتی پھولوں سے، تالیوں کے ساتھ۔ کہنے کو اُس نے چھوڑا ہی کیا تھا، وہ وہ باتیں کہیں، کہ جن کے سر نہ پیر، مگر تالیوں کی گونج نے دوسری پارٹیوں کے دِل دہلا دیے۔ اُس نے کہا: ''زمین کو آسمان پر لے جاؤں گی۔'' تب تالیاں، ''عورتوں کو مردوں کا اور مردوں کو عورتوں کا لباس پہنواؤں گی۔'' تب تالیاں: ''کسی عورت کو بچّے پیدا کرنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے گی۔ بچّے ٹیسٹ ٹیوب میں تیار ہوں گے یا پھر امپورٹ کیے جائیں گے۔ اور اُن کی پرورش مرد کریں گے۔'' تب تالیاں: ''جھاڑو برتن سے لے کر کھانا بنانے تک کے گھر کے سارے کام، مردوں کو کرنا پڑیں گے۔'' تب تالیاں: ''مچھلیوں کو پیڑوں پر اور پرندوں کو پانی میں رہنا پڑے گا۔'' تب تالیاں: ''ہر شخص دن کی گرمی میں نہیں بل کہ رات کے ٹھنڈے موسم میں کام کرے گا۔'' تب تالیاں: ''سڑکوں اور ٹرین کی پٹریوں میں اربوں کا خرچ آتا ہے، اُن کی جگہ نہریں کھدوائی جائیں گی، جن میں کشتیاں چلیں گی۔'' تب تالیاں: ''اَب کوئی دُلھن بیاہ کر دُولھے کے یہاں نہیں جائے گی، بل کہ دُولھے کو دُلھن کے یہاں آنا پڑے گا۔'' تب تالیاں: ''ہر شخص کو اُڑنے والی مشین دی جائے گی۔'' تب تالیاں: ''اب جانوروں کے بیاہ بھی کیے جائیں گے، کیوں کہ بچّوں کی پیدائش کے بعد، نر آزاد گھومتے ہیں۔ بچّے، بے چاری ماداؤں کو ہی پالنے ہوتے ہیں۔ اب مادائیں، صرف دودھ پلائیں گی اور اُن کی خوراک، نر مہیا کرائیں گے۔'' تب تالیاں: ''ہر جیودھاری کو جینے کا حق ہے یعنی کہ مچھر اور مکھی کو اَب مارا نہیں جائے گا۔'' تب تالیاں: ''اب تعلیم کی ضرورت نہیں، صرف انگوٹھا لگا کر پرکھوں کی تہذیب کو برقرار رکھا جائے گا۔'' تب تالیاں۔ تالیاں بجانے کا انداز بھی نرالا تھا، اُس کا۔ بات کہی اور خود تالیاں بجاتے ہوئے لوگوں سے کہا: ''بجاؤ تالیاں.....!'' پھر تو ایسی بجیں تالیاں کہ

جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظؔ جالندھری میں شروع ہی سے ادبی چپقلش چل رہی تھی۔ جوشؔ کے پاکستان آ جانے کے بعد تو چپقلش اور بھی بڑھ گئی۔ ایک مشاعرے میں جوشؔ اور حفیظؔ دونوں کو شرکت کت لئے مدعو کیا گیا، لہٰذا منتظمین نے فیصلہ کیا کہ دونوں کی نشستیں ریل کے الگ الگ ڈبوں میں ہونی چاہئیں۔ ایک صاحب پوچھنے لگے ''کیا آپ کو خدشہ ہے کہ کہیں دونوں میں جھگڑا نہ ہو جائے؟''

ابھی منتظمین نے کوئی جواب بھی نہ دے پائے تھے کہ پاس کھڑے ابنِ انشا بولے ''نہیں! اندیشہ یہ ہے کہ کہیں دونوں میں صلح نہ ہو جائے۔''

پرندے ترس گئے پیڑوں پر بیٹھنے کے لیے۔

اُس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی کہا: ''اگر میں الیکشن جیت گیا تو زمین کے نارتھ پول کے نگیٹو اور ساؤتھ پول کے پازیٹو کرنٹ کو فریکوانسی میں تبدیل کرا کر بنا تاروں کی الیکٹرک عوام کو فری فراہم کراؤں گا۔ میرے خیال سے جب خلاء میں نمی کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور زمین کے دونوں پولوں کے نگیٹو، پازیٹو کرنٹ، اُس نمی میں فلو ہو کر آپس میں ٹکراتے ہیں: تب تیز چمک کے ساتھ دھماکہ ہوتا ہے، جس کو سائنس داں بادلوں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی بجلی کہتے ہیں۔'' میری اِس دلیل کو سراہنے کے بجائے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش کی گئی، مجھ پر۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ جب میں نے اپنی ذہانت کا لوہا منوانے کے لیے آسمانی اِندر دھنک کو زمین پر سیکڑوں گانو والوں کے درمیان دھوپ میں نمی پیدا کر کے دکھایا، تب بھی ٹماٹروں اور انڈوں کی بارش کے ساتھ جادوگر کے خطاب سے نوازا گیا، میں۔

حالات یہاں تک پہنچ گئے، کہ میرے زیادہ تر دوست مجھ سے ٹوٹ کر اُس سے جا ملے اور آگے بات یہاں تک پہنچ گئی کہ میرے بولنے کی جگہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں انڈوں،

ڈنڈوں اور ٹماٹروں کا انتظام ہو جاتا، پھر مجھ میں کہاں ہمت کہ وہاں پہنچ پاتا۔ جب کہ اُس کے ابّو نے اُس کو پاگل ڈکلیئر کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو سات سو دس ووٹ ملے اور اُس کو پانچ لاکھ، ترپن ہزار، چار سو، انتیس۔ میرے ساتھ سبھی امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ سونے پر سہاگا یہ کہ ایک پارٹی نے اپنے میں شامل کر کے پرائم منسٹر بنا دیا، اُس کو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اُس پر کیا گیا مقدمہ بھی ہار گیا۔ اَب تو میں شرمندگی کے باعث مکان کے اندر اور وہ بڑے بڑے نیتاؤں کے درمیان؛ مکان کے باہر۔ پھر جیسے کہ جتنا سے اُس نے وعدے کیے تھے: ایوان کی توثیق حاصل کر کے یکے بعد دیگرے اُن کا نفاذ بھی شروع کر دیا۔ پانی، سر سے اُوپر ہوتا دیکھ کر میں بھڑک گیا۔ انجام یہ ہوا کہ مجھے پاگل قرار دے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھونس دیا، اس نے۔ حویلی کے باہر ہنگامے ہوتے رہے اور میں قید خانے میں اپنی قسمت کو روتا رہا۔ کھانا پانی مل جاتا، وہ بھی وقت بے وقت۔ باہر کیا ہو رہا ہے اُس سے پوری طرح بے خبر رہتا۔ ہاں، کبھی کبھار کوئی ملازم رحم کھا کر اخبار ڈال جاتا۔ اخبار میں اُس کے احمقانہ رویے پڑھ کر من ہی من کڑھتا ، میں۔ لیکن پبلک، اُس کو بڑی گرم جوشی سے سراہتی، تالیاں بجاتی۔

میری ماں، جب کبھی میرے قید خانے کی جانب آ جاتی ، میں اُس کے کیے کا رونا روتا۔ کسی طرح اِس کا اُس کو علم ہوا، تو میری ماں کو بھی مجھ سے الگ ایک کمرے میں ٹھونس دیا، اُس نے۔ اُس کے والد نے احتجاج کیا تو اُن کا بھی میرے جیسا حشر ہوا۔ ایک روز، جینز شرٹ پہنے، ایک ملازمہ مجھ کو شلوار جمپر تھما گئی، جو مجھ کو پہننا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ساڑی بلاؤز پہنے ایک فوٹو گرافر میرا فوٹو لے گیا۔ دوسرے روز اخبار میں اپنی ماں کو نیکر شرٹ اور خسر کو اِسکرٹ ٹاپ میں دیکھ کر ہنسی آئی، اور رونا بھی۔ ساڑی بلاؤز، شلوار کرتے، اسکرٹ ٹاپ میں بڑے بڑے حاکموں کے درمیان اُس کو جینز شرٹ میں دیکھ کر بچپن سے اَب تک کے اُس کے پاگل پن کے سارے کارنامے یاد آ گئے اور میں خون کے آنسو روتا رہا۔

دن گزرتے گئے اور اُس کے پاگل پن کی حرکتیں بڑھتی گئیں؛ جن کو دنیا والے گرم جوشی سے سراہتے رہے۔

ایک روز اچانک خبر ملی کہ اُس کا پلین کریش ہوا، اور اُس کی موت ہو گئی۔ دوسرے دِن اخبار میں تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق: وہ پوری طرح پاگل تھی۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے آج بھی قاصر ہوں کہ آخر پاگل تھا کون؟ میں، وہ یا کہ چمچے اسٹیل کے۔۔۔؟

م۔ ص۔ ایمن

دوسرا خط

اِس افسانے کے کردار، واقعات، مقامات قطعی فرضی ہیں۔
آپ یہ بھی فرض کر لیں کہ کراچی میں لوکل ٹرین چل رہی ہے۔

ابرار دفتر جانے کے لیے لوکل ٹرین کے انتظار میں سٹیشن پر سیمنٹ کی نشست پر بیٹھے تھے کہ عین ان کے سامنے ایک اجنبی آ کھڑا ہوا۔اس کے ایک ہاتھ میں کاغذ کا عام سا ایک صفحہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں قلم!۔ان سے مخاطب ہوا" جناب مجھے خط لکھ دیں گے؟"

ابرار مسکرائے" لکھ تو دوں گا لیکن پورا خط نہیں لکھ پاؤں گا ۔۔۔گاڑی آ گئی تو چلا جاؤں گا"

وہ اطمینان سے بولا" ایک دو باتیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی۔ گاڑی کے آتے آتے۔آپ لکھ لیں گے"

"اچھا لاؤ" ابرار نے بلا تاخیر اس سے کاغذ قلم لے لیے اور سمٹ کر سیمنٹ کی بنی کرسی پر اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔اس نے لکھوانا شروع کیا

پیارے بیٹے رحمت جان نور چشم عبدالمتین

سدا خوش رہو

بیٹے! لوگ کہتے ہیں کراچی میں بہت کام ہے۔ آج تین ہفتے ہو گئے ہیں مجھے کراچی آئے ہوئے اور کوئی کام نہیں ملا۔۔۔ بھینس بیچ کر میں جو پیسے ساتھ لایا تھا، بے روزگاری میں وہ بھی خرچ کر دیے ہیں۔ اب صرف واپسی کے کرائے کے پیسے ہی بچے ہیں اور اگر میں کچھ دن اور یہاں رہا تو واپسی کا کرایہ بھی نہیں بچے گا۔ سب خرچ ہو جائیں گے۔ سوچا تھا کہ کراچی سے کما کر لاؤں گا اور اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی دھوم دھام سے کروں گا۔ دنیا دیکھے گی۔۔ابھی سٹیشن پر ٹکٹ کروانے آیا ہوں۔ جمعے کے دن گاؤں پہنچ جاؤں گا اور آ کر وہیں اپنا کام کروں گا۔۔۔تمام پڑھنے سننے والوں کو درجہ بدرجہ سلام۔

از طرف تمہارے ابو

مستری الف دین

خط مکمل ہوا تو مستری الف دین نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر دیا کہ اس پر وہ پتہ بھی لکھ دے۔لگتا تھا کہ مستری الف دین گھر سے پوری تیاری کر کے آیا ہے جو پتہ اس نے بتایا، ابرار نے لفافے پر لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔اس دوران اس نے خط کو تہ کر لیا تھا۔

ابرار نے پوچھا" تم کس قسم کے مستری ہو؟"

"میں راج مستری ہوں۔ گاؤں میں کام کرتا رہا ہوں لیکن وہاں کام کم ملتا ہے جو لوگ کام کرواتے ہیں وہ بھی ادھار کر دیتے ہیں پریشان ہو کر اس شہر کا رخ کیا تھا لیکن یہاں آ کر تو پریشانی میں اضافہ ہی ہوا" مستری الف دین بے حد مایوس دکھائی دے رہا تھا

،ابرار کو اس پر ترس آ گیا۔

دور سے۔۔۔۔آتی ہوئی لوکل ٹرین کے آثار نمودار ہوئے۔ اگلے چند منٹوں میں وہ قریب آ جاتی۔

ابرار نے کہا "تم جمعہ کے دن گاؤں جاؤ گے!۔تمہارے پاس ابھی تین دن ہیں۔۔کل کی ایک دیہاڑی لگا کر میرا ایک چھوٹا سا کام تو کر دو"

"جی فرمایئے!" مستری الف دین ہمہ تن گوش ہو گیا (عموماً "چھوٹے سے کام" کا سن کر مستری آتے نہیں ہیں)

ابرار بولے "حکومت نے گلیاں پکی کروائی ہیں۔اس سے میرے گھر کے سامنے گلی اونچی ہو گئی ہے اور میرا صحن گلی سے تقریباً چھ انچ نیچا ہو گیا ہے۔ بارش ہوتی ہے یا گلی میں کسی کا گٹر بند ہوتا ہے تو گلی کا پانی میرے گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔۔مہمان آتے ہیں تو ان کا سر چوکھٹ سے ٹکراتا ہے۔۔میں چاہتا ہوں کہ گلی کا دروازہ گلی سے کم از کم ایک فٹ اونچا کروا دوں تا کہ اس پریشانی سے نجات مل جائے"

مستری جلدی سے بولا۔"ٹھیک ہے صاحب! یہ کام ہو جائے گا"

"ابھی تو میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔شام کو چار بجے والی گاڑی سے واپس آؤں گا۔تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ یہاں سے میرا گھر پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے، میرے ساتھ۔۔میرے گھر چلنا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!۔۔آپ میرا ایک کام اور کر دیں"

مستری الف دین نے جلدی سے کھڑے ہو کر جیب سے ایک کاغذ اور نکالا اور کہا" مجھے ایک دوسرا خط لکھ دیں۔"

ابرار حیران ہو گئے۔"ابھی تو تم نے خط لکھوایا ہے"

"اسے چھوڑیں صاحب! اب دوسرا خط لکھ دیں۔گاڑی بھی آ رہی ہے۔"

ابرار نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے الف دین کے کہنے پر دوسرا خط لکھنا شروع کیا۔

پیارے بیٹے! رحمت جاں نورِ چشم عبدالمتین

سدا خوش رہو!

تین ہفتے کراچی میں بے روزگار رہنے کے بعد آج مجھے کام مل گیا ہے۔اب میں چھ ماہ تک گھر نہیں آ سکوں گا اور ان شاء اللہ چھ مہینے بعد آ کر دھوم دھام سے تمہاری شادی کرواؤں گا۔ دنیا دیکھے گی۔۔گھر کا۔۔اور ماں کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ تمام پڑھنے سننے والوں کو درجہ بدرجہ سلام۔۔۔خدا حافظ"

از طرف تمہارے ابو

مستری الف دین

ابرار نے دوسرا خط لکھ دیا تھا۔الف دین کے بشاش چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی پریشانی ختم ہو گئی ہے لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ اس کی پریشانی ابرار میں منتقل ہو گئی ہے۔

گاڑی سٹیشن کی حدود میں داخل ہو گئی تھی پلیٹ فارم پر ہلچل پیدا ہو گئی۔ جا بجا بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انگڑائیاں لے رہے تھے۔ابرار بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یار مستری!" انہوں نے الجھن دور کرنے کے لیے کہہ ہی دیا "ابھی تو تم نے خط لکھوایا ہے کہ تم ٹکٹ کروانے سٹیشن آئے ہو اور جمعے کے دن گھر پہنچ جاؤ گے اور اب لکھوایا ہے کہ تم چھ مہینے بعد آؤ گے میرا تو خیال ہے کہ میرے گھر کا گلی والا دروازہ ہی تو اونچا کرنا ہے ایک دن میں بھی یہ کام ہو سکتا ہے؟"

مستری الف دین مسکرایا "آپ کا یہ کام ایک ہی دن میں ہو گا جناب۔۔۔۔! لیکن "مجھے" کام مل جائے گا۔ابھی تو کوئی نہیں جانتا کہ میں کیا کام جانتا ہوں ۔ جب آپ کا کام کر رہا ہوں

ایک محفل میں مشہور صحافی احمد علی اور اُن کی اہلیہ ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس اور بہت سے ادیب جمع تھے۔ اچانک ایک صاحب نے ابراہیم جلیس سے سوال کیا "یہ بتایئے کہ صحافت اور ادب میں کیا رشتہ ہے؟"

اِس پر ابراہیم جلیس مسکرائے، احمد علی اور ان کی اہلیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جو احمد علی اور ہاجرہ مسرور کا ہے۔"

ابراہیم جلیس کو جھوٹ بولنے کی بہت عادت تھی۔ایک دن حمید اختر نے جلیس سے کہا ''میں نے زندگی میں بہت جھوٹے آدمی دیکھے ہیں مگر تم سے بڑا کوئی نہیں ملا۔تمھاری نظر میں ایسا کوئی ہے جو اِس میدان میں تم سے آگے ہو؟''

''ہاں ہے!'' ابراہیم جلیس نے جواب دیا۔

حمید اختر نے پوچھا ''کون؟''

''میرے والد صاحب۔'' ابراہیم جلیس نے کہا ''میں بی۔اے میں ایک نمبر سے پاس ہوا یعنی مارجن پر اور والد صاحب نے سارے حیدر آباد کی دعوت کر ڈالی کہ لڑکا یونیورسٹی میں ایک نمبر پر آیا ہے۔''

گا۔۔وہ بھی گلی میں تو آپ کے محلّہ دار۔۔پڑوسی۔۔آنے جانے والے دیکھیں گے۔ان کے گھر بھی تو گلی سے نیچے ہوگئے ہوں گے انہیں بھی کوئی نہ کوئی کام یاد آجائے گا۔۔اس طرح آپ کے محلے میں ہی مجھے کام ملتا چلا جائے گا''

''اچھا اچھا! ٹھیک ہے۔۔۔'' ابرار کی سمجھ میں یہ بات آگئی وہ مطمئن سے ہوگئے

گاڑی آگئی۔ابرار چلے گئے۔الف دین شاداں وفرحان سٹیشن پر ٹہلتا رہا۔اسے ''چھ مہینے کا'' کام مل گیا تھا۔

ابرار کسی محکمے میں کلرک تھے۔ان کا گھر سٹیشن سے قریب ہی تھا صبح بذریعہ لوکل ٹرین دفتر جاتے اور شام کو واپس آتے۔آج جب وہ واپس آئے تو سٹیشن پر حسب وعدہ مستری الف دین ان کا منتظر تھا۔ابرار اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

جیسا ابرار نے بتایا تھا،اس کے گھر کا دروازہ زمین میں دھنسا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ بارش اور گلی کے بند گٹروں کا پانی لامحالہ گھر میں داخل ہوتا ہوگا۔

ابرار کا مکان چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل تھا۔گھر میں داخل ہوتے ہی برآمدہ تھا پھر چھوٹا سا صحن!۔صحن کا ایک حصہ باورچی خانے، غسل خانے اور 'تیسرے خانے' میں بٹا ہوا تھا۔

ابرار نے مستری الف دین کو برآمدے میں بچھی ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود مونڈھا کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

اُنھوں نے اپنی بیگم کو بتادیا تھا کہ گلی کا دروازہ اونچا کروانے کے لیئے وہ ایک مستری کو ساتھ لائے ہیں۔ان کی بیگم اس کے لیئے چائے بنانے باورچی خانے میں مصروف ہوگئی،آخر کو وہ ان کے گھر ''پہلی بار'' آیا تھا۔

مستری نے طائرانہ مگر 'فاتحانہ' انداز میں مکان کا جائزہ لیا۔ بولا ''ٹھیک ہے صاحب! میں کل سے آجاؤں گا۔۔۔آپ کل گھر پر ہوں گے یا دفتر جائیں گے؟''

''کل سے آجاؤں گا'' سن کر ابرار چونک اٹھے۔پھر اپنے فہم کا قصور سمجھ کر سر جھٹک دیا ''نہیں! میں نے دفتر سے ایک دن کی چھٹی لے لی ہے تاکہ تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مہیا کردوں کیونکہ تم یہاں اجنبی ہو'' ابرار نے کہا

''بس تو آپ آج ہی ایک سو بلاک،دو بوری سیمنٹ اور ایک سوزوکی ریت منگوالیں تاکہ کل وقت ضائع نہ ہو اور صبح ہی صبح کام شروع کردیا جائے۔''

''سو بلاک؟۔۔۔۔'' ابرار حیران ہوگئے ''بھئی وہ کس لیے؟''

''سو بلاک تو کم ہیں صاحب!۔'' وہ صحن کی دائیں بائیں دیواروں کو دیکھتے ہوئے بولا ''تین سو بلاک تو بعد میں منگوانا پڑیں گے''

''تین اور ایک۔۔۔چار سو بلاک؟'' ابرار بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔

''اس سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔۔کیونکہ میں نے آپ کا کمرہ اندر سے نہیں دیکھا اس لیئے کمرے کا حساب ہی نہیں لگایا''

''اوہ یار! کمرے کو چھوڑو! صرف یہ دروازہ اونچا کردو۔بس!'' انہیں قدرے اطمینان ہوگیا کہ یہ میرا کمرہ بھی اونچا کرنے لگا تھا۔

''اسی دروازے کے لیئے سو بلاک منگوا رہا ہوں صاحب!''

"مجھے سمجھاؤ۔" ابرار نے وضاحت چاہی "مجھے بتاؤ۔ تم سو بلاک بلکہ تین سو بلاک لگاؤ گے کہاں؟۔۔ مکان تو سارا بنا ہوا ہے"

"صاحب! پہلے تو۔۔۔ یہ دروازہ نکلے گا۔۔۔ اوپر سے دیوار کاٹی جائے گی۔۔۔ دروازہ ایک فٹ اونچا کر کے لگایا جائے گا۔۔۔ اس طرح صحن دروازے سے ڈیڑھ فیٹ نیچے ہو جائے گا۔۔۔ اسے اونچا کرنے کے لیے صحن میں ملبہ ڈالا جائے گا۔۔ تب صحن اور برآمدے کا فرش اونچا ہوگا۔۔۔ ڈیڑھ فٹ فرش اونچا ہوا۔۔۔ تو برآمدے کی چھت بھی ڈیڑھ فٹ نیچی ہو جائے گی۔ پھر آپ کہیں گے کہ دیواروں پر دو دو رڈے لگا دو دو رڈے لگانے کے لیئے برآمدے کی یہ چھت اتارنا پڑے گی۔۔۔۔ رڈے لگا کر چھت پھر ڈلے گی۔۔ جو رڈے لگیں گے ان پر پلستر بھی ہوگا۔ ۔۔۔ برآمدے کا فرش اونچا ہوا۔۔ تو کمروں کا فرش نیچا ہو جائے گا۔۔۔ کمروں کے دروازے۔۔۔ جو اب چھ فٹ دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔ چار فٹ کی کھڑکی دکھائی دیں گے۔۔۔ اور یہ کھڑکیاں۔۔ جو اب زمین سے ڈھائی فٹ اونچی ہیں۔۔ زمین کے برابر ہو جائیں گی۔۔ آپ کہیں گے کہ یہ دروازے اور کھڑکیاں بھی اونچے کر دو۔۔۔ کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں اونچے کیے تو کمروں کا فرش بھی اونچا کرنا پڑے گا۔۔۔ نہیں ۔۔۔ تو کمروں میں دو یا تین سیڑھیاں بنانا پڑیں گی۔۔۔ اور۔۔ کمروں میں دن میں بھی اندھیرا رہے گا۔۔ کمروں کا فرش اونچا کیا تو چھت کا پنکھا سر سے ٹکرائے گا۔۔۔ آپ کہیں گے کہ کمروں کی چھت بھی اونچی کر دو۔۔۔ چھت اونچی کرنے کے لیے کمروں کی بھی چھت اتارنا پڑے گی۔۔۔۔ گلی کی دیوار پر دو دو رڈے لگے تھے۔۔۔ کمروں کی دیوار پر چار نہیں تو تین تین رڈے لگانا ہی پڑیں گے۔۔۔ کیونکہ تین رڈوں سے دو فٹ اونچائی بنتی ہے ۔۔۔ پھر کمروں کی چھت پڑے گی۔۔ پھر ان رڈوں پر پلاسٹر بھی ہوگا۔"

"اوہ!۔۔" ابرار صاحب کراہے "اس کا مطلب ہے ۔۔۔ ہمیں یہ مکان خالی کرنا پڑے گا"

رفیق چوہدری کے افسانوں کا مجموعہ "محبتوں کے چراغ" شائع ہوا۔ اس پر دیباچہ ابراہیم جلیس نے لکھا تھا۔ مصنف اور دیباچہ نگار دونوں کو پاکستان سرکار نے فحاشی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ مقدمہ چلا اور دونوں کو تین تین ماہ قید اور تین ہزار جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ اس واقعہ کے بعد ابراہیم جلیس نے چوہدری رفیق سے کہا "آئندہ تم افسانے لکھنا بند کر دو اور میں دیباچے لکھنا تا کہ دوبارہ یہ دن دیکھنا نہ پڑے۔"

"بالکل!۔۔۔" مستری نے فوراً تائید کی۔ "آپ کو کچھ دن کے لیئے مکان خالی کرنا پڑے گا تب ہی یہ کام جلدی ہوگا"

"نہیں بھائی!۔۔ میری اتنی گنجائش نہیں ہے۔۔ میں تھوڑے سے پیسے جمع کر لوں پھر یہ سب کرواؤں گا" ابرار نے گویا فیصلہ کر لیا۔ ان کے ذہن میں مستری کے "دوسرے خط" کے الفاظ گونج اٹھے تھے۔ وہ کہنا تو یہ چاہتے تھے' کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے تمہارے بیٹے کی شادی تو چھ ماہ بعد ہوگی' لیکن نہ کہہ سکے۔

"یہ تو صاحب میں نے آپ کو بتایا ہے کہ آپ کو یہ سارا کام کروانا پڑے گا۔ کب کرواتے ہیں؟ آپ کی مرضی۔۔"

"نہیں بھئی ابھی نہیں۔ میں نے صرف ایک دن کی چھٹی لی ہے اور ایک دن میں یہ سب نہیں ہو سکتا فی الحال رہنے ہی دو۔۔۔"

اس دوران بیگم ابرار چائے بنا کر لے آئی تھیں۔ انہوں نے سن لیا کہ ابرار گلی کا دروازہ اونچا کروانے کا "فی الحال" ارادہ نہیں رکھتے، بولیں "باقی کام کروائیں یا نہ کروائیں۔۔۔ گلی کا دروازہ ضرور اونچا کروا دیں۔۔۔۔ ایک ہی دن کا تو کام ہے۔ بیچ! گلی میں کسی کا بھی گٹر بند ہو! پریشان ہم ہوتے ہیں"

"بیگم! یہ کام ایک دن کا نہیں ہے۔۔ پورے چھ مہینے کا ہے۔ چھ مہینے کا۔۔۔ میں نے بھی یہی سمجھ کر دفتر سے ایک دن کی چھٹی لی تھی لیکن۔۔۔۔" انہوں نے بے چارگی سے مستری کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اتنا سا کام بھی چھ مہینے میں ہوگا؟" بیگم بھی سن کر حیران

بیوی سے بحث مت کرو، جیت تم نہیں سکتے، چُپ وہ نہیں ہو سکتی۔
خادم حسین مجاہد از ''قلم آرائیاں''

ہوئیں۔

ابرار مونڈھے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کی جانب جاتے ہوئے بیگم سے بولے ''تم یہاں آؤ!''

کمرے میں پہنچ کر وہ بولے ''بیگم! یہ مستری گاؤں سے آیا ہوا ہے۔ جمعے کو واپس جا رہا تھا۔۔ یہ مجھے سٹیشن پر ملا تھا میرے اس کام کے لیئے اس نے چھ مہینے کی ایکسٹینشن لی ہے اور ''مجھے'' ٹینشن میں مبتلا کر دیا ہے''

بیگم حیران ہو کر بولیں ''گاؤں سے آیا ہے؟۔۔ جب ہی تو یہ اناڑی مستری اس کام کو چھ مہینے میں کرے گا۔''

''نہیں بیگم!۔۔۔'' وہ سرگوشی سے بولے۔ ''یہ اناڑی نہیں ہے۔۔۔ بڑا خطرناک آدمی ہے۔'' ابرار کے ذہن سے اس کا ''دوسرا خط'' ہنوز چپکا ہوا تھا ''یقین کرو! اسٹیشن پر اس نے اپنے بیٹے کو خط لکھوایا اور مجھ سے ہی لکھوایا کہ اسے کراچی آئے ہوئے تین ہفتے ہو گئے ہیں اور ابھی تک بے روزگار ہے۔۔ جمعہ کے دن واپس آ رہا ہے۔ مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے سوچا کہ اس بے چارے سے کچھ کام کروا لوں اس کی بھی ایک آدھ دیہاڑی لگ جائے گی اور میرا گلی کا دروازہ بھی اونچا ہو جائے گا۔۔۔۔ لیکن اس نے جب سنا کہ مجھے گلی کا دروازہ اونچا کروانا ہے تو ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں اس نے ''چھ مہینے کا'' منصوبہ بنا لیا۔ یہ چھ مہینے تک میرے گھر کام کرے گا بیگم!۔۔۔ اور چھ مہینے بعد گاؤں جا کر اپنے بیٹے کی دھوم دھام سے شادی کرے گا۔۔ وہ بھی میرے پیسے سے؟''

اور پھر ابرار نے بیگم کو تفصیل بتائی کہ وہ ان چھ مہینوں میں کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ناگاہ ان کی نظر کمرے کے پچھلے روشن دانوں پر پڑی۔ بولے ''ابھی تو اس نے کمرہ اندر سے دیکھا ہی نہیں ہے۔۔۔ اس کا حساب تو بعد میں لگائے گا۔۔۔ اس کے تو روشن دان بھی اونچے کرے گا۔۔۔ یہ الماری۔۔۔۔ یہ الماری جو دیوار کے اندر بنی ہے یہ بھی دو فٹ زمین میں دھنس جائے گی یہ بھی اونچی ہو گی'' وہ کہتے گئے اور ان کا دل ڈوبتا گیا ''ابھی ہماری چھت فرش سے دس فٹ اونچی ہے۔۔ فرش دو فٹ اونچا ہو گیا تو چار پائی پر کھڑے ہو کر ہم چھت کو ہاتھ لگا سکیں گے۔۔ ہمیں کمروں کی دیواروں پر چار چار ردے لگوانا پڑیں گے۔ کیونکہ مستری بتا رہا ہے کہ تین ردوں سے دو فٹ اونچائی بنتی ہے۔''

بیگم نے یہ سب سنا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں بولیں ''سنتے آئے ہیں کہ مستری کسی گھر میں گھس جائے تو بڑی مشکل سے نکلتا ہے لیکن یہ تو 'ہمیں' گھر سے نکالنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے'' چند لمحے سوچ کر بولیں ''یہ سچ مچ پینڈو مستری ہے۔۔ یہ پینڈو مستری نہ ہوتا۔۔ شہر کا سمجھ دار، چالباز مستری ہوتا تو اپنا تجربہ بتا کر یوں ہمیں ہوشیار نہ کرتا۔ اپنا کام شروع کر دیتا۔''

''بیگم!۔۔ کہتا تو وہ ٹھیک ہے۔۔ پینڈو نہ ہوتا شہری ہوتا۔ الف دین نہ ہوتا۔ کوئی بے دین ہوتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیا کریں یہ کام تو کروانا ہی پڑے گا۔۔۔ آج نہیں تو کل۔۔۔۔۔''

کمرے سے باہر آئے۔ ان کی نظر کچن کی جانب اٹھ گئی۔۔ وہ ساکت ہو گئے۔۔ انہوں نے اسے مستری کی نظر سے دیکھا۔ ان کے دل پر ایک گھونسا سا لگا ''یہ بھی نیچا ہو جائے گا۔۔ غسل خانے اور تیسرے خانے سے ہوتے ہوئے ان کی نظریں الف دین پر ٹک گئیں۔۔۔ انہیں الف دین سے خوف آنے لگا تھا۔۔

اس پینڈو مستری نے سیکنڈوں میں چھ مہینے کی منصوبہ بندی کر لی لیکن ابرار سارا دن میں بھی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ چھ مہینے کا کام ایک دیہاڑی میں کیسے کروایا جائے۔ بالآخر انہوں نے چھ ماہ بعد عبدالمتین کی شادی دھوم دھام سے کروانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

پلکیں جھکی جھکی سی، قدم تھکے تھکے سے وہ الف دین کے قریب آئے۔ اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولے ''ٹھیک ہے مستری!۔۔ کل سے۔۔۔ آجانا''

اقبال حسن آزاد

چھیڑ خوباں سے چلی جائے...

مرزا غالب نے فرمایا ہے:

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

وصل اور حسرت کے تعلق سے اتنا عمدہ شعر میری نظروں سے نہیں گزرا۔ لیکن اس شعر کا کلیدی لفظ دراصل ''چھیڑ'' ہے۔ چھیڑ خانی کرنا عاشقوں کا محبوب مشغلہ ہے اور جو معشوق عاشق کی چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہونے کا مادہ نہیں رکھتا اسے معشوق بننے کا کوئی حق نہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ معشوق بنانے کے لیے کسی کو زہرہ جبیں' ماہ جبیں' ماہ پارہ' مہ ناز یا یوں کہے کہ کسی سراپا ناز کی کوئی ضرورت نہیں۔ معشوق تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر آبروؔ کا ایک شعر ہے:

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا
جہاں جاویں وہاں دو چار کو ہم تاک رکھتے ہیں

ایک اور شاعر تھے قمرالدین احمد قمرؔ۔ فرماتے ہیں:

لوطیوں میں شہرہ آفاق ہوں
بچہ بازی میں نہایت طاق ہوں

اشرف الدین علی خاں پیامؔ کا شعر ہے:

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا

اُسی دور کے ایک اور شاعر تھے جو مضمونؔ تخلص فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے اس مضمون کو کس خوبی کے ساتھ مندرجہ بالا شعر میں ادا کیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

میکدے میں گر سراسر فعل نا معقول ہے
مدرسہ دیکھا وہاں بھی فاعل و مفعول ہے

میر تقی میر کا معشوق کوئی کمسن لونڈا تھا جس کے سبزہ ء خط پر میر فدا ہوگئے تھے۔ موصوف کا رنگ سخن ملاحظہ فرمایئے:

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر
یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دو خوابا

لفظ فدا پر مشہور آرٹسٹ فدا حسین بھی یاد آجاتے ہیں جو اپنی پر پوتی کی عمر کی ہیروئینوں پر بڑی آسانی سے فدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو اصل عشق' عشق حقیقی ہے مرزا شوق لکھنوی نے اپنی مشہور مثنوی ''بہار عشق'' طبع دوم کے آخر میں ''ترغیب عشق حقیقی'' کا عنوان قائم کرکے اپنی تمام فحش نگاری کا جو ۱۸۱۹ اشعار کا

احاطہ کرتی ہے، صرف ۱۲۳ اشعار میں کفارہ ادا کردیا ہے۔ چند شعر حسب ذیل ہیں

سب یہ دنیا سرائے فانی ہے
عشق معبود جاودانی ہے
عشق اللہ کا جو مائل ہو
ترک دنیا کرے تو حاصل ہو
کوئی الفت نہ بے وفا سے کرے
عشق کرنا ہو تو خدا سے کرے
چار دن کی یہ زندگانی ہے
جو ہے اس کے سوا سو فانی ہے

کیسی سچی بات کہی ہے شاعر نے۔ جب چار دن کی زندگانی ہے اور دنیا سرائے فانی ہے تو پھر یہ سارے جھگڑے رگڑے کس لیے۔ ہاں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں کوئی قباحت نہیں۔ چھیڑ چھاڑ دراصل زندگی کا حسن ہے ورنہ یہ زندگی کسی بیوہ کی طرح اداس اور غمگین ہوکر رہ جائے گی۔ کہتے ہیں

افسردہ دل کند افسردہ انجمنی را

ذرا غور فرمایئے، اگر کوئی شخص اپنے چہرے پر ہمہ وقت سنجیدگی کا غلاف اوڑھے رہے تو کیا ہوگا۔ اول تو وہ شخص وقت سے پہلے بوڑھا دکھائی دینے لگے گا اور دوم یہ کہ وہ جس محفل میں رونق افروز ہوگا وہاں سنجیدگی کی ایسی دبیز دھند چھا جائے گی کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔ شاید اسی لیے غالب جیسے ذہین شاعر نے خود کو اور اوروں کو ہمہ وقت شگفتہ شاداب رکھنے کے لیے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ سے اپنی تکلیف دہ زندگی کو جینے کے قابل بنایا۔ غالباً اسی نسخہ میں غالب کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب کے دل میں اپنے معشوق کے لب لعلیں کو چومنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس ستم پیشہ نے بجائے ان کی دلی مراد پوری کرنے کے انھیں ٹھینگا دکھادیا۔ غالب نے کہا

غنچۂ نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

اس پر معشوق اور برہم ہوا اور اس نے انھیں گالیاں دینی شروع کردیں۔ غالب بھلا کب پیچھے رہنے والے تھے۔ فوراً کہا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

گالیاں تو دراصل غالب ہی کو پڑی تھیں مگر انھوں نے آجکل کے شرم سے عاری سیاست دانوں کی طرح رقیب کے کندھے پر بندوق چلادی۔ معشوق ان کی اس چالاکی کو سمجھ گیا اور اس نے ان کا منھ چڑادیا۔ غالب نے اب کے فرمایا:

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

جب اس پر بھی پتھر دل نہ پگھلا تب مجبور ہوکر موصوف نے

ہزارہ کے عالم مولانا عبدالرحیم ہزاروی نے اداکارہ ریما سے شادی کرنے کا پختہ عزم کا اظہار کیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ ''مسجد میں طالبعلموں کو پڑھانے اور دیگر امور کے صرف آٹھ سو روپے ماہوار ملتے ہیں جس سے میرا گزارہ مشکل ہے، اگر ریما سے میری شادی ہوگئی تو اس کی آمدنی میری پوری زندگی کے لئے کافی ہوگی''۔ مولانا نے کہا کہ ''اگر لوگ مجھے پاگل کہیں تو بیشک کہیں، میں بر حال ریما سے شادی کروں گا بلکہ کسی اور مولوی نے اگر میرا نکاح نہ پڑھایا تو میں خود اپنا نکاح پڑھوں گا۔ میرا یہ مشن ضرور کامیاب ہوگا اور شائد میں بھی فلمی دنیا کا ہیرو بن جاؤں۔ پہلی بیوی کو چار سال پہلے طلاق دے چکا ہوں کیونکہ وہ کالی تھی۔ آئندہ طلاق کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ میری آئندہ بیوی ریما ہوگی۔''

آپ بھی شرمسار ہو از عطاالحق قاسمی

فرمایا:

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ہم عصروں، ہم جماعتوں اور ہمسایوں کے درمیان چھیڑ چھاڑ کا معاملہ بہت قدیمی ہے۔ میرے ایک عزیز دوست کرائے کے مکان میں مقیم تھے اور اپنے ہمسائے کی چھیڑ چھاڑ سے عاجز تھے۔ معاملہ یہ تھا کہ موصوف جب کسی نئی خادمہ کو بحال کرتے ان کا پڑوسی کسی شنی کی طرح اس پر اپنا منگل گرہ ڈال دیتا۔ اب ہوتا یہ کہ چند روز تو پڑوسی صاحب حالات کا جائزہ لیتے اور پھر اس ملازمہ کو ورغلا کر اپنے یہاں کام پر لگا دیتے۔ جب یہ سلسلہ دراز ہونے لگا تو تنگ آ کر میرے دوست نے اپنا مکان بدل لیا۔

چھیڑ چھاڑ کی روایت اردو ادب میں بھی بہت پرانی ہے۔ اس ادبی چھیڑ چھاڑ کو معاصرانہ چشمک کہا جاتا ہے۔ اول اول غالب نے مشکل پسندی کو راہ دی اور اپنے اشعار پر اسرار کے ایسے دبیز پردے ڈال دیے کہ ان کے مفہوم تک عام لوگوں کی رسائی نہ ہو سکی اور ان پر یہ کہہ کر چوٹ کی گئی کہ:

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لہٰذا ان پر مشکل پسندی کا الزام آ گیا۔ بعد میں انھوں نے سادہ اور آسان زبان میں اشعار کہنے شروع کیے۔ ذوق، غالب کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے غالب کو چھیڑنے کے لیے فرمایا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ بھلا کب چوکنے والے تھے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہے اور جب بہادر شاہ ظفر نے اپنے بیٹے کی شادی پر ان سے سہرا لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے ایک شاندار سہرا لکھا اور مقطع میں فرمایا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بہادر شاہ سمجھ گئے کہ اشارہ ان کے استاد ذوق کی طرف ہے۔ چنانچہ ان کے حکم پر ذوق نے بھی ایک سہرا لکھا اور مقطع میں فرمایا:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اُردو ادب کے دو اہم مرثیہ گو شاعروں انیس اور دبیر کی چشمک بھی مشہور ہے۔ پورا لکھنؤ دو حصوں میں منقسم تھا۔ آدھے انیسیے تھے اور آدھے دبیریے۔ انیس کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ دبیر ان کے مضامین چرا لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے کہا:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مندرجہ بالا شعر میں انیس نے کھلم کھلا دبیر پر سرقہ کا الزام لگایا مگر دبیر کی اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ انھوں نے انیس کے خلاف کوئی محاذ نہیں کھولا بلکہ یہ کہہ کر رہ گئے کہ:

اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے
انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

انیس بھلا کب پیچھے ہٹنے والے تھے۔فوراً جواب دیا:

انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے

انشاء اور مصحفی کی چشمک بھی مشہور ہے۔انیس اور دبیر کی طرح ان دو شاعروں کے شاگرد بھی دو گروپ میں بٹے ہوئے تھے۔ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دونوں شاعروں میں کسی بات پر ٹھن گئی۔انشاء نے ایک ہزل لکھی جس کے ٹیپ کا بند تھا:

لڑتے بھڑتے جا رہے ہیں مصحفی اور مصحفن

اس کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں ایک گڈا اور ایک گڑیا لیا اور سڑک پر جلوس بنا کر نکلے۔وہ گڈے اور گڑیے کو آپس میں لڑاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

لڑتے بھڑتے جا رہے ہیں مصحفی اور مصحفن
لڑتے بھڑتے جا رہے ہیں مصحفی اور مصحفن

جب مصحفی اور ان کے شاگردوں کو اس فوج ظفر موج کی آمد کی خبر ملی تو یہ لوگ بھی آلاتِ حرب وضرب سے لیس ہو کر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ جب انشاء اور ان کے شاگرد مصحفی کے در دولت پر پہنچے تو ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے اور انھیں شربت پیش کیا گیا۔پھر سب آپس میں گلے گلے ملے تو سارا گلہ جاتا رہا۔

چھیڑ چھاڑ کا اصل لطف تو دور حاضر کے نیتا لوگ اُٹھاتے ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ مختلف پارٹیوں کے لیڈر اسمبلی اور پارلیامنٹ میں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔کبھی کبھی یہ چھیڑ چھاڑ خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور مار پیٹ کی نوبت آجاتی ہے۔اسمبلی میں جوتے چلتے ہیں اور پارلیامنٹ میں کرسیاں۔مگر جب یہ لوگ کسی پارٹی میں شریک ہوتے ہیں تو ہم نوالہ ہم پیالہ، ہم مشرب، ہمدم اور ہمراز دکھائی دینے لگتے ہیں۔ان کی کامیابی کا راز اسی حکمت عملی میں مضمر ہے۔

ادبی چھیڑ چھاڑ سے انتشار پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک صحت مند روایت قائم ہوتی ہے۔ مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دونوں فریق اپنے اپنے قلم کا جوہر دکھانے میں جٹ جاتے ہیں

منیر نیازی

اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے منیر نیازی نے کہا'' میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، کھاتا کم ہوں اور پیتا زیادہ ہوں۔ تقسیمِ ہند سے قبل نیوی میں بھرتی ہو گیا تھا۔میری والدہ نے مجھے لکھا کہ انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر آدمی شہید نہیں ہوتا،لہٰذا وہاں سے بھاگ گیا۔

بات سے بات از انور مسعود

اور اس طرح زبان وادب میں گرانقدر اضافہ ہوتا ہے۔اگر مولانا الطاف حسین حالی کی ''مسدس حالی'' کو اُبالی ہوئی کھچڑی نہ کہا جاتا اور اس کے جواب میں ''مسدس بدحالی'' نہ لکھی جاتی تو تو حالی اپنی اس تصنیف پر نظر ثانی نہیں کرتے اور اس صورت میں یہ کتاب ایک شاہکار بن کر نہیں اُبھر پاتی۔لیکن یہ مسابقت کبھی کبھی مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتی ہے اور اس لطیفے کی طرح ہو جاتی ہے جہاں ایک بچہ ہنستا چہکتا گھر میں داخل ہوتا ہے اور اپنی ماں سے کہتا ہے .....''ممی !ممی!! میں دوڑ میں فرسٹ آیا۔'' ماں نے پوچھا:

''ریس میں کتنے بچے تھے؟'' بچے نے جواب دیا:

''میں اکیلا ہی دوڑ رہا تھا۔''

پس ثابت ہوا کہ جب تک دو یا اس سے زیادہ فریق نہ ہونگے کھیل میں مزا نہیں آئے گا۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ بازار میں کسی چیز کی ایک دکان چل نکلتی ہے تو اس کے بغل میں اسی چیز کی دوسری دکان کھل جاتی ہے۔کسی شہر میں اگر ایک ادبی فورم قائم ہوتا ہے تو فوراً ایک اور ادبی ادارے کا قیام بھی عمل میں آجاتا ہے۔اسی طرح کسی جگہ سے ایک اردو کا رسالہ جاری ہوتا ہے تو اس کے شانہ بشانہ دوسرا رسالہ بھی شائع ہونے لگتا ہے۔اگر ایسا نہ ہو تو وہ اکیلا رسالہ بہت جلد بور ہو کر بند ہو جاتا ہے۔تو بھائی میرے!زندگی کا اصل لطف چھیڑ چھاڑ ہی میں پوشیدہ ہے شرط یہ کہ یہ صحت مند چھیڑ چھاڑ ہو اور اس میں کسی کی کردار کشی، غیبت ،عیب جوئی وغیرہ کی کوشش نہ ہو۔

بہ وسائلِ تبسم

نسرین سید
کینیڈا
nasreensyed@gmail.com

ریاض، سعودی عرب سے طویل سفر طے کرتی ہوئی ایک حسین کتاب کینیڈا پہنچی ہے۔ یہ کتاب محترم شوکت جمال نے از راہِ لطف وکرم ڈھیر سارے ریال خرچ کر کے ارسال فرمائی ہے۔ کتاب دیکھ کر دل واقعی باغ باغ ہو گیا۔ اس سے پہلے، ان کی دو کتابیں سال ۲۰۰۰ء میں "دیوانچہ" اور سال ۲۰۰۳ء میں "شوخ بیانی" اہلِ ذوق قارئین کی سیرابیٔ طبع کا باعث بن چکی ہیں۔ مزاح پر ان کی یہ تیسری کتاب ہے۔ کتاب کیا ہے، پھلجھڑیوں کا حسین گلدستہ ہے۔ کتاب کا نام "بہ وسائلِ تبسم" بار بار مجھے غالب کے مصرع "بہ مسائلِ تصوف، بہ ترا بیانِ غالب" کی یاد دلاتا رہا۔

آپ میری تائید کریں گے کہ کتاب کا نام اس سے بہتر ہو بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ کتاب میں شوکت جمال صاحب نے تبسم کے جو وسائل بہم پہنچائے ہیں، وہ یقیناً ہمیشہ اپنے قارئین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے رہیں گے۔ کتاب کے لیے بڑا سائز انتخاب کیا گیا ہے اور اس کا سرورق نہایت دل کش ہے۔ کتاب کی جلد اتنی مضبوط ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی اس کا بال بیکا ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جو ریشمی کاغذ استعمال کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ کتاب کی اشاعت میں کافی فراخ دلی اور بہت سی محبت سے کام لیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں جن محترم و موقر دوستوں نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے، ان میں پروفیسر آفاق صدیقی، ڈاکٹر معین قریشی، اطہر شاہ خان، ڈاکٹر اقبال واجد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، نورین طعت عروبہ اور کلیم چغتائی شامل ہیں۔

کتاب کو شائع کرنے کا جو جواز محترم مصنف نے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے، اس سے کم از کم میں تو پوری طرح متفق ہوں۔ فرماتے ہیں "متعدد نئی غزلیں، قطعات اور نظمیں میرے دل و دماغ کے کونوں کھدروں سے نکل کر میرے کمپیوٹر میں محفوظ ہو چکی تھیں چنانچہ ان سب کو جمع کر کے کاغذی پیرہن میں ملبوس کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ویسے بھی کمپیوٹر کا کیا بھروسہ، ایک چھوٹا سا وائرس کسی بھی وقت حملہ آور ہو کر سارے کیے کرائے پر پانی پھیر سکتا ہے"

> کتاب کا نام اس سے بہتر ہو بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ کتاب میں شوکت جمال صاحب نے تبسم کے جو وسائل بہم پہنچائے ہیں، وہ یقیناً ہمیشہ اپنے قارئین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے رہیں گے۔

میں ان کی اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ شاید ہی کوئی چیز کتاب کی نعم البدل قرار دی جا سکے۔ سونے سے قبل کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کرنا، اس کے بعد نشانی کے طور پر اس صفحے پر ریشمی ڈوری رکھنا (اگرچہ کچھ لوگ صفحہ موڑنا، بہتر سمجھتے ہیں) اور پھر اگلی شب وہیں سے مطالعہ کا آغاز کرنا بہت پر لطف ہوتا ہے۔

شستہ مزاح لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ محترم شوکت جمال کی افتادِ طبع نے اس خارزار رستے میں ان کی بیحد مدد کی ہے۔ وہ زندگی میں پیش آنے والی مختلف سچویشنز کا تجزیہ اپنے ہلکے پھلکے انداز میں ایسے کرتے ہیں کہ آپ ان کا حظ اٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ منتخب شاعری میں سے انتخاب کرنا بذاتِ خود ایک

مشکل کام ہے۔ تاہم اپنی پسند کے چند گلہائے ظرافت قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتی ہوں۔

دور ہے مہنگائی کا اس ملک میں تو کیا ہوا
اس گرانی کے سبب ہرگز نہ رونا چاہیے
اپنا بسکٹ نرم کرنا ہو تو اے اہلِ وطن
دوسروں کی چائے میں اس کو ڈبونا چاہیے

سڑک پار کرتے ہوئے آج شب
جو جاں سے گئے سب کو کر کے ملول
وہی تھے جنھوں نے لکھی تھی کتاب
''سڑک پار کرنے کے زریں اصول''

ٹکنالوجی کی ہمارے دور میں
اب کہاں تک ہے رسائی، دیکھ لی
میرے موبائل میں ہے تصویرِ یار
''جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی''

محفل میں وہ بھی آئے ، دیکھو مگر یہ قسمت
پہنے ہوئے نہیں تھا میں چشمۂ بصارت
سوچا زباں سے کہہ دوں میں حالِ دل ہی، لیکن
لائے نہیں تھے اس دن وہ آلۂ سماعت

سویرا ہوتے ہی شاعر پہ یہ ستم ٹوٹا
پولیس لے گئی تھانے، اسے وہاں کوٹا
کہا کہ مال برآمد کرا ، ابھی فوراً
سُنا ہے رات کو تُو نے مشاعرہ لوٹا

دل ہے پتھر، دماغ میں بُھس ہے
میرا ماسوک بھی عجب ٹھُس ہے
مجھ سے سوگج پرے ہی رہتا ہے
اور گیروں کے بیچ میں گھُس ہے

ذکر غیروں کا اگر تم نے نہ چھیڑا ہوتا
وصل کی رات کا یوں غرق نہ بیڑا ہوتا
اس لیے مل کے میں آیا ہوں اسی کے گھر میں
اپنے گھر اس کو بلاتا تو بکھیڑا ہوتا
یاد آنے لگے پھر کام ضروری تم کو
قبل آنے کے، ہر اک کام نبیڑا ہوتا

جو نقشِ ناپائیدار اترا تو میں نے دیکھا
دلہن کا چہرا، سنگار اترا تو میں نے دیکھا
لکھا تھا بوتل پہ الکحل ہے، شراب ہے یہ
مگر یہ لیبل، خمار اترا تو میں نے دیکھا

جذبۂ الفت کو اپنے میں نے جب سچا کہا
مسکرا کر اس نے مجھ کو عقل کا کچا کہا
کس طرح آگے بڑھاتا بات، جب اس شوخ نے
میرے اظہارِ محبت پر فقط ''اچھا'' کہا

جب کہا اس نے ''آ'' تو آیا تھا
جب وہ بولا ''نکل'' نکل آیا
بنتے دیکھا جو داد کو بیداد
لے کے اپنی غزل نکل آیا

گفتگو اُن سے ہماری ہے یہی، شادی کے بعد
''آپ کا جو حکم ہو'' یا ''آپ جو چاہیں جناب''

سوچوں میں عقدِ ثانی کے کھویا ہوا ہوں میں
بیگم سمجھ رہی ہیں کہ سویا ہوا ہوں میں

اس باغ و بہار کتاب کی اشاعت پر محترم شوکت جمال صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے ایک بار پھر ان کی نوازش کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

e-شیطان

صاحبو! کہتے ہیں انسان عموماً رواں رویہ (Status Quo) کو پسند کرتا ہے، تبدیلی کو ذرا مشکل سے ہی قبول کرتا ہے۔ اگر آپ کو ہماری بات کا اعتبار نہیں ہے تو اپنے بودو باش میں ایک معمولی سی تبدیلی لا کر دیکھیں، آپ کو ہماری بات بہت اچھی طرح سمجھ آجائے گی۔ مثلاً اگر آپ عموماً شہری علاقوں کے رہنے والوں کی طرح پینٹ پہنتے ہیں اور کبھی کبھار (یا اکثر جمعہ کے دن) شلوار قمیض ہی پہنتے ہیں لیکن ذرا دو چار دن اپنے دفتر یا کاروبار پر شیروانی پہن کر جائیے، یا اگر آپ عموماً شلوار قمیض پر واسکٹ یا شیروانی پہننے کے عادی ہیں تو کچھ دن تھری پیس سوٹ میں دفتر جا کر دیکھیں، پھر آپ کو کیا کیا سننے کو ملتی ہے، اس سے آپ ہمارے اس کلیہ پر یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر کسی کا محض گواہی سے ہی کام چل جاتا ہو تو وہ محترم طاہر مسعود سے احوالِ واقعی سن لے۔

ویسے ہمارا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے گذشتہ دنوں موسم کی سختی سے گھبرا کر ہم نے اپنی زلف ہائے دراز کو عملاً دراز میں بند کیا اور اپنے بالوں کو اپنے بینک اکاؤنٹ کی مانند ہلکا پھلکا کروالیا۔ اس کے بعد ہم سے ہر کوئی اس چوک کا پتہ پوچھ رہا ہے جہاں ہماری حجامت بنی۔ دوسری جانب ہمارے چند دوست ہم سے یہ پوچھتا تھا کہ چار گرہ زلف دراز میں سے دو گرہ گذر جانے کی وجہ پوچھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہماری حجامت سے سوائے ہمارے بینکر اور حجام کے کسی کو کوئی مثبت یا منفی فرق نہیں پڑتا۔

قارئین کرام! یہ بھی کوئی نیا رویہ نہیں ہے۔ ہم تاریخ کا سرسری مطالعہ کریں یا عمیق، ہمیں اس قسم کے واقعات جا بجا ملتے ہیں جن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عموماً لوگ کسی بھی تبدیلی کو ذرا مشکل سے ہی قبول کرتے ہیں اور جب بات سائنسی اور یا کسی قسم کی ایجاد کی آجائے تو یہ صورتحال اور بھی زیادہ عجیب ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی سائنس دان یہ کہہ دے کے سورج زمین کے گرد نہیں گھوم رہا ہے بلکہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے تو یہ بات عوام میں اس قدر ناپسندیدہ ہوتی ہے کہ اس بیچارے سائنس دان کو قید حیات سے ہی جان چھٹکارا مل جاتا ہے۔

چلیں چھوڑیں ہم کہاں آپ کو تاریخ اور سائنس کی پر پیچ گلیوں میں گھماتے رہیں گے اور آپ بھی ہمارے ساتھ ساتھ گھومتے رہیں گے اور پھر بعد میں شکوہ کریں گے کے اتنا گھما دینے کے بعد تو دودھ سے مکھن اور لسی علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں آپ کی لمبی چوڑی تمہید سے اصل بات بھی نہ نکل سکی۔ لہٰذا ہم تاریخ اور سائنس کی گلیوں سے گھومتے ہیں ان چیزوں کی طرف جن کے گواہ آپ میں سے اکثر لوگ خود ہوں گے۔ عوام کی طرف سے ان چیزوں کو فوری صرف مسترد کر دینا صحیح تھا یا غلط، یہ تو وقت نے ثابت کر ہی دیا کے مسترد کر دینے کے باوجود عوام ان کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئی لیکن ہمارا آپ سے صرف ایک سوال ہے کہ عوام نے ان ایجادات پر جو الزام لگائے کیا وہ غلط تھے؟ عوام نے ان کو جو شیطانی ڈبہ کہا تھا کیا یہ الزام غلط تھا؟ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی اس موقع پر وہی دلیل دیں گے جو ہم بھی اپنے مخالفین کو زچ کرنے کے لئے دیا کرتے ہیں، یعنی یہ کہ کوئی بھی ایجاد خود صحیح یا غلط نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا استعمال صحیح یا غلط ہوا کرتا ہے۔ تو پھر ہمارا سوال

یہ ہے کہ خودکش بمبار کی جیکٹ میں فٹ بم سے لے کر ایٹم بم تک کوئی ایسا بم بتادیں جس کا استعمال سودمند بھی ہو۔ لیکن شائد ہم پھر اپنے موضوع سے ہٹ جائیں گے ہمارا سوال یہ نہیں ہے کہ کسی بھی چیز کی ایجاد سودمند ہے یا نہیں بلکہ ہمارا سوال یہ ہے کہ کسی چیز کی ایجاد پر اٹھنے والے اعتراضات کیا واقعی غلط ہوتے ہیں، کیا وہ واقعی بالکل بے وزن ہوتے ہیں؟

مثلاً ٹی وی ریڈیو کی ایجاد پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ شیطانی ڈبے ہیں تو کیا وہ اعتراض بالکل ہی بے وزن تھے یا یہ اعتراض کرنے والے اپنی دوراندیشی کی وجہ سے ان کے دوررس اثرات کا تو اندازہ لگانے میں کسی حد تک کامیاب رہے لیکن اپنی کم مائیگی کی وجہ سے اپنا مافی الضمیر صحیح انداز میں پیش نہ کر سکے۔ کیا آج ان کا یہ الزام صحیح نہیں ہورہا ہے؟ کچھ دیر کے لئے اپنے ملک ہی نہیں دنیا بھر میں پھیلی بے چینی اور بدامنی پر ایک نظر دوڑائیں اور ہمارے اس سوال کا جواب دیں کہ کیا اس بے چینی اور بدامنی کے پھیلاؤ میں زیادہ حصہ اسی ٹی وی اور ریڈیو کا نہیں ہے؟ پہلے دنیا بھر کے ٹی وی، ریڈیو (اس کو ہم اختصاراً میڈیا کہہ لیں) نے عراق پر عظیم تباہی والے ہتھیاروں کا الزام عائد کیا اور اتنا اتنا عائد کیا کے پوری دنیا اس کو سچ ماننے پر مجبور ہوگئی پھر دنیا بھر کی فوجوں نے مل کر عراق کا پورا پہاڑ کھود ڈالا اور اندر سے ایک مرا ہوا چوہا بھی برآمد نہ کر سکے۔ 9/11 کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور پاکستان کا بیڑہ غرق کر دیا اور نکلا کیا؟ صرف اسامہ بن لادن کی ایک مشکوک نعش۔۔۔ جس کا عینی شاہد بھی وہی ہے جو خود مدعی اور منصف بھی بنا ہے اور خود ہی ثواب بھی الٹا لے رہا ہے۔ کیا اب بھی آپ یہ نہیں مانیں گے کہ اس کو شیطانی ڈبہ کہنے والے کچھ زیادہ غلط نہیں تھے؟

آج ہم اپنے مولویوں پر الزام دھرتے ہیں کہ انہوں نے تو لاؤڈ اسپیکر کو بھی ابتدائی طور پر یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ یہ اس میں شیطان بولتا ہے لیکن جب مولویوں نے لاؤڈ اسپیکر کے مائیک کی طاقت دیکھی تو انہوں نے اسی مائیک کو ایسا پکڑا کے آج ہمارے ملک کی ہر ہر گلی میں دو چار مولوی یہ مائیک پکڑے بیٹھے ہوتے ہیں اور ایک حد تک تو ہم بھی ان معترضین سے اتفاق کریں گے کے کئی بار لاؤڈ اسپیکر کا اتنا غلط استعمال ہوتا ہے کے اہل محلّہ کی بیماری آزاری کا خیال کئے بغیر ہی لوگوں کی نیندیں اور آرام میں خلل پیدا کیا جاتا ہے۔ آج اگر ہم پرانے زمانے کے مولویوں کے اس اعتراض کو اگر یوں بیان کریں کہ مائیک میں شیطان بولتا ہے تو کیا یہ دعویٰ غلط ہوگا؟ اگر ہم یہ کہیں کے مائیک پر صادر کئے جاتے غیر مسلم کے الزامات اور فتوے دراصل شیطان کی ہی بولی تو ہے تو یقیناً ہماری ہاں میں ہاں ملانے کو پوری سول سوسائٹی، تمام اعتدال پسند اور ترقی پسندوں سمیت تمام ہی لوگ ہماری پشت پناہی کے لئے موجود ہوں گے۔ جب ہم یہ کہیں مائیک سے بٹنے والا ''ملک دشمن'' اور ''غدار'' کا سرٹیفکیٹ بھی تو دراصل شیطان ہی کی بولی ہے تو کتنے لوگ ہماری ہاں میں ہاں ملانے کو تیار ہوں گے؟ اس کی گواہی آپ کا دل ہی دے گا کیا یہ بھی مائیک کے شیطان ہونے

ٹی وی ریڈیو کی ایجاد پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ شیطانی ڈبے ہیں تو کیا وہ اعتراض بالکل ہی بے وزن تھے یا یہ اعتراض کرنے والے اپنی دوراندیشی کی وجہ سے ان کے دور رس اثرات کا اندازہ لگانے میں کسی حد تک کامیاب رہے۔

کے لئے کافی نہیں ہے کہ جب کسی ٹی وی کے ٹاک شو کا مائیک اتفاقاً ہمارے پاس آجائے تو ہم پر اس ملک کی اتنی محبت غالب آجاتی ہے کہ ہم اپنی جان بھی اپنے ملک کے لئے قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں، لیکن جب واپس گھر میں آتے ہیں تو سب سے پہلا شکایتی فون اپنے کیبل آپریٹر کو ہی کرتے ہیں کے میرے گھر کا کنکشن چیک کرو اسٹار پلس ٹھیک طریقے سے نہیں آرہا ہے یا تم نے اچھا بھلا سونی ٹی وی کو ۱۲ نمبر پر سیٹ کیا ہوا تھا یہ آج اچانک ۱۹ نمبر پر کیوں کر دیا؟ کیا تم کو اندازہ ہے تمہاری اسی حرکت سے مجھے کتنی ذہنی کوفت ہوتی ہے؟

کیا خیال ہے آپ کا اگر ہم آج کے اس e میل، e ٹکٹ، e بینکنگ اور e فائنگ کے اس دور میں ہم اِس مائک کو مائک کی بجائے ''e شیطان'' کہنے میں حق بجانب ہوں گے؟؟؟

کتاب میلے میں حُسن کے ٹھیلے اور گردن میں سریا

آج ہمارا موضوع جہازوں کی لینڈنگ نہیں، بلکہ اس شہد کی مکھی کی لینڈنگ ہے جسے اپنی لینڈنگ کے لئے گذشتہ دنوں وزیرِ اعظم جناب نواز شریف کا سرخ وسفید گال پسند آگیا تھا۔ یہ خبر آپ نے بھی پڑھی ہوگی کہ ابھی چند دن پہلے جب وہ ساہیوال کول پاور پراجیکٹ کا دورہ کر رہے تھے، کسی طرف سے ایک شہد کی مکھی اڑتی ہوئی آئی اور اس نے ان کا سرخ و سفید، پھولا ہوا گال اپنی لینڈنگ کے لئے پسند کرلیا اور مزے سے وہاں لینڈ کر گئی۔ اس وقت جناب نواز شریف پراجیکٹ کے دورے کے دوران اخبار نویسوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ گورنر پنجاب رفیق رجوانہ بھی تھے، دیگر وزراء اور حکّام بھی ہوں گے، سیکورٹی کا سٹاف بھی ہوگا، اور ان سب کی موجودگی میں ایک گستاخ شہد کی مکھی نے یہ حرکت کر ڈالی۔ نواز شریف تو سٹیل مل کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ آہنی اعصاب کے بھی مالک ہیں اس لئے انہوں نے اس گستاخ مکھی کا کوئی نوٹس لئے بغیر گفتگو جاری رکھی مگر گورنر رفیق رجوانہ اس پر خاصے پریشان ہوئے، آخر ایک اخبار نویس نجات دہندہ بنا اور اس نے ہاتھ ہلا کر یہ مکھی اڑا دی اور تب گورنر صاحب بھی پُر سکون دکھائی دیئے۔ اگر خود رفیق رجوانہ کے گال پر مکھی بیٹھی ہوتی تو شاید وہ اتنے پریشان نہ ہوتے، مگر وزیرِ اعظم کے گال پر مکھی کا بیٹھنا؟؟ توبہ توبہ!

حیرت ہے کہ تا حال کسی کالم نویس، کسی وزیر، کسی بیان باز شخصیت نے اس مکھی کی جرأتِ رندانہ بلکہ جرأتِ احمقانہ پر کوئی بیان نہیں دیا، اور مزید حیرت اس پر ہے کہ وہ مکھی ابھی تک زندہ بھی ہے اور آزاد بھی۔ کوئی ہما شما ہوتا تو شاید اب تک جیل کی ہوا کھا رہا ہوتا۔

ہماری حِسِ مزاح نے اس شہد کی مکھی کے اِس اعلیٰ ترین سرکاری گال پر بیٹھنے کے بارے میں کئی پہلو تراش کر لئے ہیں، اور یہ بھی سوچا ہے کہ کون کون سا سیاستدان اس صورت حال پر کیا کیا بیان دے سکتا تھا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اگر سیاستدانوں نے اِس کا نوٹس لیا ہوتا تو کیا کیا بیان شائع ہوئے ہوتے۔ جناب پرویز رشید نے تو اسے فوراً پی ٹی آئی اور عمران خان کی سازش قرار دے دیا ہوتا۔ دیگر کچھ وزیروں نے بھی عمران خان اور طاہر القادری کے دھرنے کو اس کا سبب قرار دے دیا ہوتا۔ شہباز شریف نے مکھی کو چوبیس گھنٹوں کے اندر تلاش کر کے پیش کرنے کا حکم دیا ہوتا تا کہ اسے الٹا لٹکا دیا جائے۔ اگر اہلکار اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہتے تو انہیں فوری طور پر برخواست کر دیا جاتا۔ شیخ رشید احمد نے سگار کا کش لگاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے ٹی وی چینل کی

کی دلیل میں ان کے جاری کردہ فرمان کا حوالہ دیتے ہیں جس کے تحت ایک مرتبہ پھر پی ٹی وی کی نیوز کاسٹرز کے لئے دوپٹہ اوڑھنا لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ (یہاں ''کی نیوز کاسٹرز'' کے الفاظ ہیں، مرد نیوز کاسٹرز پر ایسی کوئی پابندی نہیں!)۔

یارو، پی ٹی وی کی نیوز کاسٹرز پر ایسی پابندیاں لگ گئیں، اچھا ہوا، مگر خدا کا شکر ہے کہ کتاب میلے میں شریک خواتین پر ایسی کوئی

پی ٹی وی کے چیئر مین جناب عطاء الحق قاسمی پارلیمنٹ کی قائمہ کمیٹی میں اپنے اختیارات کے بارے میں بڑی معنی خیز بات کہہ گئے کہ ''میرے اختیارات وہی ہیں جو صدر مملکت ممنون حسین کے ہیں''۔ اب یہ اندازہ پڑھنے والا خود لگا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اختیارات بہت زیادہ ہونے کی بات کی تھی یا صدر ممنون حسین کے اختیاراتِ بے اختیارانہ کی بات کہی تھی۔

پابندی نہیں تھی جن میں سے کئی خواتین (کچھ دو اور تین نمبر شاعرات سمیت) تو باقاعدہ حسن کے ٹھیلے کی طرح سج دھج اور بن ٹھن کر میلے میں شریک ہوئی تھیں اور جو کسی بھی معروف ادیب و شاعر کے ساتھ اپنی سیلفیاں بنوانے میں اتنی زیادہ مصروف تھیں کہ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ کون سے ہال یا کمرے میں کون سا ادبی پروگرام چل رہا ہے۔ یہاں فلمسٹار ریما خان کا ذکران کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان کی ادب نوازی اور ادبی ذوق کے حوالے سے بھی ضروری ہے جو کچھ ایونٹس میں عطاء الحق قاسمی کے ساتھ سٹیج پر بڑے طمطراق سے جلوہ افروز تھیں، اور کتاب خوانی میں انہوں نے جس روانی اور عمدہ تلفظ کے ساتھ جناب عطاء الحق قاسمی کی ایک تحریر پڑھی اس نے تحریر کا لطف دوبالا کر دیا۔ کتاب میں سے یہ چھپی ہوئی پوری تحریر پڑھتے ہوئے انہیں جو لفظ بہت مشکل لگا اور جس پر وہ بری طرح اٹک گئیں اور جس پر مردِ بحران محبوب ظفر فوراً ان کی مدد کو آئے وہ ''برادرم'' تھا! قارئین اس لفظ کی گہرائی میں جتنا اتریں گے اتنا ہی ریما کی اس پر اٹکنے کی ادا پر لطف اندوز ہوں گے۔

جناب عطاء الحق قاسمی نے اس کتاب خوانی کے سیشن میں جو مضمون اپنی کلیات میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا وہ اپنی جگہ خاصے

فلمسٹار ریما خان کا ذکران کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان کی ادب نوازی اور ادبی ذوق کے حوالے سے بھی ضروری ہے جو کچھ ایونٹس میں عطاء الحق قاسمی کے ساتھ سٹیج پر بڑے طمطراق سے جلوہ افروز تھیں، اور کتاب خوانی میں انہوں نے جس روانی اور عمدہ تلفظ کے ساتھ جناب عطاء الحق قاسمی کی ایک تحریر پڑھی اس نے تحریر کا لطف دوبالا کر دیا۔ کتاب میں سے یہ چھپی ہوئی پوری تحریر پڑھتے ہوئے انہیں جو لفظ بہت مشکل لگا اور جس پر وہ بری طرح اٹک گئیں اور جس پر مردِ بحران محبوب ظفر فوراً ان کی مدد کو آئے وہ ''برادرم'' تھا۔

کی چیز تھا کہ یہ ایک ریٹائرڈ طوائف کی طرف سے اپنی بیٹی کو لکھا گیا ایک خط تھا جو کہ ''ورکنگ طوائف'' تھی۔ اس کے ایک ایک جملے پر سامعین نے جس طرح داد دی اس سے اس شہپارے کی عمدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ البتہ ہمارے ایک ساتھی کو اعتراض تھا کہ ریما خان کو سامنے بٹھا کر ایسا مضمون نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔

کتاب خوانی کے اس سیشن میں شرکت کر کے اور بعد میں بھی ہم پر جناب عطاء الحق قاسمی کے ایک اور وصف کا واضح طور پر انکشاف بھی ہوا کہ پی ٹی وی کا چیئر مین بننے کے باوجود اُن کی گردن میں سریا پڑنے کی کوئی علامات دکھائی نہیں دیں۔ سیشن کے دوران وہ اپنے بائیں طرف بیٹھے ہوئے صاحبِ صدر کو مسلسل نظر انداز کر کے اپنی دائیں طرف بیٹھی ہوئی ریما خان کی طرف ہی جھک جھک کر باتیں کرتے رہے، ظاہر ہے اگر گردن میں سریا ہوتا تو وہ اتنا کیسے جھک سکتے تھے؟ اور سیشن میں شرکت کے بعد انہوں نے جس طریقے سے ہماری طرف بڑھ کر معانقہ کیا اس سے تو ہمارا یہ یقین مزید محکم ہو گیا کہ واقعی ان کی گردن میں ہرگز سریا نہیں ہے۔

یومِ تکبیر کا ہیرو

مزاح مت

کے ایم خالد
kmkhalidphd@yahoo.com

اُسے بچپن سے ہی مشہور ہونے کی خواہش تھی اپنی اس خواہش کے احترام میں وہ کچھ نہ کچھ نیا کرتا رہتا تھا لیکن وہ دن نہیں آ رہا تھا کہ جب اس کا نام پوری دنیا میں گونجے۔ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پٹھوگرم کھیل رہا تھا کہ ساتھ والی گلی کے بچوں کی ٹولی نعرہ تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ادھر سے گزری وہ بھی اس ٹولی میں شامل ہو گیا۔ اسے پتہ چلا کہ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں پاکستان نے بھی ایٹمی دھماکے کر دیے ہیں ایک جذبہ تھا جو گلی محلوں میں جاگ اٹھا تھا قومی ترانے جذبات کو بڑھاوا دے رہے تھے اور وہ انہی ٹولیوں کے ساتھ نعرہ تکبیر کے نعرہ کا جواب دیتا۔حکومت نے ایٹمی دھماکوں کے دن کو ایک قومی نام دینے کا سوچا اخبارات ریڈیو، ٹی وی پر حکومت کی طرف سے پوری قوم کو اس دن کے نام کے انعامی مقابلے میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا اس کے باپ نے اپنے آٹھ سال کے بیٹے سے پوچھا" تمہارے خیال میں اس دن کا کیا نام ہونا چاہیے۔۔؟" اس نے اپنے دیدے گھمائے اور کہا" پٹاخے"

"اونیں کاکے۔۔! پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے ہیں اس دن کا نام رکھنا ہے ہو سکتا ہے تمہارا رکھا ہوا نام حکومت کو پسند آ جائے تم دنوں میں پوری دنیا میں مشہور ہو جاؤ گے"۔

"پاکستانی دھماکے، کیسا رہے گا۔۔۔؟"۔

"اچھا جو تم نعرہ لگا رہے تھے وہی نام نہ رکھ دیں"۔

"نعرہ تکبیر" اس نے حیرانی سے کہا

"نہیں یوم تکبیر"۔

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی یوں گردن ہلائی جیسے سمجھ گیا ہو۔یوں یوم تکبیر فائنل کر کے خط بھیج دیا گیا اب انتظار تھا اس کے جواب کا گلی کے ڈاکیے نے اس گلی سے ہی گزرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ روزانہ جواب دے دے کر زچ آ گیا تھا لیکن وہ بھی دھن کا پکا تھا کسی نہ کسی گلی میں ڈاکیے کو پکڑ ہی لیتا تھا اور پھر ڈاکیا ہوتا اور اس کا پروگرام ہوتا" جوابدہ"۔

اب تو اس کا پڑھائی میں بھی دل نہیں لگتا تھا اور پھر ایک دن ڈاکیا اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا ایک خط تھا جو حکومت کی طرف سے تھا ڈاکیے نے اسے شاباش دے کر اس سے پانچ روپے کا نوٹ شاباشی میں لیا تھا اس کے ابا نے خط پڑھ کر اسے بتایا کہ حکومت نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اس نے پاکستان کے ایٹمی دن کا نام یوم تکبیر رکھا اب جلد ہی حکومت اسے انعام و اکرام سے نوازنے کے اسلام آباد بلائے گی پھر ایک دن اس نے خبرنامے میں یہ خبر

اُسے پتہ چلا کہ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں پاکستان نے بھی ایٹمی دھماکے کر دیے ہیں ایک جذبہ تھا جو گلی محلوں میں جاگ اٹھا تھا قومی ترانے جذبات کو بڑھاوا دے رہے تھے اور وہ انہی ٹولیوں کے ساتھ نعرہ تکبیر کے نعرہ کا جواب دیتا۔

دیکھی کہ ایک رنگ ساز کو یوم تکبیر کا نام رکھنے پر ایک لاکھ روپے حکومت کی طرف سے دیے گئے ہیں۔اس نے اپنے ابا سے گلوگیر لہجے میں کہا" یہ بیانچی ہے، نام میں نے رکھا اور انعام کسی اور کو دے دیا"۔

”کاکے۔۔۔! تمہارا انعام انہوں اپنے پاس رکھ لیا ہے کیونکہ تم ابھی چھوٹے ہو جب تم بڑھے ہو جاؤ گے وہ تمہیں تمہارا انعام واپس کر دیں گے“۔

”میں اس شخص سے اپنا انعام واپس لوں گا“۔

”او یار، اس شخص سے نہیں حکومت سے۔۔۔ہو سکتا ہے کسی دن حکومت ایک خط لکھ کر تمہیں اسلام آباد بلا لے بس تم ذرا اپنے ڈاکیے پر نظر رکھو“۔

اس نے ڈاکیے پر نظر رکھنی شروع کر دی اس روز روز کی تھانیداری پوچھ گچھ سے ڈاکیا اس کے علاقے سے اپنا تبادلہ کروا گیا اور پھر تو یوں جیسے تبادلوں کی لائن ہی لگ گئی ہو آخر محکمہ ڈاک کو ایک جوان سال ڈاکیا تعینات کرتے ہوئے اس کی تعیناتی کے احکامات میں یہ لکھنا پڑا کہ تمہاری ریٹائرمنٹ تک تمہاری ڈیوٹی اسی علاقے میں رہے گی۔

یہ بات اس کے ساتھ ہی جوان ہوئی کہ حکومت نے اس بتایا ہوا نام تو رکھ لیا لیکن اس کے عوض کچھ نہیں دیا اب وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کہ یوم تکبیر کا نام رکھنے والے سینکڑوں میں ہیں، قرعہ اندازی میں نام صرف رنگساز کا ہی نکلا تھا جسے حکومت نے انعامی رقم دی باقی سب کو سرٹیفکیٹ دے دیے گئے تھے وہ سر پر جناح کیپ رکھے اپنے ”حق“ کی خاطر کوشش کر رہا ہے اب اس کا ٹارگٹ انعامی رقم نہیں بلکہ پاکستان کے قومی ہیروز کی فہرست میں نام اور ایک سرکاری ملازمت ہے جس کے لئے تعلیم اس نے دیارِ غیر سے لی ہے۔ اپنے ”حق“ کے اس سفر وہ شمالی علاقہ جات میں بھی ہو تو پھر بھی گھر فون کر کے ضرور پوچھ لیتا ہے کہ ڈاکیا کوئی سرکاری خط تو لے کر نہیں آیا۔

اس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی کمرے میں زیرو بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا کوئی جناح کیپ پہنے کھڑا تھا وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اس کے منہ سے نکلا ”او جناح صاحب خود تشریف لائے ہیں، دیکھیں جناح صاحب آپ کے دیس میں میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے“۔

”میں تمہارا رفیق ہوں دوست، تمہارا ضمیر تمہارا بوجھ ہلکا کرنے آیا ہوں“۔

”تم جانتے ہو مجھے تمہاری ضرورت نہیں کیوں تنگ کرنے آ جاتے ہو۔۔۔؟“

”میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں بات دراصل یہ ہے۔۔۔“

”تو یوں نہیں مانے گا“۔ اس نے بیڈ سے اتر کر الماری کھول کر اس میں سے ایک لمبی سرنج اور ٹیکہ نکالا تھا۔

”اچھا چلا جاتا ہوں“۔ ضمیر نے گھبرائے ہوئے جناح کیپ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا ”پہلے ہی ٹیکے سے ایک مہینے بعد کچھ اوسان بحال ہوئے تھے“۔

اس کی آنکھ کیوں کھلی اسے کچھ یاد نہیں تھا وہ شائد سوتے وقت بلب بند کرنا بھول گیا تھا کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی جناح کیپ اس کے سر پر تھی جو وہ رات بغیر اتارے سو گیا تھا کمرے میں ضمیر کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

جدید خط ۔ ردی فروش کے نام

چنگارا سینٹر

۲۸ مئی ۲۰۰۰ء

محترم ادب فروش صاحب: السلام علیکم

پچھلے دنوں ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ سارا جدید ادب بکسٹالوں سے زیادہ آپ کے پاس ملتا ہے اور اِن جدید ادبی کتابوں کی یہ خاصیت ہے کہ اِن کا کاغذ نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ ادب کی کوالٹی تو اِن کتابوں کے آپ کے پاس ہونے سے ہی ظاہر ہے تو محترم ایسی ۱۰۰ عدد کتب پیک کر کے بھجوا دیں جن کو پڑھنے کی غلطی کسی نے نہ کی ہو کیونکہ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے گاہکوں کو اچھے سے اچھے کاغذ میں پکوڑے لپیٹ کر دوں۔

والسلام

طیفا پروپرائٹر، چنگارا سینٹر

قلم آرائیاں از خادم حسین مجاہد

عقرب ادیب شاعر اور صحافی دانشور

عقرب برج رکھنے والے ادیب ،شاعر اور صحافی دانشور بڑے متلون مزاج اور بے حد جذباتی ہوتے ہیں یہ جلد غصے میں آ جاتے ہیں اور محض ذرا سی بات پر مشتعل ہوکر فوراً مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں چونکہ بڑے گرم مزاج بلکہ گرم دماغ ہوتے ہیں اور ان کا موافق رنگ سرخ جبکہ نشان بچھو ہوتا ہے اس لئے ان سے ذرا بچ کر رہنا چاہیے کیونکہ یہ پیدائشی طور پر ہائی بلڈ پریشر کے مریض سمجھے جاتے ہیں، بحث و تکرار سے ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور پھر یہ بیحد غضبناک ہو جاتے ہیں اپنی تخلیقات پر تنقید تو بالکل ہی برداشت نہیں کر سکتے اور اگر کوئی یہ غلطی کر بیٹھے تو پھر اسے فوراً مزا چکھا دیتے ہیں۔ یہ جسمانی طور پر مضبوط اور عموماً بھاری بھرکم جثے کے حامل ہوتے ہیں ہر معاملے میں بالا دست رہنا پسند کرتے ہیں اور اکثر لڑ بھڑ کر اس میں کامیاب رہتے ہیں انہیں شکست کسی بھی قسم کی پسند نہیں۔

دشمن کی طرح بیماری سے بھی نہیں گھبراتے اور اپنی اپنی مضبوط قوت ارادی کے باعث بیماری کو بھی شکست فاش دیدیتے ہیں ،چھوٹی موٹی بیماریاں خود بھی ان سے دور رہتی ہیں ڈاکٹرز اور حکیموں کو ایک آنکھ نہیں بھاتے ،کھانا ان کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے بڑے خوش خوراک ہوتے ہیں ڈٹ کر کھاتے ہیں اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہتے ہیں جس کے باعث عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر یہ دمہ اور تبخیر معدہ جیسے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ یہ بیماریاں جلد ہی انہیں عمر کے آخری حصے میں پہنچا دیتی ہیں ویسے یہ اپنی عمر سے بہت چھوٹے نظر آتے ہیں آپ انہیں برخوردار سمجھ کر ملیں گے مگر بعد میں آپ کو اس انکشاف پر سخت شرمندگی کا احساس ہوگا کہ آپ تو خود انکے برخورداروں کے ہم عمر ہیں۔

بیشتر عقرب دانشور بڑے ہی خود پسند اور خوددار ہوتے ہیں کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے ، شدت پسند طبیعت کے باعث میانہ روی کے قائل نہیں ہوتے ، دوستی اور دشمنی میں بہت آگے تک چلے جاتے ہیں، دشمن ہی نہیں کسی قسم کا اختلاف رائے رکھنے والے دوستوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ ان میں برداشت کا مادہ بہت کم بلکہ برائے نام ہی پایا جاتا ہے کسی کا بھی لحاظ نہیں

> **ادبی، سیاسی اور ثقافتی موضوعات پر گھنٹوں بول سکتے ہیں بلکہ ہر وقت بولتے ہی رہتے ہیں اور دوسروں کی کم سنتے ہیں انہیں پیدائشی دانشور قرار دیا جا سکتا ہے۔**

کرتے بدزبانی میں تو کوئی دانشور ان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا چونکہ یہ بڑے منہ پھٹ نقاد ہوتے ہیں اس لئے ادبی مخالفین ہی نہیں قریبی احباب بھی ان سے محتاط بلکہ کسی حد تک خائف رہتے ہیں اپنی زبان درازی کی بدولت یہ اکثر نقصان بھی اٹھاتے ہیں لیکن انہیں اپنے نفع ونقصان کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اپنی بدزبانی پر قابو پانے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ اگر کوشش بھی کریں تو اس میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کی زبان ان کے قابو سے باہر ہوتی ہے۔

ہمیشہ پسندیدہ لوگوں میں گھرے رہنا پسند کرتے ہیں اور ناپسندیدہ لوگوں کو اپنے قریب ہی نہیں پھٹکنے دیتے قدرے بلکہ بہت زیادہ مغرور بھی ہوتے ہیں دوسروں کی کوئی کوئی پرواہ نہیں

کرتے البتہ خود کو نظر انداز کیا جانا برداشت نہیں کر سکتے اپنے موقف پر سختی سے ڈٹ جاتے ہیں خواہ ان کا موقف غلط ہی کیوں نہ ہو اور اکثر ان کا موقف غلط ہی ہوتا ہے، اگر کسی محاذ پر ڈٹ جائیں تو انہیں ان کے مقام سے ہٹانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے، دیگر دانشوروں کے برعکس لڑائی جھگڑے سے نہیں گھبراتے دوسروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اپنی خوشی کی خاطر دوسروں کو آپس میں لڑا دیتے ہیں۔ بڑے شکی مزاج بلکہ حد

جس کسی پروفیسر، ادیب، شاعر، ڈرامہ نویس، نقاد، محقق، کالم نگار اور صحافی کو آپ شکی، وہمی، جلد باز، بدمزاج، انتہا پسند، خودغرض، ضدی، ہٹ دھرم اور مطلق العنان پائیں تو سمجھ لیں کہ اس کا برج ضرور عقرب ہوگا۔

سے زیادہ وہمی ہوتے ہیں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتے ہر کسی کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اپنے معاملات کو راز میں رکھنے کے عادی ہوتے ہیں دل کی بات اور ارادوں کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے، بڑے ہی تجسس پسند ہوتے ہیں اور اسرار ورموز میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں، جاسوسی ناول شوق سے پڑھتے ہیں، یہ پرکشش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں دوسروں کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور جو متوجہ نہیں ہوتے انہیں خود بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، شوباز اور شوقین مزاج بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں ادب کے ساتھ ساتھ شوبز اور سیاسی معاملات میں بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں ادبی، سیاسی اور ثقافتی موضوعات پر گھنٹوں بول سکتے ہیں بلکہ ہر وقت بولتے ہی رہتے ہیں اور دوسروں کی کم سنتے ہیں انہیں پیدائشی دانشور قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ تیز تیز بولتے اور تیز تیز ہی چلتے ہیں اس کے باوجود ان کیلئے وقت پر کہیں پہنچنا اور وعدہ نبھانا بیحد مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے ان کے وعدے پر اعتبار کرنے والے ہمیشہ گھاٹے میں ہی رہتے ہیں، عقرب افراد یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہوتے رہتے ہیں، یہ حاسد بھی بڑے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں حسد کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے کسی کو خود سے آگے نکلتے نہیں دیکھ سکتے اور جو کوئی ان سے آگے نکلنے کی کوشش کرے اسے منہ کے بل گرا دیتے ہیں، زبانی کلامی تو جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں مگر اپنے عملی اقدامات کے ذریعے آمریت پسندی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں دراصل یہ برج ہی آمروں کا سمجھا جاتا ہے دنیا کے مشہور سابق فوجی اور سول آمر حکمرانوں ہٹلر، ڈیگال، سکندر مرزا، صدام حسین، مارگریٹ تھیچر، اندرا گاندھی کے علاوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا برج بھی عقرب ہی تھا۔

عقرب دانشور زندگی گزارنے کیلئے اپنے راستے خود چنتے ہیں، اپنے اصول اور ضابطے وغیرہ بھی خود بناتے ہیں دوسروں کے اصولوں یا مشوروں کو اہمیت نہیں دیتے اور جو کوئی انہیں زبردستی مشورہ دینے کی غلطی کر بیٹھے وہ پھر ساری عمر پچھتاتا رہتا ہے اور اس کے بعد کسی کو مفت مشورہ دینے کی جرات نہیں کرتا، جھگڑالو طبعیت

دنیا کے مشہور سابق فوجی اور سول آمر حکمرانوں ہٹلر، ڈیگال، سکندر مرزا، صدام حسین، مارگریٹ تھیچر، اندرا گاندھی کے علاوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا برج بھی عقرب ہی تھا۔

کی وجہ سے عقرب افراد کیلئے کسی کی ماتحتی میں کام کرنا بیحد مشکل ہوتا ہے کیونکہ اپنے کام پر کسی قسم کی نگرانی اور ضابطوں کی پابندی بالکل برداشت نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنے کاموں میں دوسروں کی مدد طلب کرتے ہیں چونکہ غصہ ہر وقت عینک کی طرح ان کی ناک پر رکھا رہتا ہے لہٰذا صرف وہی لوگ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ گزارا کر سکتے ہیں جو انہیں غصہ نہ دلائیں، عقرب ادیب، شاعر، دانشور زیادہ تر درس و تدریس، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور دیگر تحریر و تحقیق کے شعبوں سے منسلک ہوتے ہیں اور جس کسی پروفیسر، ادیب، شاعر، ڈرامہ نویس، نقاد، محقق، کالم نگار اور صحافی کو آپ شکی، وہمی، جلد باز، بدمزاج، انتہا پسند، خودغرض، ضدی، ہٹ دھرم اور مطلق العنان پائیں تو سمجھ لیں کہ اس کا برج ضرور عقرب ہوگا۔

فون اُٹھایا تو وہ بولی
"میرے دلبر! میرے ساجن!!"

(کون ہے یہ بیہودہ لڑکی
ختم ہوا نہ جس کا بچپن)

"شغل ہے میرا کالیں کرنا
مل گیا نمبر آپ کا فوراً
آن بسو تم من کے اندر
سُونا ہے یہ دل کا آنگن"

"نمبر دو پھر بات کروں گا
پیش ابھی ہے کچھ مجھے الجھن"

"لگتی ہوں میں اِتنی بھولی
اچھا ہے ون۔وے کمنی کیشن
پھنس جاؤں گی دے کر نمبر
کٹوا دو گے میرا کنکشن"

کیسے میں اُس کو بتلاتا
پھنس تو گئیں تم جان کی دشمن
کیونکہ میں نے لگا رکھی تھی
کالرز لائن آئی ڈینٹی فکیشن

شوہر اور جانور

شہاب ظفر

شوہر و جانور میں تعلق بلا کا ہے
اِک ہے زباں دراز تو اِک بے نوا سا ہے
جنگلی بھی شوہر ہوتے ہیں اور پالتو سے بھی
کچھ جانور ہیں کام کے کچھ فالتو سے بھی
کچھ anumals سے تو بظاہر یہ ہلکا ہے
گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ملکہ ہے
بیوی کبھی مطالبہ جو مہر کا کرے
گیدڑ کی طرح شوہر بھی رُخ شہر کا کرے
بیوی اور ماں کے بیچ میں فٹبال بن گیا
دھوبی کا کتا جس طرح گھر کا نہ گھاٹ کا
کچھوے کی طرح جاتا ہے سسرال کی طرف
خرگوش بن کے لپکے حسیں مال کی طرف
شوہر کے گھر نہ چاہیئے بیگم کو خیر کیا؟
دریا میں رہ کے رکھے مگرمچھ سے بیر کیا؟
ڈھلتے ہی شام گھر سے تو بھاگا کرے ہے وہ
الّو کی طرح رات کو جاگا کرے ہے وہ
سالے سے اور سالیوں سے بھی ملتا ملاتا ہے
ساس اور سسر کے سامنے وہ منمناتا ہے
سرگرمیوں پہ اس کی جو بیوی کو شک گیا
چوہے کی طرح پھرتی سے بل میں دُبک گیا
شوہر کے پاس گر تو ستانے کے اور ہیں
کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں
شوہر کو ایک پہلو پہ یوں بیٹھنا پڑا
سیدھی ہے اس کی کون سی کل دیکھنا پڑا
شوہر کی بیگمات ہوں قسمت سے دو یا تین
اُن کو بجانی بھینس کے آگے ہے پھر تو بین
ویسے تو اس پہ غصہ کئی بار آ گیا
بلّی کی طرح پھر بھی کبھی پیار آ گیا

شاپنگ کا گر پلان میاں نے بدل دیا
چیونٹی سمجھ کے بیوی نے پل میں مسل دیا
اس کو تم اپنے ڈھب سے یونہی ہانکتے رہو
کھوتے کی طرح اس پہ وزن لادتے رہو
اِن خصلتوں کے بعد بھی respect ہی نہیں
قانون میں تو شوہری کا act ہی نہیں
بہبودِ شوہراں کوئی اسکیم تو بنے
اِن کے حقوق کی کوئی تنظیم تو بنے

(علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

محمد خلیل الرحمٰن

تو نے موبائل جو چھینا ہے تو چلاتا ہوں میں
یوں تجھے اپنے تئیں نامہرباں سمجھا ہوں میں

کیوں رُلاتا ہے مجھے تو بار بار اے نوجواں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں

آہ! کیوں مجھ کو رُلانے سے تجھے یوں پیار ہے
کھیلنا کیا تیرے موبائل سے اِک آزار ہے؟

گیند ہے میری کہاں، چینی کی بلی ہے کدھر؟
وہ ذرا سا جانور، ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

ہاں! کھلونوں میں یونہی مصروف میرا دل رہے
اور ہمیشہ ہاتھ میں تیرے یہ موبائل رہے

کھیلتا رہتا ہے موبائل سے اپنے ہر گھڑی
اور ایسے کھیل میں اب تجھ کو میری کیا پڑی

آج تک ہر شے کو میرے واسطے لاتا رہا
میری خاطر اپنے دِل کو یونہی بہلاتا رہا

آج تجھ کو ایک موبائل میسر آگیا
آرزوؤں پر تری اِک خواب بن کر چھا گیا

چھا گیا ہر خواب پر مثلِ غبارِ آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو

ہاتھ کی جنبش میں، طرزِ دید میں پوشیدہ ہے
دیکھنے والا ہر اک اس حسن کا گرویدہ ہے

ہاتھ میں لے لوں، بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
چھینتا ہے مجھ سے فوراً، اور من جاتا ہے تو

آہ اس عادت میں ہم آہنگ ہے تو بھی مرا
میں تلوّن آشنا، تو بھی تلوّن آشنا

تیری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ میری نادانی سے نادانی تری

میری صورت گاہ خنداں، گاہ گریاں تو بھی ہے
دیکھنے کو نوجواں ہے، طفلِ ناداں تو بھی ہے

موٹر سائیکل

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نہ موٹر کار جیسی ہے نہ ہے یہ سائیکل جیسی
یہ موٹر سائیکل ہے صرف موٹر سائیکل جیسی

بُلند و پست یکجا کر کے کیا صورت نکالی ہے
مِڈل طبقے کی یہ گویا مخنث اِک سواری ہے

غرور و کبر و نخوت سے نہ کوئی واسطہ اِس کا
فقط بیچارگی کا ، عجز کا ہے راستہ اِس کا

جگہ کم ہے مگر دل کی فراخی کا یہ عالم ہے
لدی ہے فیملی پوری سفر کا شوق پیہم ہے

میاں بیوی اور ان کے چار بچے اسطرح لٹکیں
دکھاتے ہوں تماشا جیسے ''جوکر'' کوئی کرتب میں

یہ موٹر سائکل صورت نئی ہے گھڑ سواری کی
ہے جسکی ہارس پاوَر ایک سو بیس اسپ تازی کی

سفر میں دھول کھاتی ہے، بہت مٹی اُڑاتی ہے
سواروں کا بہت عمدہ یہ میک اپ بھی کراتی ہے

سنواریں زلف کو کیسے نہیں کچھ اختیار اپنا
اُڑاتی ہے یہ بال ایسے لگے شاعر سوار اِس کا

سفر کے ساتھ اِتنی دُور تک گردِ سفر جائے
کہ موٹر سائکل والے سے آئینہ بھی ڈر جائے

اٹی ہے دھول چہرے پر کہ ویرانی نہیں جاتی
کہ اب تو شکل بھی خود اپنی پہچانی نہیں جاتی

غرض مجنوں کی صورت سوئے دفتر ایسے جاتے ہیں
کہ بچے دیکھ کر ہنستے ہیں اور سیٹی بجاتے ہیں

مگر بچّوں کی سیٹی سے بھلا ہو خوف کیوں ہم کو
سپاہی کو اگر دیکھیں تو سِٹّی گم ہماری ہو

چمک اٹھے پولس والوں کا چہرہ دیکھ کر ہم کو
پھڑک اٹھے رگِ رشوت تو چلائیں رکو، ٹھہرو

بچارو پہ نہیں چلتا ہے بس ، یوں خوار بیٹھے ہیں
پکڑنے کو ہمیں ہر دم مگر تیار بیٹھے ہیں

بہانے سو طرح کے پاس انکے ہیں مفر کب ہے
بنا چالان ہرگز کوئی بھی بخشش نہیں اب ہے

وہ سو کے نوٹ پہ قائد کو دیکھیں تو سلامی دیں
اور اس کے بعد ہی ہم کو نویدِ خوش خرامی دیں

ہر اک چوراہے ہر اک موڑ پہ نذرانہ دیتے ہیں
یہ ماہانہ نہیں بھتہ کہ ہم روزانہ دیتے ہیں

بنایا ہم کو موٹر سائیکل نے دید کے قابل
دیا جرمانہ عیدی کا رہے کب عید کے قابل

سبک رفتار موٹر سائیکل ہے غرغراتی ہے
خراماں گامزن ہو کوئی یہ ''ہورَن'' بجاتی ہے

بڑی مشہور ہیں ہر سمت دہشت گردیاں اس کی
پولس والے بھی کانپیں دیکھ لیں گر پھرتیاں اسکی

کیا ہے جرم موٹر سائیکل پہ کیونکہ مجرم نے
لگی پابندی ''ڈبلنگ'' پہ کیا انصاف ظالم نے

نہ پکڑا جا سکا ملزم تو موٹر سائیکل مجرم
ہوئی برباد سب نیکی گُنہہ بس ہوگیا لازم

عجب منطق یہاں پر ہے مضر ہر چیز اب ٹھہری
لگے گی کل سے قدغن دیکھنا چاقو چھری پر بھی

ڈبل پہ جب سے پابندی لگی ہم ہوگئے تنہا
خدا ہو حامی و ناصر غریبوں کی سواری کا

بابا لندن میں دل نہیں لگتا!!

عابی مکھنوی

"بابا لندن میں دل نہیں لگتا"
ڈیڈی پیرس بھی اب نہیں بھاتا
جتنے ساحل ہیں چھان مارے ہیں
مہنگے ہوٹل بھی بور کرتے ہیں
گوری پریاں عذاب لگتی ہیں
بابا بچپن کے دِن وہ اچھے تھے
دِل بہلتا تھا جب کھلونوں سے
اُف جوانی میں ایسی اُکتاہٹ !!
کیا کروں کیسے دِل کو بہلاؤں !!
منّے ایسی بھی کیا ہے مایوسی !!
بیٹا جُگ جُگ جیے یہ پیارا وطن
سوہنی دھرتی کو رب رکھے آباد
پیشہ باقی رہے سیاست کا !!
تیرے بابا کے اِک اشارے پر !!
منّے پلے کروڑ نکلیں گے
اُن کو آپس میں پھر لڑائیں گے
چھوڑو مغرب میں کچھ نہیں رکھا
جب کبھی دِل ترا یہ اُکتائے !!
آؤ کھیلو غریب لوگوں سے
اپنا دھندہ بھی ہے جانِ پدر !!
آؤ بیچو غریب لوگوں کو !!

ساتویں شیروانی

منظوم لطیفہ

پانچویں دلہن میاں گھر لائے سہرا باندھ کر
بے وقوفی پر نہیں شرمائے سہرا باندھ کر

گھر کے اندر جیسے ہی دلہن نئی داخل ہوئی
چار برقعوں پر اچانک ہی نظر اس کی پڑی

دیکھ کر برقعوں کو غصے میں چھبیلی ہوگئی
گھونگھٹ اٹھنے سے ہی پہلے لال پیلی ہوگئی

ہو بیاں ان چار برقعوں کی کہانی مختصر
چار برقعے جو ٹنگے ہیں شان سے دیوار پر

پوچھا دلہن نے بتاؤ چار برقعے کس کے ہیں
اتنے دلکش ریشمی رنگدار برقعے کس کے ہیں

دست بستہ ہو کے شوہر نے دیا اس کو جواب
اے شریکِ زندگی اے آفتاب و ماہتاب

ایک ہے رضیہ کا برقعہ دوسرا مہناز کا
تیسرا شبنم کا ہے اور چوتھا ہے ممتاز کا

ہوگئیں اللہ کو پیاری میری چاروں بیویاں
وہ بچاری قبر میں ہیں صرف برقعے ہیں یہاں

پانچویں برقعے کا ہے ان کھونٹیوں کو انتظار
پانچواں برقعہ تمہارا ہی ٹنگے گا اب کی بار

بولی دلہن آپ کو شاید نہیں ہے یہ خبر
اب کے یہ برقعہ نہیں ! ہے شیروانی داؤ پر

چار برقعے ٹانگ کر ہی اتنا اتراتے ہیں آپ
بیویوں کو اپنی قبرستان پہنچاتے ہیں آپ

جو بیاہ کر لائے ہو اس بار شرمیلی دلہن
آپ کی اس شیروانی کو بنا دے گی کفن

سابقہ مرحوم شوہر کی نشانی ٹانگ کر
آپ کے گھر آئی ہوں چھ شیروانی ٹانگ کر

ختم برقعے کی نہیں ! ہوگی کہانی آپ کی
ساتویں نمبر پہ ہے یہ شیروانی آپ کی

اَلّل ٹَپ

عبدالحکیم ناصف

گھر میں مرے اِک طرفہ تماشا ہے اَلّل ٹپ
ہر دوسرا ، ہر تیسرا بکتا ہے اَلّل ٹپ

میں نے تو یہ سمجھا مرا بیٹا ہے اَلّل ٹپ
بیٹا یہ سمجھتا ہے کہ ابا ہے اَلّل ٹپ

تائی نے بتایا ترا تایا ہے اَلّل ٹپ
چچی نے کہا چونک کے چچا ہے اَلّل ٹپ

دادی کا ہے اِصرار کہ دادا ہے اَلّل ٹپ
نانی نے کہا زور سے نانا ہے اَلّل ٹپ

مامی تھی بضد لِکھ ترا ماما ہے اَلّل ٹپ
ماموں نے جگت دی مرا بھانجا ہے اَلّل ٹپ

پُھپھا کے لیے جاننا چاہا تھا ذرا سا
پھپھو نے کہا پُورے کا پُورا ہے اَلّل ٹپ

مردوں پہ جو آفت تھی طِلسم اس کا یوں ٹوٹا
خالو نے بتایا تری خالہ ہے اَلّل ٹپ

خالہ کی مُمانی کی مُمانی کی ہے خالہ
بیگم سے مرا دُور کا رِشتہ ہے اَلّل ٹپ

پاپا ہی کا یہ ظرف ہے کہ مجھ کو سرِ بزم
بولے ابے ! تُو اُلّو کا پٹھا ہے اَلّل ٹپ

کہتی تھی بہو ساس تُو ہے نک چڑھی کھوسٹ
اور سُسر مرا تک کتا بڈھا ہے اَلّل ٹپ

صد شُکر بہن میری ہے سسرال میں رانی
بہنوئی مرا رِشوتی راجا ہے اَلّل ٹپ

بنگال کے جادُو کی ہے مُوجد مری بھابھی
تبلیغی ، نمازی مرا بھیا ہے اَلّل ٹپ

ہیں میری بھتیجی کے کئی دوست مخیّر
کنگلی کی محبت میں بھتیجا ہے اَلّل ٹپ

سالی کی میں ہوں زُلفِ گرہ گیر پہ قُربان
وہ "وِگ" زدہ ہم زُلف کا بچہ ہے اَلّل ٹپ

سسرال میں ہے ہائے! سُلیح میری "کرینہ"
اور "سیف علی خان" تو سالا ہے اَلّل ٹپ

سسرال میں اُٹھتے ہیں مری ساس کے شعلے
جُھلسا ہُوا فُٹ پاتھ پہ سسرا ہے اَلّل ٹپ

جائے تو غُلام اور نہ جائے تُو ہے مغرور
سسرال سے داماد کا رِشتہ ہے اَلّل ٹپ

شادی پہ دُلہن دیکھ کے چلّا کے میں رویا
مجذوب دُلہن کو مری بولا "ہے اَلّل ٹپ"

دُلہا ہے اَلّل ٹپ تجھے دُلہنیا مُبارک
مولا جسے دیتا ہے تو دیتا ہے اَلّل ٹپ

"سی ویو" کا نظارہ ہے مری جَل پری سمدھن
سمدھی تو سمندر میں "منوڑہ" ہے اَلّل ٹپ

ناصؔف یہ اَلّل ٹپ مجھے آیا ہے خیال آج
دُنیا ہے یہاں آوے کا آوا ہے اَلّل ٹپ

ہاتھ بس مُجھ کو تھماتی ہے "حمیرا" میری
لب تلک آئے کبھی کاش "تمنا" میری

زندگی "شمعِ کمرشل" ہو "رِموور کلچر"
صاف "کترینہ" کروڑوں میں ملے ہر دلبر

"نازیہ" زُلف کے سائے میں سُلائے مُجھ کو
"شازیہ" آ کے ہر اِک صبح جگائے مُجھ کو

میری "جگنو" کا بہت نرم کلیجا ہو جائے
"روشنی" مُجھ پہ فریفتہ ہو "اُجالا" ہو جائے

میرے اللہ! لگائی سے بچانا مُجھ کو
نیک "نسرینوں" کی راہوں پہ چلانا مُجھ کو

زندگی "سیف علی خاں" کی ہو صورت یارَب!
مُجھ کو مل جائے "کرینہ" کی رفاقت یارَب!

ہو مرا کام حمیدہ کی حمایت کرنا
اور "بلقیس و زرینہ" سے محبت کرنا

گوری محبوبہ کے بھائی سے بچانا مُجھ کو
کالے شیشوں لگی کاروں میں گھمانا مُجھ کو

ہو "ڈرگ مافیہ" کا "ڈان" مرا پیارا سسر
ہیروئن ساتھ میں لے جاؤں بلا خوف وخطر

فکر ناصفؔ کی بڑھاپے میں عُقابی کرنا
اب جوانی ہے مزید اِس کو گُلابی کرنا

عقیقے کا گوشت

شوکت جمال

سنا جب یہ کہ گھر میں گوشت آیا ہے عقیقے کا
خیال آیا کہ اس صدقے کا مصرف ہو سلیقے کا
جو پوچھا ہم نے بیگم سے کہو کیا کیا پکانا ہے
وہ بولیں، ہاں، مگر پہلے مجھے بھی کچھ بتانا ہے
کہا میں نے کہ چھوڑو تم ابھی بیکار کے قصّے
کہ قسمت سے ملا کرتے ہیں چھوٹے گوشت کے حصّے
کڑاہی گوشت پہلے تو بنا لو آج تم بیگم
ضروری تو نہیں کہ اس مبارک دن پکے شلجم
ہیں جتنی پسلیاں ان کی تو یخنی ہی بنا لینا
پئیں گے سردیوں میں ہم، ابھی اُس کو جما دینا
ہو تازہ گوشت تو بنتا ہے اِسٹو لاجواب اس کا
مسالہ اس قدر ڈالو، نہ ہو خانہ خراب اس کا
بنالو تم اگر چاہو تو تھوڑا سا ''مٹن ہنٹر''
ڈبل روٹی میں رکھ کے کھاسکیں ابّا مہینے بھر
کہا بیگم نے فرمائش تو سر آنکھوں پہ میرے ہے
مگر میری بھی سن لیتے، مجھے بھی فکر گھیرے ہے
جو کاٹی بات بیگم نے تو غصّے سے انہیں روکا
اڑائی ٹانگ کیوں تم نے، مجھے پھر کس لئے ٹوکا؟
نہیں ہوگا ہدایت پر اگر میری عمل بیگم
تو ہاتھ آیا ہوا بکرا بھی جائے گا نکل بیگم
ہے پالک گوشت سے رغبت؟ چلو وہ بھی بنا لو تم
مگر ایسا نہ ہو مرچیں کھڑی اُس میں نہ ڈالو تم
بھنا ہو گوشت دیسی گھی میں اور میتھی قصوری ہو
جو کھانے کے لئے بیٹھیں، تو روٹی بھی تنوری ہو
ٹماٹر گوشت کے سالن میں گاڑھا شوربہ بھی ہو
مٹر آلو ڈلیں، تیکھا سا اس کا ذائقہ بھی ہو
بنا لیتا ہوں میں خود ہی ذرا سا قورمہ شاہی
پلاؤ بھی، کہ خوشبو سے رکے جاتا ہوا راہی
ارادہ اس طرح باندھا خود اپنی میزبانی کا
خیال آیا نہ اک پل شیخ چلّی کی کہانی کا
پلاؤ میں مرے جیسے کوئی کنکر نکل آیا
دبا تھا اُن کے دل میں جو، وہ سب باہر نکل آیا
زمیں تھرّا رہی تھی اور فضا میں ایک ہلچل تھی
جو اپنی اہلیہ کے ہاتھ میں دیکھا تو چپّل تھی
گرج کر مجھ سے وہ بولیں، ابھی میکے میں جاتی ہوں
مگر پہلے تمہارے سر سے میں جن کو بھگاتی ہوں
یہ ہڈّی اور بوٹی کا محل میں ہی گراؤں گی
سنو یا مت سنو لیکن یہ تم سے کہہ کے جاؤں گی
نہ حسرت کوئی نکلے گی، نہ کوئی چاؤ نکلے گا
جو گوشت آیا ہے، تولو گے تو آدھا پاؤ نکلے گا

وصی شاہ / مجید امجد سے معذرت کے ساتھ

کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا بینگن ہوتا

تُو بڑے پیار سے چاؤ سے بڑے مان کے ساتھ
دستِ نازک سے مرے جسم کو چھیلا کرتی
اور پھر چاؤ سے کٹ کر مجھے دھویا کرتی
پھر کسی پیارے سے ککّر میں تو رکھتی مجھ کو
ہلکی سی آنچ میں چولہے پہ چڑھاتی مجھ کو
میں اِسی آنچ میں جا کر ذرا پک سا جاتا
پھر مجھے کانچ کے پیالے میں تُو ڈالا کرتی
اور پھر پہلے نوالے میں ہی نگھلا کرتی
میں ترے ہونٹوں سے ہو کر ترے اندر جاتا
پھر ترے پیٹ میں جا کر تجھے گدگد کرتا
رات کو جب بھی تُو نیندوں کے سفر پہ جاتی
میں ترے پیٹ کی آنتوں کو مروڑا کرتا
اور تُو درد کی شدت سے دھل سی جاتی
رات بھر پھر میں ترے ساتھ ہی جاگا کرتا
کچھ نہیں تو یہی بے نام سی الجھن ہوتا
کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا بینگن ہوتا

دنگلی مہمان

انجینئر عتیق الرحمٰن

بیوی ہے بہت موٹی تو خود بھی ہے پہلوان
اِک فوج ظفر موج بھی لایا ہے یہ مہمان

بچوں نے مچایا ہے مرے گھر میں وہ کہرام
جنات بھی بھاگے ہوئے پھرتے ہیں پریشان

رنگین ہیں ، دیوار ہو یا فرش ہو گھر کا
ہیں ان کے عجب مشغلے کھاتے ہیں بہت پان

مہمانوں کی وہ بھوک کہ انجام نہیں ہے
جب مرغ اُڑا لیتے ہیں کھاتے ہیں مرے کان

قبضہ ہے کچن پہ نہیں معلوم یہ کب تک
بیٹھا ہوں پریشان کہ کب چھوٹے مری جان

ٹھہریں گے مہینہ مرے گھر دنگلی مہمان
یہ سوچ کے ہوتے ہیں خطا میرے بھی اوسان

رجعتِ قہقہری

غضنفر علی

جانوں کہہ کہہ کے تھک گیا ہوں میں
میں نے مانا سنک گیا ہوں میں
تیرے رخسار کی تمازت پر
تیرے ہونٹوں کی ہر شرارت پر
تیرے تن کے سڈول ہونے پر
باقی سب کے ببول ہونے پر
تیری آنکھوں کی مہربانی پر
تیری اِس نوجوان نانی پر
جو لکھا آج تک وہ جعلی تھا
میں تو سنکا ہوا موالی تھا
آ تجھے آج شیشہ دکھلاؤں
آئینہ کیا ہے تجھ کو بتلاؤں
ترے رخسار ہیں نکھونے سے
ہونٹ ہیں دونوں تیرے بھونڈے سے
رنگ تیرا تو پھیکا پھیکا ہے
اِس سے اچھا تو پھپھنی کھجلہ ہے
تیری آواز صور جیسی ہے
تیری فگر فضول ایسی ہے
تجھ سے اچھی تو وہ بشیراں ہے
جس پہ فیصل عزیز شیداں ہے

شہباز چوہان

درد و غم کی ماری پلے پڑ گئی ہے
محبوبہ دُکھیاری پلے پڑ گئی ہے

پہلے اُس نے سونپے اپنے کام مجھے
پھر گھر کے بھی سب دے دیئے آلام مجھے
ہولی ہولی ساری پلے پڑ گئی ہے

بھائی بہنیں اماں ابا ، ساروں نے
میری کلّی جیب کو لُٹا ساروں نے
میرے دُنیا ساری پلے پڑ گئی ہے

راحت کا کوئی دن نہیں آیا بھائی جی
کبھی کمیٹی کبھی کرایہ بھائی جی
میرے ہر ذمہ داری پلے پڑ گئی ہے

درد کو اکثر کرتی ہے وہ mention بھی
acidity بھی ہے hypa tension بھی
میرے عجب بیماری پلے پڑ گئی ہے

اِن دنوں ہیں جاری رپھڑے جانو جی
سب کو لے کر دو نہ کپڑے جانو جی
جان سے مشکل بھاری پلے پڑ گئی ہے

جھجکے جھجکے شرمائے نہ کھنگے ہے
ہر اِک شے میں دسواں حصہ منگے ہے
وہ مثلِ زرداری پلے پڑ گئی ہے

ڈرائیوارانہ انتباہ

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

ایک شادی تن کی گاڑی کے لئے پٹرول ہے
دوسری شادی ڈرائیور کے لئے چھترول ہے

ایک تو رکھے گی فِٹ سوچوں کے انجن آپ کے
دوسری کردے گی ڈھیلے رنگ پسٹن آپ کے

ایک ہو گی تو بریکیں روک لیں گی ایکسیڈینٹ
دوسری ڈالے گی اکثر آپ کے چہرے پہ ڈینٹ

جب ہوئی پہلی سے کچھ انڈرسٹینڈنگ آپ کی
دوسری کر دے گی منٹوں میں ٹیوننگ آپ کی

ایک فِٹ رکھے گی اے سی اور ہیٹر آپ کا
دوسری آ کر گھما ڈالے گی میٹر آپ کا

ایک تو چمکا کے رکھے گی بڑا رنگ آپ کا
دوسری کر دے گی آ کر قافیہ تنگ آپ کا

ایک شادی کر کے گاڑی جو چلاتے ہیں سمارٹ
دوسری شادی سے ہو جاتے ہیں وہ دھکا سٹارٹ

ایک گاڑی آٹو میٹک ریس جیسا دے مزا
دوسری سے وہیل، فلٹر، گیئر کا حافظ خدا

عین ممکن ہے کہ وہ ہیڈ لائیٹیں ہی توڑ دے
کھا کے گرمی آپ کی وہ دونوں آنکھیں پھوڑ دے

یہ بھی ممکن ہے وہ گاڑی کے اُڑا ڈالے فیوز
اگلے دِن دو کالمی ہو آپ کی اپنی نیوز

ایک بیوی کی وفا کا سارا حصہ آپ کا
دوسری کردے گی اک دِن پاک قصہ آپ کا

خانزادہ خان

دانائے ڈانس

فلمی دنیا سے زیادہ لگاؤ نہ ہونے کے باعث ہمیں لیش چوپڑہ کی پیدائش اور موت دونوں کا پتہ ایک ہی وقت میں لگا۔ ہمیں اپنی لاعلمی کے باعث کوئی معلوم نہ تھا کہ اس دنیائے آب وگل کی سات ارب کی مخلوقِ خدا میں لیش چوپڑا نام کا کوئی ''دانائے ڈانس'' یا ''دانائے رومانس'' بھی ہے، حالانکہ جس روز ہمیں لیش چوپڑہ کی موت کی خبر ملی تب تک موصوف رومان بھرے پورے اسی سال کھڑکا چکے تھے۔ سید ضمیر جعفری نے شائد ایسے ہی بڈھے کے لئے کہا ہے کہ:

آخری سانس کے آنے تک
برسے گا اور گرجے گا
یہ بڈھا اوّل درجے کا

سید ضمیر جعفری مرحوم کے کالم ''ضمیر حاضر، ضمیر غائب'' کے عنوان سے چھپا کرتے تھے۔ گویا حاضر اور غائب کو ہم اگر انگریزی کے یس(YES) اور نو (NO) سے تعبیر کریں تو پھر اس وزن میں مسٹر لیش چوپڑہ کو یس چوپڑہ اور نو چوپڑہ کہہ کر چوپڑہ حاضر اور چوپڑہ غائب بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہیروئن کے ننگے پنڈے پر ''چھمکاں'' مارنے والے اور اُنھیں مسلسل گھوڑیوں کی طرح نچانے والے لیش چوپڑہ کی موت ڈینگی بخار سے ہوئی۔ بخار کو ہندی میں تاپ بھی کہتے ہیں۔ ہندی میں ایک کہاوت بھی ہے کہ ''تاپ ہوا تو باپ مؤا'' یعنی تاپ یا بخار موت کا بہانہ بنا۔ باپ کی مناسبت سے ایک کہاوت یاد آئی کہ ''کامیابی کے سو باپ ہوتے ہیں جبکہ ناکامی یتیم ہوتی ہے'' یوں بولی ووڈ کی فلم انڈسٹری کے سر سے ایک لیش چوپڑہ کے اُٹھ جانے سے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنی کامیابی کے سو باپوں سے نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں باپوں سے یکلخت محروم ہوگئی ہے۔ میڈیا کا کوئی نامور جغادری ہو یا نچلے درجے کا یا ہر چرن داس، سب یہ دھائی دیتے نظر آتے ہیں کہ۔

وگر دانائے ''ڈانس'' آید نہ تا آید

نہ جانے کتنی صدیوں تک فلمی ہیروئنیں کسی اور چوپڑے کے انتظار میں خود کو بناتے سنوارتے اور چوپڑتے ہوئے کانی اور گنجی ہوتی چلی جائیں گی۔ ہندوؤں کے عقیدۂ تناسخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم لیش چوپڑہ کے متعلق یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ وہ دوسرے جنم میں ہاتھ میں لال لگام لئے دوبارہ برآمد ہوں اور بوڑھی گھوڑیوں کو لال لگام دے کر نچاتے ہوئے دوسرے جنم لے جائیں۔

رقص وسرور کے رومان پرور مناظر فلمانے والے لیش چوپڑہ نے اپنی نظروں کے سامنے کئی فلمی حسیناؤں پر جوانی آتے اور پھر حُسن و رعنائی کا سورج ڈھلتے دیکھا تھا کیونکہ لیش چوپڑہ نے رومان پرور ماحول کی سیاحی میں دو چار برس نہیں بلکہ پوری نصف صدی راج کیا ہے، گویا:

اِس بولی ووڈ کے بوس و کنار میں جو بھی دستِ چو پڑا ہے
وہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں
سچی بات ہے کہ اگر لیش چوپڑہ کو ڈینگی مچھر نہ کاٹتا تو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ اسّی سالہ جوان چکا چوند کر دینے والی فلمی دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا سفر کر جائے گا لیکن میڈیا اور فلمی ستاروں نے جس انداز سے لیش چوپڑہ کو یاد کیا ہے اس انداز کو قتیل شفائی کے اشعار میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

وہ دل سے کبھی دور نہیں ہوتا ہے
مر جائے تو دھڑکن میں مکیں ہوتا ہے
جو شخص حسینوں میں جیا کرتا ہے
اُس شخص کا مرنا بھی حسیں ہوتا ہے

جس ڈینگی مچھر نے لیش چوپڑہ کو کاٹا اس مچھر کی حماقت پر حیرانی ہوتی ہے کہ اُس کمبخت نے دھا چوکڑی کرتی کسی ہیروئن کو کیوں نہ کاٹا حالانکہ وہ کاٹے جانے کے لئے کہیں زیادہ دعوتِ نظارہ اور حدودِ وارِ بعہ رکھتی تھیں۔لگتا ہے کہ س مچھر کا تعلق رقیبوں کے قبیلے یا ولن کے خاندان سے تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ لیش چوپڑہ مچھر بھگانے والی کوئی دوا جسم پر چوپڑنا بھول گئے ہوں جبکہ ہیروئنوں نے تو مساج وغیرہ کے ذریعے طرح طرح کے لوشن چوپڑوائے ہوتے ہیں کہ مچھر بھی امان مانگتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔

ترا حُسن فتنۂ دہر ہے، ترا رنگ آگ کی لہر ہے
تری انگھڑیوں میں جو زہر ہے وہ بلا ہے ظلم ہے قہر ہے

لیش چوپڑہ کی بے نوٹس موت نے نہ صرف بولی ووڈ کی فلم انڈسٹری کو ہی نہیں بلکہ امن کی آشا تک کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہمارے ملک کی کچھ اداکارائیں بھی انڈیا جا کر رومانیت کی جدتوں سے روشناس ہوا کرتی تھیں۔

یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی
ابھی تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

لیش چوپڑہ جیسی شخصیات خودرو پھولوں کی مانند ہوا کرتی ہیں اور یہ شخصیات جمہوری معاشروں کی دین ہوتی ہیں، جس طرح مورتیوں کے کئی چہرے ہوتے ہیں، اسی طرح ہندوستانی حکومت کے جمہوری چہرے کا ایک رنگ لیش چوپڑہ جیسے لوگوں کے روپ میں جلوہ فگن ہے۔آزادی سے قبل یہ ماسک صرف برہمن اور بنیوں نے پہن رکھا تھا۔

جو بنیا جتنا زیادہ ہنس کے بولتا ہے
اُتنا ہی کم تولتا ہے

بنئے اور برہمن کا مشترکہ چہرہ اس وقت بولی ووڈ کے پاس ہے۔ہندوستانی معاشرے کے بحرِ ہند کا ہر صدف معاشرے کی سطح پر آکر منہ کھولتا ہے تو وہ بولی ووڈ کے قطرۂ نیساں ہی کا طلبگار ہوتا ہے۔اگر وہ بولی ووڈ کے ابرِ نیساں سے محروم ہوجائے تو پھر بقیہ عمر وہ اس معاشرے میں حلقہ صد کام نہنگ کا سامنا کر کے گزارتا ہے۔مختصر یہ کہ ہندوستانی آزادی اور جمہوریت کا جو مزہ بولی ووڈ نے اُٹھایا ہے، شائد ہی کسی اور طبقے کو اس کا عشرِ عشیر بھی ملا ہو۔
ہندوستنیا سیوں کا خیال ہے کہ بڑھاپا ساٹھ سال کی عمر میں جنم پاتا ہے اور آدمی جب ستر سال کا ہوجائے تو بڑھاپا دس سال کا ہو کر شوخیاں کرتا ہے اور جب آدمی اسّی سال کا ہوجائے تو بڑھاپا بیس سال کا ہو کر دھا چوکڑی اور اچھل کود کرتا ہے۔ابھی لیش چوپڑہ کے بڑھاپے کے اچھل کود کے دن شروع ہی ہوئے تھے کہ وہ دھا چوکڑی کرتی ہیروئنوں کو داغِ مفارقت دے گئے لیکن اُن کا فن کراج پاتا رہے گا۔

ایسا کچھ کر گیا آج لیش چوپڑہ
کرے گا زمانہ عش عش چوپڑہ
پریانکا سے لے کر قطرینہ تک سب
بعد تیرے اب ٹیں ٹیں فش چوپڑہ
دانائے ڈانس آئے گا نہ اب تجھ سا کوئی
فلموں میں رہے گا بہت رشچوپڑہ
ڈینگی تجھے کبھی بھی نہ کاٹ سکتا
کاش تونے کی ہوتی مالشچوپڑہ
تجھ سا نہ پھر کوئی آئے گا کبھی
ہنس مکھ چوپڑہ لش پش چوپڑہ

۲۳ اکتوبر ۲۰۱۲ء

مرزا یاسین بیگ

آؤ ڈاکٹر خالد سہیل کو ڈھونڈیں

ڈاکٹر خالد سہیل کی تحریر کردہ کتابوں کی طویل فہرست دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ دو سو سال سے متواتر لکھ رہے ہیں مگر جب انھیں اپنے سامنے دیکھتا ہوں تو ان کی عمر ایک کتاب جتنی لگتی ہے۔ آج کل لوگوں کے اندر جتنا زہر بھرا ہے، خالد سہیل کے اندر اُتنا علم بھرا ہے۔ یہ مرد ہو کر عورت سے زیادہ بے صبرے ہیں۔ عورت نو ماہ میں بچہ جنتی ہے، یہ چھ ماہ میں ہی کتاب جنتے ہیں اور اکثر جڑواں بھی۔ کوئی بھی بچہ ماں کے پیٹ سے پڑھ لکھ کر پیدا نہیں ہوتا مگر ان کی ہر کتاب پڑھی لکھی ہوتی ہے اور پیدا ہوتے ہی قدردان اسے گود لے لیتے ہیں۔ ان کی لائبریری میں اگر ان کی کتابوں کی طرف سے دیکھنا شروع کیا جائے تو کسی اور کی لکھی کتاب تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جہاں آپ ان کی آخری کتاب تک پہنچتے ہیں، ایک اور نئی کتاب شائع ہو جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دن بھر بلکہ رات گئے تک تو ہم سب کے ساتھ ہوتے ہیں پھر اتنی کتابیں کیسے لکھ لیتے ہیں؟ یہی شک ان کی ڈیٹنگ کی طرف بھی جاتا ہے۔ یہ شہر کا واحد آدمی ہے جو سیل فون نہیں رکھتا مگر قیاس آرائیوں کے مطابق کئی گرل فرینڈز رکھتا ہے۔

خالد سہیل نے شاعری سے لے کر افسانے، ناولٹ، نظمیں، مضامین، انٹرویوز، مزاح، تحقیق غرض یہ کہ ہر صنف کو پرکھا ہے یہاں تک صنفِ نازک کو بھی۔ ان کے رومانی افسانوں کی عورت اکثر ان کی اپنی محبوبہ ہوتی تھی۔ ہر رومانس کے بعد ایک افسانہ لکھنا ان کی ہابی تھی۔ اسی لئے رومانس میں ٹھہرے رہنا یا ادبی بددیانتی سمجھتے تھے۔

بطور ثبوت میں ان ہی کا ایک قطعہ پیش کر دیتا ہوں:

جام چھلکے ہیں میرے ذہن کے میخانوں میں
خواہشیں سلگیں مرے قلب کے تہہ خانوں میں
تیرے ہر رنگ نے یوں گھیر لیا ہے مجھ کو
اک دھنک پھیل رہی ہے میرے افسانوں میں

پچھلے چند سالوں سے ان کے افسانوں میں کمی آئی ہے وجہ آپ خود سمجھ لیں۔ میں تو خوش ہوں ڈاکٹر صاحب میں ٹھہراؤ آ گیا ہے، اب ہم افسانے لکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل کی سماجیات، سیاسیات اور نفسیات پر لکھی گئی کتابیں بھی اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ پاکستان، ہندوستان سمیت دنیا بھر میں ان کے ہزاروں پڑھنے والے موجود ہیں۔ بعضے ایسے بھی ہیں جو انھیں چومنے کی خواہش میں ان کی کتابوں کا

علامہ اقبال اپنی یوم ولادت پہ مجھے خواب میں نظر آئے تھے اور نہایت پریشان تھے، مجھ سے کہنے لگے کہ یار تم لوگ یہ میری سالگرہیں منانا چھوڑو، بس اتنا کرو کہ کم از کم طوائفوں اور میراثیوں کو تو میرا کلام گانے سے روک دو۔ چھٹے ہوئے لچوں دلالوں منافقوں اور جانے مانے کنجروں کو تو میرے اشعار کے حوالے دینے سے اجتناب کرنے کو کہو۔۔۔لیکن یہ بات سن کر مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا، اچانک زوردار تالی بجائی ایک ٹھمکا سا لگایا اور یہ کہتے ہوئے کیٹ واک کرتا ہوا ایک طرف کو چل دیا، ''چھوڑو بھی جناب حکیم الامت جانی، رہے نا تم حکیم کے حکیم۔۔۔تم تو اپنے کلام کی رائلٹی لینے سے کام رکھو بس۔۔۔ آجکل اسے ہی دانشوری کہتے ہیں۔

عارفیات از سید عارف مصطفیٰ

بوسہ لیتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالد سہیل سے کہتا ہوں کہ آپ کے پاس ای میل کی کمی ہے نہ فیمیل کی۔ ان کی تحریر میں ایسی کشش ہے کہ اکثر لوگ انھیں پڑھ کر اپنے دقیانوسی نظریات سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو اور تحریر علم کی بھوک بڑھا دیتی ہے۔ جو ایک بار اُنہیں پڑھ لے، اُنہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے، چاہے شادی شدہ ہو یا مولوی۔

خالد سہیل شاعر اور ادیب ہونے کے باوجود بہت آرگنائزڈ اور وقت کے پابند ہیں۔ کبھی اپنے مریض کو اپنا شعر نہیں سناتے، نہ ہی کسی دوست کو مفت کی دوا یا دعا دیتے ہیں۔ ہر ادبی تقریب میں ایسے جاتے ہیں جیسے اپنے کلینک پر جا رہے ہوں مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ غزل کی جگہ دوا کی پرچی پڑھ دی۔ اتنے صحت مند ماہر نفسیات ہیں کہ بھیڑ میں بھی اپنے مریض اور قاری کو پہچان لیتے ہیں۔ ''انسان دوست'' ایسے کہ ہر نظریئے اور نظر آنے والی شئے کو گلے لگانے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔

خالد سہیل نے ہر کام کیا ہے سوائے شادی کے۔ شاید انھوں نے میرا مقولہ سن لیا ہے کہ جس گھر میں نکاح داخل ہو جائے وہاں محبوبائیں آنا بند ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھیں اب تک ہر عورت اچھی لگتی ہے۔ ایک بیوی کی کمی دور کرنے کیلئے انھیں ہر روز بیڈ پر لیٹے لیٹے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنی پڑتی ہے۔ حقوقِ زوجیت ادا کرنا ہو تو قلم لے کر کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

خالد سہیل نے دنیا کا ہر حق ادا کیا ہے سوائے حق مہر کے۔ یہ واحد مرد ہیں جو بیوی نہ رکھتے ہوئے بھی انتہائی سنجیدہ ہیں۔ بال بچوں میں سے صرف بال کی پرورش کی۔ ان کی ایک خوبی خدا کا ذکر کئے بغیر پوری نہیں ہوتی اور وہ ہے ان کی خدا ترسی۔ اتنے خدا ترس ہیں کہ جنھیں لکھنا بھی نہیں آتا، ان کے لئے اچھا اچھا لکھ کر دے دیتے ہیں۔ برا بھلا کہنے میں عار محسوس کرتے ہیں یعنی برا نہیں کہہ پاتے صرف بھلا بھلا کہہ دیتے ہیں۔

کہنے کو تو ڈاکٹر صاحب ''سنگل'' ہیں مگر کسی بھی محفل میں سنگل نظر نہیں آتے۔ لوگ انھیں ایسے گھیرے رہتے جیسے آج ہی شادی کروا کر چھوڑیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس موضوع اور مریض کی کوئی کمی نہیں۔ موضوع اور مرض کو برتنا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے، بائیں ہاتھ کو کم ہی زحمت دیتے ہیں۔ کپڑے نفیس پہنتے ہیں اور اکثر خود ہی پہنتے ہیں۔ کسی نے مشہور کر دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کچھوے پسند ہیں بس اس دن سے جس مریض کو پیار آیا وہ ایک مصنوعی کچھوے کا تحفہ دے گیا۔ اب یہ حال کہ کلینک میں ہر طرف مریض نظر آتے ہیں یا کچھوے اور ڈاکٹر صاحب دونوں سے خوش ہیں۔

ڈاکٹر صاحب پچھلے چند سالوں سے اردو میں کم اور انگریزی میں زیادہ لکھنے لگے ہیں۔ سنا ہے اُردو اس پر کافی بگڑی ہے۔ یہ پہلی زبان ہے جو ڈاکٹر صاحب پر بگڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسے بلند مرتبت ادیب اگر اُردو کو چھوڑ جائیں گے تو اُردو پر تو بگاڑ ہی آئے گا۔ امید کی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب اُردو کا دامن ویسے ہی پکڑے رہیں گے جیسے اُنھوں نے بیٹی ڈیوس کا ہاتھ تھاما ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک شانے سے اُردو اور دوسرے شانے سے انگریزی لگی ہو تو ادب اور قاری ان پر زیادہ ناز کرے گا۔

ڈاکٹر خالد سہیل کو ہم دیکھ تو سکتے ہیں مگر انھیں ڈھونڈ نہیں سکتے۔ ان کی شخصیت کے جز تو مل جاتے ہیں مگر ان کی تلاش ختم نہیں ہوتی۔ وہ ادیب تو ادیب انسان ہونے کی بھی عمدہ مثال ہیں۔ ایسے لوگ بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ ان کی نظروں میں رہتا ہوں۔

ارمان یوسف

ہمارے فقیر اللہ صاحب
(کھٹی میٹھی یادیں)

حاجی بشیر حسین ملغانی (سابق ہیڈ ماسٹر ہائی سکول تھہیم والا) شیخ محمد حنیف اور فقیر اللہ صاحب کے تذکرے اس وقت سے سننے کو ملتے جب ہم نے سکول کا رخ بھی نہیں کیا تھا اور ان صاحبان کا ذکر خیر بشیر احمد (مڑھی شریف والی سرکار) غلام گبول، عابد شریف، قاسم سیال اور بڑے بھائی اجمل تبسم سے سنا کرتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب آتش بھی جوان تو کیا بلکہ ابھی لڑکا سا تھا اور بشیر احمد کے والدِ گرامی استاد حافظ عبدالعزیز صاحب کے ہاں قرآن شریف حفظ کر رہا تھا۔ آتش تو خیر اب بھی لڑکا ہی ہے۔ دنیا والے چاہے ہماری ایک سو پچاسویں سالگرہ کی تیاری کر رہے ہوں مگر اس سے کیا؟ اب سارے زمانے کی مانیں یا اس ایک دل کی جو اب بھی پھڑک پھڑک کے دھڑک کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ جذبے جوان ہوں تو حالات کی ستم ظریفی کے باوجود بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ آدمی جوان ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب آپ بھی کہیں اس عمر میں بھی ''جوانی'' کے جوش میں آ کر لنگوٹ کس کے ہیڈ پنجند یا چناب پہ نہانے چل نکلیں، یہ آپ کی آخری ڈبکی ثابت ہو اور ہم لندن میں بیٹھے بیٹھے ہی امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کے الزام میں دھر لئے جائیں۔ الطاف بھائی پہ تو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے مقدمات چل ہی رہے ہیں، ارمان بھائی پر بھی شروع ہو جائیں۔ آجکل طٰہ قریشی صاحب بھی پاکستان گئے ہوئے ہیں، ایسے میں ہماری ضمانت کون کرائے گا؟

سب نے کہا پہلے حفظ کر لو سکول بعد میں پڑھ لینا، وجہ یہ بتائی کہ آخرت میں حافظِ قرآن کو ستر آدمیوں کو جنت میں لے جانے کا خصوصی اختیار حاصل ہوگا (حاسدین آج ہی سے دل سے ہمارا احترام کرنا شروع کر دیں ورنہ جنت سے چھٹی اور اگر آپ کو بھی اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت میں داخلے پہ ذرا بھی شبہ ہو تو دو دو ہزار میں آج ہی ٹکٹیں بک کرا لیجئے (روپے نہیں دو دو ہزار پاؤنڈ) نیز موت کے منتظر اور بے صبرے گنہگاروں کے لئے خصوصی پیکج اور آن لائن بیعت کی سہولت بھی دستیاب ہے البتہ لنگر شریف کی توقع ہرگز نہ کیجئے گا کمپنی پہلے ہی خسارے میں جا رہی ہے) محض ستر ہی؟ تعداد بہت کم تھی۔ ہم نے ایک سو ستر کی شرط کے ساتھ فرشتوں سے مذکرات شروع کر دیئے اور یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو ''دیوانِ غالب'' کو حفظ کرنا شروع کر دیں گے۔ تیس سیپاروں کی جگہ شراب و کباب کی کھلے عام دعوت دینے والی غالب و سعدی کی تیس غزلیں ہی سہی، پھر چاہے ایک سو ستر کو ساتھ ہی لے ڈوبے کہ ''ہمہ یاراں دوزخ''، مگر فرشتوں سے مذاکرات کامیاب ہو گئے اور یوں ہم حافظ محمد یوسف بن کے ہائی سکول تھہیم والا آن پہنچے جہاں جاوید اختر صاحب، صدیق صاحب، ہدایت اللہ صاحب، اکبر صاحب، ملک محمد حسین، علامہ غلام عباس اور عارف صاحب سے عربی، انگریزی اور سائنسی مضامین پڑھا کرتے۔ ایسے میں بشیر ملغانی صاحب، شیخ صاحب اور فقیر اللہ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان حضرات کی محنت، جدوجہد اور نیک نیتی کی بدولت سکول کا معیار اس قدر بلند تھا کہ پنجاب بھر سے سیاسی اور سرکاری عمائدین کے بچے بھی یہاں پڑھنے پر فخر محسوس کرتے۔ بشیر صاحب تو امتحانوں کے دوران اکثر روزے سے ہوتے اور بچوں کی کامیابی کے لئے

محنت کے ساتھ ساتھ دعا گو بھی رہتے۔یہی وجہ تھی کہ ہر سال میٹرک بورڈ میں اس سکول کی پوزیشن لازمی قرار پاتی۔کسی نے سچ میں جہالت کے اندھیروں کو علم کے چراغ سے روشن کرنے والی شخصیت کو دیکھنا ہوتو بشیر صاحب سے جا ملے جنھوں نے تمام عمر شمع کی مانند گزار دی۔دعا ہے کہ اللہ رب العزت انہیں اچھی صحت دے۔شیخ حنیف صاحب تو پہلے ہی جہانِ فانی سے رخصت ہوئے جبکہ فقیر اللہ صاحب بھی اسی سال ۲۸ جنوری کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔آپ ۱۹۴۶ء میں علی پور کے ایک نواحی قصبے میں ایک علم دوست خاندان میں پیدا ہوئے،ایک مقامی ورنی کولر (انگلش میڈیم) سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ایف اے کرنے کے بعد دوست احباب اور چند رشتے داروں کے توسط سے پہلے چنگی انسپکٹر اور پھر محکمہ باردانہ میں تعینات ہوئے مگر چند دنوں بعد ہی تنخواہ لئے بغیر دونوں محکموں کے خیر باد کہا۔وجہ؟ وجہ نہیں بیماری کہئے،رشوت خوری اور اقربا پروری کا سرطان جو آج پورے معاشرے کو چاٹ چکا ہے۔مگر آپ کو حرام کا ایک لقمہ بھی گوارا نہ تھا۔یار لوگوں نے علی الاعلان کہا کہ برخوردار کسی اور کام کے تو ہیں نہیں'استاذی لگوا دیجئے۔یوں آپ درس و تدریس اور علم و حکمت والے پیغمبرانہ شعبے میں آئے اور اسی میں عمر گزار دی۔۱۹۸۵ء میں تھہیم والا میں آئے اور یہیں سے ۲۰۰۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔محنت، سچی لگن اور تعلیم سے محبت کے بل بوتے پر سکول کے تعلیمی معیار کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔آپ کو صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا اور بارہا صوبائی ایوارڈ بھی ملے۔ریٹائرڈمنٹ کے آخری سال بھی اپنے سکول کی دو پوزیشنیں پکی کر لیں۔الطاف حسین گبول اور ساجد مجید نے بالترتیب پہلی اور تیسری پوزیشن لی،اب سنا ہے استاذِ محترم کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے اسی ہی سکول میں پڑھا رہے ہیں۔آپ سے بھلا کیا پردہ، یہ دونوں جوان بھی اپنے ہی محلے کے ہیں۔یوں تو اپنی پوزیشن بھی پکی تھی مگر دو حادثات ہو گئے،ایک تو ہم نے میٹرک ۲۰۰۶ء ہی میں کر لیا تھا،دوسرا یہ کہ ان دنوں خدا معلوم پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ والوں کو کیا ہو گیا تھا کہ ہماری ہر کتاب پہ گلابوں سا ایک حسین چہرہ چھاپ دیا کرتے تھے جو پڑھنے نہیں دیتا تھا،یوں اسی سال ہی میٹرک میں پاس اور محبت میں ناکام ہو گئے تھے،صرف سکول بھر میں اول پوزیشن لی، خالد مجید نے" شہیدِ محبت" کا خطاب دے کر بورڈ میں پوزیشن نہ لینے کا غم بھی کسی حد تک کم کر دیا تھا۔

ان کے صاحبزادے سلیم اختر صاحب کے بقول ہمیشہ حلال کھانے کی تلقین کرتے رہے اور خود بھی عمر بھر اسی پر کار بند رہے،۱۹۸۹ء میں والدِ گرامی کی وفات کے بعد سے آخری روز تک بلا ناغہ ان کی قبر پر فاتحہ کے لئے جاتے رہے۔باوضو رہتے اور کثرت سے درود شریف پڑھا کرتے۔

بس اتنا ہی؟ صدارتی ایوارڈ؟ احترام کرنے والے ہزاروں شاگرد؟ تابع فرمان اولاد؟ محبت کا دم بھرنے والے دوست؟۔۔ ان سب سے بڑھ کر ان کا خاتمہ بالخیر! زندگی کے آخری روز رات گئے تک گھر والوں سے باتیں کرتے رہیں، اگلے روز معمول کے مطابق اخبار گردانی کی،شوگر چیک کی اور معمول کے مطابق ہی نماز ظہر کا وضو کیا اور مصلے پہ جا کھڑے ہوئے،حالتِ قیام ہی میں روح پرواز کر گئی۔

اِس آخری نماز،اس آخری قیام،اس آخری سجدے کا ذرا موازنہ کیجئے! دنیا بھر کے قارونوں کے خزانے تو مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔دولتِ دنیا کی وقعت ہی کیا کہ آنکھ ملا سکے۔عمر بھر کی ریاضتیں اور عبادتیں بھی اس آخری سجدے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔سورج کو چراغ دکھانا محاورتاً کہا جاتا ہے مگر یہاں تو سورج بھی منہ چھپائے پھرتا ہے، جسے سرِ شام ہی ڈوب جانا ہو وہ ابدی چراغ کا سامنا کیسے کرے؟

رزقِ حلال،ایمانداری اور والدین کی خدمت ہی ان کی زندگی کا سادہ سا اصول تھے،وفات کے بعد والد گرامی کی قبر کے پاس ہی علی پور میں دفن ہوئے،ان کی قبر پہ جانا نصیب میں نہ بھی ہو تو فاتحہ پڑھ لیجئے،کارِ ثواب ہے۔

عشق کا بھوت عقل پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتا ہے۔
قلم آرائیاں از خادم حسین مجاہد

نیرنگِ خیال

شاہ جی

یہ ان بھلے دنوں کی بات ہے جب مولوی نے شہر اقتدار میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دفتر میں مولوی کی نشست ملک صاحب اور چوہدری کے ساتھ تھی۔ شاہ جی ان کے بالکل عقب والی کرسی پر سویا کرتے تھے اور جب کبھی جاگ رہے ہوتے تو فرماتے تھے کہ یہ لوگ میرے عقب میں بیٹھتے ہیں۔ بات ان کی یوں بھی درست تھی کہ شاہ جی خود تو کم ہی بیٹھا کرتے تھے۔ زیادہ تر میز کو تکیہ بنائے فون کو کسی حسینہ کا ہاتھ سمجھ کر تھامے محوِ استراحت ہوتے تھے۔ آخر ہم سے رہا نہ گیا اور شاہ جی سے ایک دن پوچھ ہی بیٹھے کہ فون کو اتنی محبت سے پکڑ کر کیوں سوتے ہیں۔ کیا کسی کے لوٹ آنے کا امکان باقی ہے۔ اس پر شاہ جی نے صرف ہنسنے پر اکتفا کیا۔ یوں بھی ہمارے درمیان ایسی کوئی بے تکلفی نہ تھی کہ شاہ جی ہماری اس بات کا جواب دیتے یا جواباً ہم پر کوئی فقرہ کستے۔ اب یہ سوال اس لیے نہیں پوچھتے کہ بے تکلفی کے سبب شاہ جی اصل بات ہی نہ بتا دیں۔ پہلی چند ملاقاتوں میں ہم شاہ جی کو مکہ پلٹ حاجی سمجھتے رہے۔ وجہ یہ کہ ہم نے اتنا منڈھا ہوا سر حاجیوں اور عمرہ کر کے پلٹنے والوں کا ہی دیکھا تھا۔ لیکن مہینوں بعد بھی بالوں کی طوالت میں اضافہ نہ ہوا تو ہم سمجھ گئے کہ یہ حاجی پلٹ حلیہ ڈھونگ ہے۔ درحقیقت شاہ جی ایک پلٹے ہوئے حاجی تھے جس کا ادراک ہمیں مدت کی آشنائی کے بعد ہوا۔ شاہ جی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی عادات کا تذکرہ ہو تو سامع فوراً کہتا ہے کہ بالکل ایسا ہی ایک دوست میرا بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب شاہ جی سے تعارف ہوا تو ہم نے بھی یہی کہا کہ شاہ جی آپ جیسا ایک دوست ہمارا بھی ہے۔

شاہ جی کے قدوقامت کی مثال عمران سیریز کے "جوانا" سے دی جا سکتی ہے۔ لحیم شحیم، جتنا لمبا، اتنا چوڑا۔ ایک دن اپنی دونوں کلائیوں کو اکٹھا جوڑ کر فرمانے لگے آج میں نے ایک لڑکی دیکھی جس کی کمر قریباً میری ان کلائیوں جتنی ہوگی۔ اس پر مولوی نے برجستہ کہا۔ شاہ جی مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو موٹی عورتیں پسند ہیں۔ مولوی کا فرمانا اپنی جگہ بالکل بجا تھا۔ شاہ جی کی کلائی کی گولائی ایک عام آدمی کی ران جتنی تھی۔ اس پر دونوں کلائیاں ملا لی جائیں تو کمر کسی پنجابی ہیروئن ہی کی بنتی ہے۔ ہمارے ذہن میں مشہور زمانہ

گانے کے بول رقص کرنے لگے۔ پٹ ۲۸ کڑی وا، ۸۷ ویٹ کڑی وا۔ مردوں سے بات کرتے وقت چشمہ اتار دیا کرتے تھے۔ اور صنف مخالف سے بات کرتے وقت چشمہ اتار کر شیشے صاف کر کے دوبارہ لگا لیتے تھے۔ پتا نہیں اس میں کیا رمز تھی۔ ہاں یہ بات ہمیں ضرور معلوم تھی کہ بغیر چشمے کے شاہ جی کوئی ساڑھے تین سینٹی میٹر تک دیکھ لیتے ہیں۔ پاس کھڑا دوست ان کو دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن ہمالہ پر کھڑے ہو کر کراچی ساحل پر پھرتی لڑکیاں دیکھ لیا کرتے تھے۔ ان کی اس دوربین نگاہ اور حرکات کے سبب ہمیں محسوس ہوتا کہ شفیق الرحمٰن کا کردار "شیطان" تحاریر کی دنیا سے نکل کر مجسم ہو گیا ہے۔

ایک دن ہم، مولوی اور شاہ جی جب جمعہ نماز کے لیے نکلے تو راہ میں شاہ جی کو پتا نہیں کیا سوجھی۔ مولوی کو چھیڑتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر یہ بڑا سا کھمبا آپ کے سر پر گر پڑے تو آپ اور چھوٹے ہو کر کوہ قاف سے درآمد شدہ لگیں گے۔ اس پر ہم نے کہا کہ اگر یہی کھمبا آپ کے سر پر گر پڑے تو آپ چھوٹے ہو کر عام انسان لگیں گے۔ شاہ جی نے مسکراتے ہوئے دستِ شفقت راقم کے کاندھے پر رکھا، جس کا اثر راقم الحروف نے ایڑی تک محسوس کیا۔

شاہ جی کے قد و قامت کا اندازہ ان کے چہرے مہرے سے نہیں ہو پاتا تھا۔ اور اس کا وہ بہت ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ ایک دن مجلسِ یاراں میں اپنی دلیری کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگے۔

میں شمالی علاقہ جات سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں ایک موٹر سائیکل والے نے انتہائی فضول انداز میں بائیک سڑک پر لہرایا جس کی وجہ سے گاڑی نے ہلکی سی تھپکی اس موٹر سائیکل کو دے دی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تو نہ گاڑی آہستہ کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی رکا۔ لیکن اس موٹر سائیکل سوار نے دیکھا کہ ایک "لڑکا بالا" گاڑی اڑائے لے جا رہا ہے سو فوراً گاڑی کے پیچھے اپنا موٹر سائیکل لگا لیا۔ شاہ جی کے منہ سے اپنے لیے "لڑکا بالا" کے الفاظ سن کر تمام سامعین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن شاہ جی نے سب کو نظر انداز کر کے اپنی بات جاری

کسی کا احمق ہونا ایک خدائی راز ہے جو بتدریج سب پہ کھل جاتا ہے سوائے اسی کے جو احمق ہو۔

عارفیات از سید عارف مصطفیٰ

رکھی۔ لڑائی بھڑائی سے میں یوں بھاگتا ہوں جیسے سپین میں لوگ بھینسے کے آگے بھاگتے ہیں۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اس سے جان کیسے چھڑاؤں۔ خیر آگے ایک ہوٹل پر جب میں نے گاڑی روکی تو وہ فوراً میرے دروازے والی طرف آ گیا۔ میں سکون سے نیچے اتر کر جب اس کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کے چہرے کی رنگت ہی بدل گئی۔ اس غریب کو ایسی ہی مایوسی ہوئی جیسی کسی لڑکی کا نمبر سمجھ کر ملانے والے آوارہ اور بدقماش لڑکے کو لڑکے کی آواز سننے پر ہوتی ہے۔ اور وہ گھبرا کر کہتا ہے۔ "جی فلاں سے بات ہو سکتی ہے۔" اس کا سر بمشکل میرے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "جی فرمایئے!" تو اس کی زبان بھی لڑکھڑا گئی اور کہنے لگا کہ "دیکھیے! ہمارا بھی سڑک پر حق ہے۔" میں نے کہا تم اتنی دور مجھے بس یہی بات بتانے آئے ہو تو وہ بیچارہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آخر میں نے اس کو ایک عدد ہلکا سا دھکا دیا اور اندر کی جانب چلا آیا۔ شاہ جی نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اس دن انہوں نے شکرانے کے کتنے نفل پڑھے تھے۔

کھیلوں کے بیحد شوقین تھے۔ اکثر ان کا نعرہ ہوتا تھا۔ "کھیڈاں نہ کھیڈن داں گے۔۔۔۔" بقیہ احباب علم و عمل کی محاورہ فہمی پر چھوڑ رہا ہوں۔ کئی ایک تو دبے دبے لفظوں میں کہہ بھی دیتے کہ آپ تو کھیل لیتے ہیں۔ انہی دنوں میں شاہ جی کو فٹ بال (گڈویوں والا فٹبال) کھیلنے کا شوق ہو گیا۔ عالم یہ تھا کہ شاہ جی کے ہاتھ بال آ جاتی تو اتنی زور سے شاٹ مارتے کہ بال مخالف سمت کی دیوار سے ٹکرا کر اپنے ہی گول میں جا چھپتی تھی۔ کئی بار تو گیند نے باہر آنے سے انکار کر دیا کہ جناب یہ آدمی بہت زور سے مارتا ہے۔ دیکھنے والوں کا یہ بھی فرمانا تھا کہ ایک آدھے فٹبالر کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ اگر وہ راڈ سے بندھے نہ ہوتے تو یقیناً باہر آ جاتے۔ اس پر ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر وہ بندھے ہونے کی وجہ

سے باہر نہیں آسکتے تھے تو دل میں گالیاں ضرور دیتے ہوں گے۔ اچھے کھلاڑی کو اپنا پارٹنر بناتے اور جیتنے کی صورت میں خود رقص ابلیسی فرماتے۔

ایک دن مجھ گناہ گار سے فرمانے لگے کہ آئیں فوس بال کھیلتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ جہاں شاہ جی ایک قدم اٹھاتے میں چار پانچ قدم اٹھاتا۔ لیکن بندہ بشر تھا۔ سو کوتاہی ہوگئی اور جب فوس بال کی میز تک پہنچا تو شاہ جی میرے سے ایک قدم آگے ہوگئے۔ وہاں پر ایک بہتر کھلاڑی پہلے سے کسی پارٹنر کی راہ تک رہا تھا۔ فوراً اس کے ساتھ ہاتھ ملا کر مجھے کہنے لگے۔ آپ نے دیر کر دی۔ محفل یاراں میں جب شاہ جی کی اس بیرخی کا تذکرہ کیا تو مولوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہم پریشان ہوگئے۔ الٰہی خیر۔ اے مولوی! بتا تو سہی ماجرا کیا ہے۔ اے شخص تو رو کیوں رہا ہے۔ چشم فلک نے ایسا کون سا منظر دکھلا دیا کہ آج سر بزم تیری آنکھ چھلک گئی۔ اس پر وہ مرد بیقرار، پیکر زہد و انکسار یوں گویا ہوا۔

تمہارا یہ واقعہ سن کر مجھے ایک شام کا قصہ یاد آگیا ہے۔ ہاں وہ شام ہی تھی۔ عام سی شام تھی لیکن پھر ایسی بات ہوئی کہ وہ شام بہت خاص بن گئی۔ آہ! اس کو یاد کر کے میرا کلیجہ چھلنی ہوا جاتا ہے۔ سنو اے نادان دوستو! تمہیں میں اپنی سادگی اور شاہ جی کی چالاکی کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ یہ شخص جسے دنیا شاہ جی کے نام سے جانتی ہے میرے پاس آیا۔ میں ایک دفتری کام میں غرق تھا۔ اس پر آدھے سامعین کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی۔ مولوی نے مجلسی حیرانی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ اس نے مجھے کہا کہ آؤ نیچے جا کر فوس بال کھیلتے ہیں۔ میں اس قدر مصروف تھا کہ میں نے اسے اشارے سے منع کیا۔ لیکن اس نے میرے اشارے کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا کہ خبردار! دفتر میں اس قسم کے اشارے کرنا اخلاقی گراوٹ کی نشانی ہے۔ میں خود بھی سوچ میں پڑ گیا کہ میں نے اشارہ کیا کیا ہے۔ اس نے جب مجھے تذبذب کے عالم میں دیکھا تو کہنے لگا کہ آئیں۔ فوس بال کھیلنے سے طبیعت تروتازہ ہوجائے گی۔ واپس آ کر کام کر لیجیے گا۔ میں جو کافی دیر سے دفتری الجھن کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا مجھے اس کی بات میں صداقت نظر آئی۔ میں اس کے ساتھ کھیلنے کی جگہ تک جا پہنچا۔ وہاں پہلے ہی دو ٹیمیں آپس میں کھیل رہی تھیں۔ ہم ان کا کھیل دیکھنے لگے۔ باتوں باتوں میں شاہ جی نے تگڑی والی ٹیم کو چیلنج مار دیا۔ اور کہنے لگے کہ اگر خدانخواستہ تم لوگ اس ٹیم سے جیت گئے تو پھر ہم دیکھنا تمہارا کیا حشر کریں گے۔ میں شاہ جی کے اس چیلنج پر حیران ہو رہا تھا کہ میری کھیلنے کی صلاحیت جاننے کے باوجود وہ اس ٹیم کو چیلنج کیسے دے رہے ہیں۔ اتنی دیر میں ایک اور اچھا کھلاڑی وہاں آن پہنچا۔ تگڑی ٹیم کے جیتنے کے بعد جب میں نے شاہ جی کے ساتھ میز سنبھالنے کی کوشش کی تو یہ مجھے کہنے لگے کہ مولوی۔ یار ذرا چیلنج لگا ہوا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس اچھے کھلاڑی کے ساتھ کھیل لوں۔ شاہ جی اس حرکت کا تگڑی ٹیم کو بھی اتنا دکھ ہوا کہ وہ اسی دکھ میں ہار گئے۔

مولوی کا واقعہ ختم ہونے پر ہم نے دیکھا کہ وہاں اور بہت سارے لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ پس منظر میں چلتی موسیقی کسی فلمی تھیم کی طرح ماحول پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

ایک ہم ہی نہیں
جسے دیکھو یہاں
وہی آنکھ ہے نم

ایک طرف سے ہلکی سی آواز آئی۔ ٹیبل ٹینس پر میرے ساتھ بھی یہی ہوا جبکہ دوسری جانب سے یہی صدا بلیئرڈ کے نام سے سنائی دی اور پھر باقی آوازیں ہچکیوں میں دب گئیں۔

بجھتا کہاں بھڑک گیا رونے سے سوز غم

سب کے چہروں پر ایک ہی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ ادھر ہمارا وہ حال تھا کہ:

میرا اس کا غم سانجھا تھا
میں اس کو کیسے بہلاتا

جبکہ شاہ جی کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

نوٹ اس خاکے کے تمام کردار تخیلاتی ہیں۔ کسی بھی قسم کی "سو فیصد" مشابہت محض اتفاقیہ ہوگی۔

محمد امین

عبدالحکیم ناصف
ایک عہد ساز مزاح نگار

ہماری بچپن ہی سے یہ بالغانہ رائے رہی ہے کہ ہمارے سرکاری ٹیلیویژن سے ''تا'' کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔اس کے لئے خاصے مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔یا تو بندہ مکھن لگانے اور پروڈیوسروں کی مٹھی چاپی میں اُستاد ہو یا پھر اپنے فن میں اُستاد ہو۔اگرچہ آج کل چند ایک خواتین کی پی ٹی وی میں جلوہ آرائیاں دیکھ کر لگتا ہے کہ اس ضمن میں ایک اور خصوصیت بھی درکار ہے جس کے لئے تمام مرد حضرات طبی لحاظ سے اَن فِٹ ہیں۔

کچھ عرصہ قبل پی ٹی وی سے ایک کمپئر نے انتہائی شوخ وشنگ اور چہکتی ہوئی زندہ آواز کے ساتھ جلوہ آرائی دکھانی شروع کی۔یہ کمپئر نہ صرف کامیڈی پروگراموں میں نظر آنے لگا بلکہ مزاحیہ شاعری میں بھی خاصے وکھرے ٹائپ کی آواز ثابت ہوا۔اِن کا نام دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میں ان کے قطعات بہت عرصہ قبل ملک کے ایک مؤقر اخبار میں پڑھ چکا ہوں۔اُن کے قطعات میں اس قدر چلبلاہٹ اور چاشنی ہوا کرتی تھی کہ پڑھ کر لطف آجاتا تھا۔

اُسی زمانے میں اُردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری پر ایک کتاب بھی شائع ہوئی تھی، جس میں اُس دور کے تمام قابلِ ذکر مزاحیہ شعراء کا انتخاب شامل تھا۔اُس میں بھی اِن صاحب کا نام شامل تھا۔اُس وقت میں سوچتا تھا کہ یہ محترم کوئی خاصی بزرگانہ اور بھاری بھرکم علمی وادبی شخصیت ہوں گے لیکن ٹیلیویژن پر اِن پر نظر پڑی تو خاصی حیرانی ہوئی۔اپنے لڑکپن میں جن صاحب کے قطعات ایک قومی اخبار میں پڑھتا رہا ہوں وہ میرے اپنے بڑھاپے میں اس قدر پُر شباب وشاداب شخصیت کے مالک ہوں گے، یقین نہیں آتا۔لگتا ہے کہ یا تو وقت ہی نے کچھ ہیرا پھیری کی تھی یا پھر یہی صاحب کچھ اُس طرح کی کوئی چیز ہوں گے جس کا تذکرہ غلام عباس نے اپنے افسانے ''بہروپیا'' میں کیا تھا۔غضب خدا کا، فدوی تو دیکھتے ہی دیکھتے بزرگانہ عمر کی قلانچیں بھرتا ہوا پچاس کے پیٹھے میں پہنچ گیا ہے، نہ صرف اس عمر سے فلرٹ کر رہا ہے بلکہ چہرے مہرے سے بھی ایسا نظر آرہا ہے کہ بقول اطہر شاہ خان جیدی کے ''محبوبہ کے بزرگ کہنے'' کے خطرہ سے دوچار ہوئے بھی عرصہ گزر چکا ہے اور یہ صاحب ہیں کہ اس طویل عرصے بعد بھی اس قدر تروتازہ نظر آرہے ہیں کہ پنجابی فلموں میں ہیرو کا کردار ادا کرنے کے بارے میں سوچیں تو کوالیفائی کرلیں گے۔

عبدالحکیم ناصف نے اُسی برس پیدا ہونا مناسب سمجھا جب یہ مابدولت دنیا میں رونے دھونے کے لئے وارد ہوئے۔۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۴ء بروز ہفتہ اُن کی پیدائش کا دن ہے۔وہ پاکستان کے شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والدین کا تعلق اجمیر شریف سے تھا۔شاعری میں شرفِ تلمذ استاد واجد سعیدی مرحوم سے

حاصل ہوا۔ ابتدا میں بہاریہ شاعری کی طرف طبیعت راغب رہی تاہم بعد ازاں اُن کی شگفتہ طبیعت رنگ لانے لگی اور ان کے اشعار میں غیر محسوس طریقے سے ہلکا پھلکا مزاح کا رنگ بھی جھلکنے لگا۔ طبیعت وتخلیق میں اس ظریفانہ انداز اور رنگوں کی دھنک دیکھ کر اُن کے شاعر شناس استاد نے ناصف کو اسی مسکراتی اور چہچہاتی روش پر گامزن ہونے کا حکم صادر فرمایا۔ اس سلسلے میں استاد انور بریلوی اور عنایت علی خان نے بھی ان پر بھرپور توجہ دی۔ تاہم ان کی طنز ومزاح کی لطیف حسیات کو خالد عرفان نے مزید مہمیز کیا۔

ظرافت وہ فطری حس ہے جو اپنی تخلیق کے لیے بھرپور سنجیدگی اور مسلسل فکری مشاہدے کا مطالبہ کرتی ہے اور اگر یہ صلاحیت کسی شاعر کو عطا ہو تو اس کا اظہار بے حد مشکل یوں بھی ہو جاتا ہے کہ نثر میں مزاح نگار کو جو آزادی اپنے فکر وخیال کو فوراً سے پیشتر احاطۂ تحریر میں لانے کی حاصل ہوتی ہے، مزاحیہ شاعر اس آسانی سے محروم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس تخیلاتی اور تخلیقی جدوجہد میں مرکزی طنزیہ یا مزاحیہ خیال ہی رفوچکر ہو جائے یا بحر کی تنگ، دشوار اور بندگلی اس کے سبک رفتار "لونگ وہیکل" کا سفر ہی روک دے۔ لہٰذا یہ کہنا یقیناً حق بجانب ہے کہ شاعری میں مزاح نگاری "سُوئی سے ناقہ" گزارنے کے کٹھن ترین عمل کے مترادف ہے۔ عبدالحکیم ناصف نے اس صنف اور عمل میں انتہائی مشاقی اور شب و روز کی مسلسل مشقوں سے کمال حاصل کیا ہے۔

کراچی منتقلی کے بعد عبدالحکیم ناصف نے اُردو کے ایک کثیر الاشاعت اخبار میں حالاتِ حاضرہ پر قطعہ نگاری کا آغاز کیا اور بہت جلد اہلِ ادب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ عبدالحکیم ناصف کے برجستہ اور چونکا دینے والے کلام اور ادائیگی کے منفرد انداز نے ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ بہت جلد عوامی پذیرائی بھی حاصل کی۔ بعد ازاں پنجاب اور پاکستان کے دیگر شہروں میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے انھیں متعارف کرایا اور ناصف کا شمار پاکستان کے "ٹاپ فائیو" بڑے مزاحیہ شعراء میں ہونے لگا۔ اب وہ پاکستان کے علاوہ دنیا بھر کے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں۔

عبدالحکیم ناصف کے قہقہہ آور اور فکر انگیز کلام اور مشاعروں میں اس کی دلآویز اور منفرد "پیشکش" انھیں ایک بھرپور عوامی شاعر بناتی ہے۔ ان کے کلام کا "کینوس" کائناتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح عبدالحکیم ناصف عوام اور خواص کے ہر ہر معاملہ اور مسئلہ کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ اسی باعث ناصف کا ہمہ گیر شعری طنز ومزاح نہ صرف مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت ہے بلکہ مطالعہ کے دوران بھی قارئین بھرپور لطف اٹھانے کے ساتھ طنز و مزاح سے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔

حیرانی کی بات ہے کہ اِس قدر پُر گو اور عوامی مقبولیت کے حامل شاعر ہونے کے باوجود اب تک اُن کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا ہے تاہم اب سُنا ہے کہ اُن کا طنز ومزاح پر مبنی ایک مجموعۂ کلام "چھٹی ہُوئی حس" اشاعتی تکمیل کے مراحل میں ہے اور بہت جلد ہمارے ہاتھوں میں ہوگا۔ اللہ انہیں مزید ترقی دے۔

لڑکیاں بدلہ بھی بہت بُرا لیتی ہے۔۔۔

کالج کے زمانے میں ایک دفعہ میں الیکشن میں کھڑا ہوا تھا۔۔ میرے مقابلے میں ایک لڑکی کھڑی تھی، میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر اس کے پرس میں ایک نقلی چھپکلی رکھ دی۔۔۔ جب وہ تقریر کرنے ڈائس پر آئی اور تقریر والا کاغذ نکالنے کے لئے پرس میں ہاتھ ڈالا تو ٹھیک ساڑھے چار سیکنڈ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں اور پھر اچانک پوری ذمہ داری سے غش کھا کر گرگئی۔۔۔

اِس بات کا بدلہ اس ظالم نے یوں لیا کہ میرے الیکشن والے پوسٹروں پر راتوں رات، جہاں جہاں بھی "نامزد امیدوار" لکھا تھا، وہاں وہاں "نامزد" میں سے "ز" کا نقطہ اُڑا دیا۔۔ میں آج تک اس کی "سیاسی بصیرت" پر حیران ہوں۔

شیطانیاں از یونس بٹ

میجر عاطف مرزا

قلم آرائیاں یا "قلمِ آرائیاں"

"چاند"، "اخبارِ جہاں"، "آداب عرض"، "پیغام"، "تعلیم و تربیت" اور جانے کون کون سے رسالے، میگزین پڑھے، کوئی ایک بھی تو خادم حسین مجاہد کے شر سے محفوظ نہیں نظر آیا۔ میری دلچسپی اس لیے بھی بڑھی کہ تعلق کے خانے میں سرگودھا لکھا تھا۔ میں نے پھر بھی تلاش کرنا مناسب نہ جانا۔ ایک بار میں "غالب لائبریری، سرگودھا" کے ریڈنگ روم میں بیٹھا تھا وہاں میری ملاقات میرے ایک کلاس فیلو سے ہوئی جو پچھلے دو برس سے میرے ساتھ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں پڑھ رہا تھا۔ مگر ہم ایک دوسرے کے نام سے شناسا نہ ہو سکے تھے۔ اُس روز نام سے بھی پردہ اُٹھ گیا۔ یہی حضرت خادم حسین مجاہد صاحب تھے، جناب چھپے رہے تھے پہلے، ویسے میں اُس وقت اتنا مشہور ہوتا تو نیم پلیٹ لگا کر گھومتا مگر مجاہد تھا کہ کوئی پروا ہی نہیں تھی، یعنی۔۔۔(مناسب محاورہ یا ضرب المثل دستیاب نہیں لہٰذا۔۔۔۔سے ہی گزارا کیجیے)۔

مجاہد نے جب لکھنا شروع کیا تو بچوں کا ادب تخلیق کیا۔ پھول کلیاں، پیغام ڈائجسٹ، تعلیم و تربیت اور بچوں کے کئی اور رسالوں میں مجاہد کی کہانیاں چھپتی رہیں۔ پھر اس نے مزاح پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ طبع آزمائی کیا تھی، اچھا خاصا بالغانہ انداز تھا۔ گویا ایک عرصے سے مزاح اندر اندر پک رہا تھا بالکل کسی آتش فشاں کی طرح......موقع ملا تو پھٹ پڑا اور کئی سنجیدہ سے سنجیدہ شخصیات کو اس مزاحیہ لاوے میں بہتے دیکھا گیا۔

طنز و مزاح لکھنا ایک دقیق فن ہے، جو مجاہد کو بے بہا ملا۔ لفظوں کے حصے بخرے، تلفظ میں ردّ و بدل، لہجے میں ترمیم کر کے ایک نیا لفظ بنا دینا یا اُس لفظ کے معانی و کیفیت کو بدلنا مجاھد کا خاصہ رہا ہے۔ ایک عام واقعے سے لے کر خاص بات تک کو اپنے مزاح کا حصہ بنا لینے میں مجاہد کا کوئی ثانی نہیں (یہ

خادم حسین مجاھد ادب اور زندگی کی ناھمواریوں کو دیکھتے ھیں تو اپنے قلمی نشتر سے اِن ناسوروں کو آھستگی سے چھیڑ دیتے ھیں، اسطرح کہ فاسد مواد بھہ جاتا ھے۔ اِن کے عملِ جراحی میں ایك فطری نفاست اور تیزی ھے۔ اس عمل کے دوران وہ عموماً مریض کو اِس درجہ مبھوت کر دیتے ھیں کہ مریض کو نشتر کی جراحت تك محسوس نھیں ھوتی۔

غلام جیلانی اصغر

بات ثاقی نے مجھے خود بتائی)۔لیکن بظاہر جو بات آپ کو مزاح محسوس ہوگی دراصل اِس میں گہرا طنزیا درد چھپا ہوتا ہے۔

مجاہد کم ازکم ساڑھے تین عشروں سے مزاح کی لسی بنا رہا ہے، جسے وہ پہلے ''دست و گریبان'' نامی پیانے میں ڈال کر لوگوں کو پلا چکا ہے، اور پھر ''قلم آرائیاں'' کے نام سے اِس لسی کا دوسرا پیگ پیش کیا گیا۔اب دیکھیں کہ کس کس پر اِس کا نشہ کتنا چڑھتا ہے۔

اردو میں اعراب مستعمل نہیں لہٰذا ''قلم آرائیاں'' کو ''قلم آرائیاں'' بھی پڑھا جاسکتا ہے، اور حقیقتاً کئی دوستوں نے تو اِس پر اعتراض بھی کیا ہے کہ مجاہد نے شیخ ہوتے ہوئے آرائیوں کا قلم کیسے حاصل کیا؟ دوسرا نکتۂ اعتراض یار لوگ یہ لگاتے پائے گئے ہیں کہ ''قلم آرائیاں'' کرنل محمد خان کی ''بزم آرائیاں'' کی پارٹ 2 لگتی ہے۔''بزم آرائیاں'' چھپنے کے بعد کرنل صاحب کو ''بزمِ آرئیاں گوجرانوالہ'' کی طرف سے شکریے کا خط موصول ہوا تھا، لیکن ''قلم آرائیاں'' چھپنے کے بعد سے اب تک آرائیں برادری خاموش ہے، (نجانے کیوں؟)

''قلم آرائیاں'' میں مجاہد کا باریک بین مشاہدہ اور گہرا تجربہ کوٹ پیٹ کر بھرا ہوا ہے۔ایسے ایسے سچ لکھے گئے ہیں کہ خود سچ کو بھی خوف آنے لگا ہے۔اِس کتاب کی تمام تحریریں مزاح کے نچلے درجے کے علاوہ ہر درجے پر فائز نظر آتی ہیں، کچھ صرف ہلکی سی مسکراہٹ کا باعث بنتی ہیں اور کچھ پر بے ساختہ قہقہہ برآمد ہوتا ہے جس کی شدت اتنی ہوتی ہے کہ ریکٹر سکیل اِسے ریکارڈ کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔پھکڑ پن پوری کتاب میں تلاش کرنے کے باوجود کہیں نہیں مل سکا اور یہی مجاہد کی کامیابی ہے۔پوری کتاب کی 23 تحریروں کی درجہ بندی ایک بہت مشکل کام ہے، ویسے بھی ہر پڑھنے والے کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے، لازمی نہیں کہ جس تحریر کو میں پہلے درجے پر رکھوں سب کو وہ پہلے پر ہی محسوس ہو، لہٰذا قارئین کی اپنی اپنی مرضی۔

مجاہد نے اِس کتاب میں کئی راز بھی افشا کیے، کئی پردہ نشینوں کی نقاب کشائی کی اور تو اور اس نے گھر کا بھیدی بن کر ادیب اور شاعر برادری کے ''ٹریڈ سیکریٹس'' بھی اوپن کر کے لنکا ڈھائی۔اِس کے علاوہ مجاہد کا ایک اور خطرناک انداز یہ ہے کہ وہ دنیائے مزاح کا کرائم رپورٹر بھی ہے۔اُس کی یادداشت غضب کی ہے ایک بار کچھ پڑھ لے تو بھولتا نہیں۔کسی بھی تحریر کو مصدقہ اور مسلمہ دلائل کے ساتھ سرقہ قرار دینے میں دیر نہیں لگاتا۔ڈریے نہیں یہ کام وہ سب کے ساتھ نہیں کرتا، بس چور لکھاریوں کو مارک کر کے کسی کایاں کرائم رپورٹر کی طرح چپکے چپکے ثبوت حاصل کرتا ہے، پھر ایک روز نعرۂ جہاد بلند کر دیتا ہے۔اکثر چور لکھاریوں کو یہ کیفرِ کردار تک پہنچا چکا ہے۔

خادم حسین مجاھد کی طنز میں گھری کاٹ پائی جاتی ھے۔وہ تفصیل کے بجائے ایجاز و اختصار کو پسند کرتے ھیں۔وہ ایك خیال پر ایك تحریر نھیں لکھتے بلکہ ایك تحریر میں کئی خیال پیش کرتے ھیں۔ وہ سماجی موضوعات کے ساتھ ادبی اور سیاسی معاملات کو بھی کامیابی کے ساتھ طنز و مزاح کا روپ دیتے ھیں، جس سے زبان و بیان پر اُن کے عبور اور وسیع مطالعے کا پتہ چلتا ھے۔اِن کے ھاں ابنِ انشاء کی طرح نصابی تحریف (Parody) کے بعض عمدہ نمونے بھی ملتے ھیں جن میں انھوں نے اپنا ایك خاص رنگ پیدا کیا ھے۔ مزید ادبی اجلاس اور تنقیدی مضامین کی جو خوبصورت پیروڈی اُنھوں نے پیش کی ھے اس کی نظیر مشکل سے ھی ملے گی۔

ضیاء الحق قاسمی

ویسے سرِ ورق کا تذکرہ تو پہلے ہونا تھا مگر پھر اندر کے مواد کے ساتھ اس کا موازنہ کرنا صحت مند تصور نہ کیا جاتا۔ کتاب کے مجموعی تاثر کے مقابلے میں سرِ ورق بہت کمزور ہے، اِس کے علاوہ سرِ ورق پر چھپی ہوئی کارٹونی تصاویر کتاب کے نام "قلم آرائیاں" اور اس میں شامل تحریروں کی عکاسی کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے سرِ ورق کی وجہ سے یہ کتاب مناسب مقام حاصل نہ کر سکے۔ اگر صرف مواد پر ہی نظر رکھی جائے تو بلا شبہ ایک قیمتی اور مزاح سے بھرپور کتاب ہے۔

شروع میں مجاہد بسیار نویس تھا مگر اب بسیار خور ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اِسے لکھنے کا وقت کم ہی ملتا ہے۔ اِس کے علاوہ غمِ دوراں اور معاشیات کے چکروں نے بھی اِس کے لکھنے کی رفتار کم کر دی ہے۔ لیکن اب جو بھی لکھتا ہے وہ اتنا وزن دار اور طاقتور ہوتا ہے کہ اس کمی کی کمی پوری کر دیتا ہے۔

خلقِ خدا نے مجاہد کے حق میں صفحہ نمبر ۵ سے ۱۰ تک جو بیان بازی کی ہے وہ صد فی صد درست ہے، جو بھی حوالے انہوں نے پیش کیے ہیں وہ تمام مجاہد سے پوچھے بغیر لکھے گئے ہیں۔ ویسے تو مجاہد نے مجھے بھی تبصرہ لکھنے کی دعوت نہیں دی، میں از راہِ ہمدردی یہ فریضہ سر انجام دے رہا ہوں (حقِ دوستی بھی تو ادا کرنا ہے نا)۔ آخر کو کل میری بھی تو کتاب آنی ہے نا۔ کوئی اور تبصرہ لکھے نہ لکھے مجاہد کو تو لکھنا پڑے گا۔

آیئے مجاہد کی تحریروں کا عکس ملاحظہ کریں:-

۱۔ پروفیسر وحشت پوری، آوارہ کو محدب عدسے کی مدد سے چیل کے گھونسلے میں ماس تلاش کرتے ہوئے ملے۔ یہ خبر سن کر انہوں نے آوارہ کو مبارک باد کے طور پر پدی کا شوربہ پلایا۔ آوارہ کو مزید مشق کے لیے سیر کا حکم دے کر خود نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے چل دیے۔

(رازدارِ حیوانات۔ صفحہ 13)

(یہاں دیکھیے کہ مجاہد نے کس خوبصورتی سے اردو محاوروں کی چٹنی بنائی اور اپنی تحریر کا الّو سیدھا کیا۔)

۲۔ امیدوار ایک ایک کر کے اندر جاتے اور واپس آتے رہے فرق صرف یہ تھا کہ اندر جاتے ہوئے ان کی امید کی ٹیوب لائٹیں روشن ہوتیں اور واپسی پر ان کے پورے چہرے پر لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہوتی، نہ جانے اندر کیسے 'واپڈا' صفت لوگ بیٹھے تھے۔

چپراسی نے ایک امیدوار کو اندر بھیج کر سگریٹ نکالی تو مغرور فوراً اٹھا اور لائیٹر سے سگریٹ سلگانے کے بہانے اُسے ایک سرخ نوٹ کی جھلک دکھا کر سرگوشی کی۔

> خادم حسین مجاھد کی تحریروں میں تازگی اور گھرائی کے ساتھ ساتھ ایك چونکا دینے والا تیکھا پن ھے۔ اس کے ھاں واضح سماجی شعور پایا جاتا ھے۔ اس کی نظر اپنے ماحول کی ناھمواریوں پر مرکوز ھے۔ وہ ھمیں سماج کے ناسوروں لی طرف متوجہ کرنے کی برابر کوشش کرتا ھوا نظر آتا ھے، یھی وجہ ھے کہ اس کے طنز میں تفکر کا رنگ غالب ھے تو مزاح میں خیر خواھی کا، اسی لئے اِن کی تحریر کا ساختیاتی مطالعہ جھاں طنز و مزاح کی تمام جھتوں پر اس کی فنی مھارت کو ظاھر کرتا ھے وھاں پس ساختیاتی مطالعے میں ھمیں اپنے ھی معاشرے کی حقیقی تصریو اپنی تمام تر تلخیوں اور مضحکہ خیزیوں سمیت نظر آتی ھے۔ اب یہ ھماری مرضی ھے کہ اس کا سامنا کریں یا آنکھیں بند کر لیں۔
>
> ڈاکٹر وزیر آغا

> خادم حسین مجاھد نیم فلسفی، نیم ملا ھے (وضاحت کے لئے اس کی تصویر دیکھ لیں) تحریریں لکھتے ھوئے اس کا لاشعور قیانے اور فلسفے کے زیرِ اثر جدلیاتی حقائق کو بھی تخلیق میں گھوٹ دیتا ھے، اِسی لئے اس کی تحریریں مسمریزم اور ھپناٹزم کے سے اثرات رکھتی ھیں جن کی ٹرانس سے کوئی بھی باذوق اور زندہ دل نھیں نکل سکتا۔ یہ جانوروں کی نفسیات اور انسانوں کے بارے میں ان کے خیالات اِتنے وثوق سے بیان کرتا ھے کہ اس کے اشرف المخلوق ھونے پر شك ھونے لگتا ھے۔
>
> امر بلال رانا

''یار تم تو محرمِ رازِ درونِ خانہ ہو، اِس ظالم انٹرویو میں کامیابی کا کوئی گُر تو بتاؤ۔''

''بیس پچیس نیلے نوٹ اکٹھے کرو یا کوئی سفارش پیدا کرو۔'' اُس نے جوابی سرگوشی کی۔

''میں کیسے سفارش پیدا کر سکتا ہوں میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔''

''ارے بھئی اسمبلی ہال چلے جاؤ اور کوئی سفارش گود لے لو، وہی سفارشوں کا میٹرنٹی ہوم ہے۔''

(از قصابی تا نوابی۔ صفحہ ۴۴)

۳۔ شاعر دماغ رکھتے ہیں یا نہیں یہ قصہ بحث طلب ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ کے بغیر کوئی شاعری کیسے کر سکتا ہے، جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی دماغ کے ہوتے ہوئے شاعری کیوں کرے گا۔

(قلم قبیلہ۔ صفحہ ۴۴)

مولیاں تیرے روبرو رکھتے
تجھے ہر وقت بے وضو رکھتے

(آنجہانی شاعری۔ صفحہ ۶۱)

۴۔ مجھے شکایت مل رہی ہے کہ رسائل کی پروف ریڈنگ آنکھیں بند کر کے کی جاتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ پچھلے ماہ ماہنامہ ''آفت'' میں میرا ایک مضمون چھپا تھا جس کے چند جملے یوں تھے ''اسلام آباد میں ایک گھر میں مغنی غزل گا رہا تھا جبکہ دوسرے میں ایک بیدار بخت مصلے پر کھڑا کہتا تھا، اے خدا! میں حاضر ہوں، اپنی تمام تر سیاہ کاریوں کے ساتھ۔'' لیکن کمپیوٹر کی فنکاری کے باعث یہ شائع کچھ یوں ہو گئے، ''اسلام کے گھر میں ایک مفتی غزل گا رہا تھا جبکہ دوسرے میں بیزار بخت تسلے پر کھڑا بہتا تھا، اے خدا میں کافر ہوں اپنی تمام تر سیاہ گاڑیوں کے ساتھ۔'' میں نے تو اپنا گردہ پیٹ لیا۔

(ادبی اجلاس۔ صفحہ ۸۱)

۵۔ سوال نمبر ۳:۔ سکھ اور حجام میں کیا دشمنی ہے، تاریخی حوالوں سے وضاحت کریں، اگر ان میں صلح ہو جائے تو مزید کتنے ہیئر کٹنگ سیلون کھولے جا سکتے ہیں؟

(پرچہ گنج و حجامت۔ صفحہ ۸۷)

۶۔ چوری دراصل مساوات اور برابری جیسے سنہری اصولوں کے نفاذ کی عملی کوشش ہے جس میں سرمایہ زیادہ دولت مند سے کم دولت مند کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جو سماجی استحصال اور معاشی ناہمواریوں کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

(اقتباس از ''چوری ایک معاشرتی ضرورت'' از چورِ اعظم حضرت سارق رہزن آبادی)

(چور کی ڈائری۔ صفحہ ۱۱۰)

یہ تمام حوالے پڑھنے کے بعد آپ لوگوں کو اندازہ ہو جانا چاہئے کہ خادم حسین مجاہدؔ دراصل ایک کامیاب اور بڑا مصنف ہے۔ ابھی تک اِس پر نقادوں کی نظر کا نہ پڑنا اِس کی کمزوری نہیں بلکہ نقادوں کی اپنی کم نظری اور نالائقی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب بڑے بڑے نقاد اِس کی تحریوں پر تنقید کرنے کے لیے اِس سے ''اِجازت'' طلب کیا کریں گے۔ اور تو اور مجھے تو یہ بھی گمان ہو رہا ہے کہ مجاہدؔ کی اپنی کتابوں سے زیادہ اِس کی کتابوں پر نقادوں کی آراء پر مبنی کتابیں شائع ہوا کریں گی اور ہر کتاب میں اِس کی کتابوں پر تنقید اور اُن کی تشریح کا دعویٰ بھی کیا جائے گا اور ہر نقاد مجاہدؔ کا قریب ترین دوست ہونے کا دعویٰ بھی کرے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔ اورررررررر

خادم حسین مجاهد کی تحریریں اختصار اور جامعیت کا حسین امتزاج هوتی هیں۔ وہ قاری کا وقت ضائع نهیں کرنا چاهتے اس لئے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ پیغام دینا چاهتے هیں۔ اِن کی تحریریں آئیڈیاز سے بهرپور اور پهلو دار هوتی هیں۔ ایك ایك جملے سے کئی کئی مطلب برآمد هوتے هیں۔ یه صنفِ نازك کے موضوع پر بے حد احتیاط سے لکھتے هیں۔ اِن سے شرمیلا مزاح نگار آج تك نهیں دیکھا گیا۔ یه ایسے ایسے پرچے سیٹ کرتے هیں که طلباء پریشان هونے کے بجائے هنسی سے لوٹ پوٹ هو جاتے هیں۔

رقیہ آرزو

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد کی "فنی" زندگی

وہ ایک گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر تھی جب ایک پیدل ڈاکیے نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ کھولا تو پسینے میں شرابور ڈاکیے نے ایک بنڈل میرے ہاتھ میں پکڑایا اور کہا'' آپ کے ایم خالد ہیں'' میں نے سر ہلا دیا اس نے ایک کاغذ پر خود ہی میرا نام لکھا اور کہا'' ایک گلاس پانی مل جائے گا''۔میں اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا''کیا پیو گے۔۔۔ بوتل یا شربت؟'' اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے'' اگر بوتل مل جائے پیپسی کی ٹھنڈی یخ تو کیا بات ہے''۔تھوڑی دیر میں بوتل آ گئی اس نے بوتل کے دو تین گھونٹ ہی لئے میں نے اس سے پوچھا''یہ بنڈل کہاں سے آیا ہے؟'' اس نے بنڈل میرے ہاتھ سے لے کر کہا''یہ بھا بھڑا سرگودھا سے آیا ہے''۔میں ہنستے ہوئے کہا'' آپ یہ پیکٹ لے کر سرگودھا سے آئے ہو تو کسی کوریئر کے ہاتھ بھیج دیتے''۔ڈاکیا کھسیانا سا ہو گیا'' میں جناب کوریئر کمپنی سے ہوں، کمپنی ذرا ماٹھی ہے میری سائیکل پنکچر تھی اس لئے ویگن سے شاپ تک آیا اور وہاں سے پیدل آپ کے گھر، ٹی سی ایس نے بھی تو پارسل ہی پہنچانا تھا ہم نے بھی پہنچا دیا''۔اس نے مجھ سے یہ کہتے ہوئے اجازت چاہی کہ جناب اگر کہیں پارسل مناسب ریٹس یعنی سرکاری ڈاک سے بھی کم ریٹس پر تو ہماری کوریئر کمپنی کو ضرور یاد رکھئے گا۔

کتابوں کے بنڈل کو بڑے سلیقے سے ٹیپ کے ساتھ بند کیا گیا تھا ٹیپ اتری تو اس میں دو کتابیں نکل کر مجھ سے دست و گریبان ہو گئیں ایک ''قلم آرائیاں'' اور دوسری ''دست و گریبان''

''یہ میرا خادم حسین مجاہد سے دوسرا تعارف تھا پہلا تعارف تو تیس روزہ ''چاند'' کے حوالے سے تھا جہاں ہمارا ''قلمی دشمنی'' کا سلسلہ تو تھا کیونکہ ایک رائٹرز دوسرے رائٹرز سے بغض رکھنا ناممکنات سے نہیں تھا لیکن ہماری قلمی دوستی نہ جانے کیوں نہ ہو سکی حالانکہ خادم حسین مجاہد نے چاند کے سب دوستوں کو اپنی شادی کی ایک اجتماعی دعوت یوں دی جیسے کسی سیاسی جلسے کی دی جاتی ہے جس کا احوال بھی بعد میں کسی ''لفنگے'' نے ''چاند'' میں ''شادی خادم حسین مجاہد کی'' کے نام سے شائع کروایا۔

میں پیکٹ پر دیئے ہوئے نمبر پر فون کیا تو ایک چہکتی ہوئی آواز سنائی دی میں نے کہا'' جی خادم'' فون والے نے خادم حسین مجاہد پکارا تو ایک زندگی سے بھر پور آواز سنائی دی'' جی کون۔۔۔؟'' میرے کے ایم خالد کہنے کی دیر تھی کہ بس مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا فون کسی خاتون کے ساتھ مل گیا جب وہ تقریباً بیس منٹ بعد شائد گلا کھنکھارنے کے لئے رکا تو میں نے موقع غنیمت جان کر اس کی کتاب بھجوانے کا شکریہ ادا کیا۔جس پر اس نے دوبارہ سٹارٹ لیا جس میں مجھے پتہ چلا کہ'' بغض'' صرف میری طرف نہیں چل رہا دوسری طرف بھی ایسا ہی حال ہے اس کی طویل گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ بھی میری طنز و مزاح سے بھر پور تحریروں سے ''نالاں'' ہے۔اپنی گفتگو میں خادم حسین مجاہد نے مجھے پتے کی بات یہ بتائی کہ میرے بات ختم کرنے کا انتظار کرنے

سرگودھا میں ہنسی کی ہر سازش کے پیچھے کہیں نہ کہیں خادم حسین مجاہد کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔

صوفی فقیر محمد

کی ضرورت نہیں آپ کسی لائیو شو کے اینکر کی طرح میری بات کاٹ کر اپنی بات کر سکتے ہیں۔

خادم حسین مجاہد کی طویل تحریروں کے طویل مطالعے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شائد کسی استاد مزاح نگار کی تحریروں کو نہیں پڑھا کیونکہ اس کا ایک اپنا ہی اندازِ تحریر اور اسلوب بیاں ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قاری کے پسند کرنے یا نہ کرنے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ خادم حسین مجاہد کافی عرصہ ''چاند'' میں چھائے رہے اور ''احمقستانی اسمبلی'' کی ایسی بنیاد ڈالی کہ اپنی قومی اسمبلی کی لائیو کاروائی دیکھ کر نہ جانے کیوں خادم کی ''اسمبلی'' ذہن میں گھوم جاتی ہے۔ خادم نے ہر وہ چیز لکھی جس کے بارے میں اسے تھوڑا سا بھی شک تھا کہ اس سے قاری کا ہاسا نکل سکتا ہے۔ خادم حسین مجاہد کی تحریروں کا صرف پاکستان ہی نہیں انڈیا بھی دیوانہ ہے وہاں کے ''شگوفہ'' سمیت بہت سے رسائل میں ان کا مزاحیہ مواد شائع ہو چکا ہے۔ جب تک ''چاند'' شائع ہوتا رہا وہ مزاح لکھتے رہے جب سے چاند بند ہوا ہے، ان میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا۔

اُنہوں نے پاکستان کے فکاہیہ ادب پر یہ بہت بڑا ''احسان'' کیا ہے کہ نفع نقصان کی پروا کئے بغیر انہوں نے اپنا طنز و مزاح کا ملغوبہ کتابی شکل میں شائع کر کے دوستوں تک پہنچا دیا ہے ان کی دو کتابیں اس وقت نہ صرف پبلشرز کے پاس تھوک تعداد میں موجود ہیں بلکہ ان کے اپنے پاس بھی بڑا اسٹاک ''گھن'' کے چکر میں ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے مسٹر گوگل انہیں مزاح نگاروں کی صف میں دکھاتی ہے۔ بلکہ ان کی کچھ کتابیں بین الاقوامی بک سٹالوں کے پاس بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی کتاب کی پی ڈی ایف فائلز بھی نیٹ ورک پر موجود ہیں تاکہ مستقبل میں اگر کوئی مزاحیہ ادب کا طالب علم ان کی شخصیت پر کوئی مقالہ لکھنا چاہے تو اسے ''بھا بھڑا بازار'' کا رخ نہ کرنا پڑے۔

خادم حسین مجاہد کی ''قلم آرائیاں'' میں شامل تحریروں ''کہتی ہے خلق خدا'' سے ''راز دار حیوانات''، ''قلم قبیلہ''، ''آنجہانی شاعری''، ''ادبی اجلاس''، ''چور کی ڈائری'' اور ''کھٹی میٹھی'' تک جو کا تو سب ہی ''لال'' ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے کی بعد اگر کسی کے لبوں پر مسکان نہیں ابھری تو یا تو پھر اسے کسی نفسیات کی ڈاکٹر کی ضرورت ہے یا پھر وہ مسکرانا ہی نہیں چاہتا ہوگا کیونکہ جو سرٹیفیکیٹ اسے ڈاکٹر وزیر آغا اور ضیا الحق قاسمی جیسی شخصیات نے دے دیا ہے اس کے بعد میری کچھ کہنے کی گنجائش نہیں بچتی۔

خادم حسین مجاہد نے اب تک جتنی تعلیم حاصل کر لی ہے اگر وہ لاہور، اسلام آباد یا کراچی میں ہوتے تو کسی چینل کے انٹرٹینمنٹ کی ہیڈ ہوتے یا کسی یونیورسٹی میں کسی فیکلٹی کے ڈین ہوتے لیکن انہیں کچھ ''بھابھڑا'' سے پیار ہی اتنا ہے کہ کالے بالوں سے سفید ہوتے بالوں میں وہ وہیں طالب علم بچوں کے لئے ''ڈائن'' بنے ہوئے ہیں۔

''قلم آریاں'' میں ایک فقرہ جو کہ شائد آج کی ادبی دنیا کا سچ ہے:

> ''وہ بیک وقت کوئی پچاس کے قریب علمی، ادبی، ثقافتی، سماجی اور معاشی تنظیموں کی مرکزی ذمہ داریاں اپنے سنگل سائز کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں جو ڈھنگ سے کوئی جنازہ اٹھانے کے قابل بھی نہیں''

(قیس صحرائی)

معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کے خلاف خادم حسین مجاہد کا رویہ جارحانہ ہی نہیں، مجاہدانہ بھی ہوتا ہے۔ مسکراہٹیں تقسیم کرنے والا یہ فنکار جب قلمی جہاد پر نکلتا ہے تو مکروہ چہروں سے خوش نما نقاب نوچ لیتا ہے۔ یہ کوشش کے باوجود ظلم، استحصال، ناانصافی اور کرپشن سے اپنی نفرت چھپا نہیں سکتا کیونکہ یہ وہ مجاہد ہے جس کی اذان ملا کی اذان سے بہرحال مختلف ہوتی ہے۔

ڈاکٹر رضوان ثاقب

نوید ظفر کیانی

خادم حسین مجاہد کی مزاح نگاری

خادم حسین مجاہد نے اور بہت سوں کی طرح اپنی کتاب ''قلم آرائیاں'' کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے ''مزاحیہ مضامین''۔ میں اس طرح کی پیشانیوں کو قارئین کیلئے پریشانیاں سمجھتا ہوں۔ ایک دفعہ میرے ساتھ بھی ہاتھ ہو چکا ہے۔ کنگلے زمانے یعنی زمانہ طالب علمی میں، میں ایک ایسی ہی کتاب خرید کر لایا تھا جس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا ''انشائیوں کا مجموعہ''۔ بہت سے شاداب اور خوش باش انشائیہ نگاروں کے انشائیے پڑھ کر میں گمان کر بیٹھا تھا کہ یہ بھی کوئی ویسی ہی کتاب ہوگی جسے پڑھ کر میں دل پشوری کر سکوں گا لیکن باپ رے باپ، صفحۂ اوّل تا آخر، فلسفے اور ثقیل نگاری کے ایسے طوفانِ بدتمیزی سے سابقہ پڑا کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اب کسی کتاب کے سرِ ورق پر کوئی اس قسم کا اعلان دیکھتا ہوں تو دوکاندار کی گھوریوں کی پرواہ کئے بغیر یہ اطمینان ضرور کر لیتا ہوں کہ واقعی درست لکھا گیا ہے یا سیاست بھگاری گئی ہے۔ خادم حسین مجاہد کو اپنی کتاب کے سرِ ورق پر ''مزاحیہ مضامین'' لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، سرِ ورق پر اُن کا نام ہی کافی تھا۔ خادم کے پہلو بہ پہلو مجاہد کا لفظ دیکھ کر پڑھنے والوں کو پتہ چل جاتا کہ واقعی یہ مزاحیہ مضامین کی کتاب ہے۔

''قلم آرائیاں اور ''دست و گریباں'' زندہ دلی کے مکمل نسخے ہیں جنھیں معاشرے کا کوئی بھی حکیم یا ڈاکٹر پورے تیقن سے امراضِ قلب میں مبتلا اور قنوطیت کے شکار مریضوں پر آزما سکتا ہے، انشاللہ اُسے کبھی مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ شوخ بیانی، طنز و استہزا، بشاشت، ظرافت، رمز، ایجاز، مخول، ٹھٹھا، سخن چینی، نقطہ چینی، تفنن کیا نہیں ہے اِن کتاب میں، لیکن یہ بات بھی دل پر ہاتھ رکھ کر تسلیم کرنی پڑے گی کہ اِن سب گھوڑوں کی لگامیں ہمیشہ اور ہر جگہ خادم حسین مجاہد کے نہایت مضبوط ہاتھوں میں محسوس ہوتی رہی ہیں، اُن کی جانب سے ذراسی بھی ڈھیل کا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اُن کی ظرافت میں بے سمتی بھی نہیں ہے۔ ہر تحریر ایک واضح پیغام دیتی نظر آتی ہے۔ واشگاف اور صحافت کی زبان میں ''مبینہ طور پر''، ہر تحریر میں فلیش لائٹ براہِ راست اور مکمل طور پر موضوع پر مرتکز ملتی ہے لیکن اس قدر سادگی میں بھی پُرکاری دیکھی جا سکتی ہے، ٹو دی پوائنٹ ہو کر بھی تحریر کے ہزار ہا پہلو دانت نکالے نظر آتے ہیں، ضیاء الحق قاسمی مرحوم نے اُن کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے:

> ''وہ ایک خیال پر ایک تحریر نہیں لکھتے بلکہ ایک تحریر میں کئی خیال پیش کرتے ہیں۔''

کہا جاتا ہے کہ مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ اِس کے لئے ایک تو خود لکھنے والی کی فطری خوش طبعی کا عمل دخل ہوتا ہے اور دوسرا یہ بھی لازم ہے کہ اُس میں معاشرتی، معاشی، سیاسی، عمرانیاتی غرض یہ کہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں موجود ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں سے مفاہمت کا جذبہ نہ ہو اور وہ اُس کو اُسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے بیوی سوتن کو دیکھتی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کامیاب مزاح نگاری کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ کسی وقوعے پر اپنی شدید ذاتی ناپسندیدگی کے باوجود اپنے شدید ردِ عمل کو قابو میں رکھ کر نہایت نفاست سے چٹکیاں لے کر موضوع سے انصاف کرے۔ ہمارے مجاہد کے لئے تو لگتا ہے کہ مزاح لکھنا خالہ جی کا گھر ہے۔ کسی بھی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہا ہو، اس

ابتدا سے ہی خادم حسین مجاہد کے قلم میں وہ پختگی ہے جو برسوں کی ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب تو اس کا قلم مزید نکھر گیا ہے۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال

قدر بیساختگی اور روانی سے چھکلے چھوڑتا ہوا بہتا جاتا ہے کہ راوی کے بہاؤ کا سماں بندھ جاتا ہے۔اُن کے نشتروں کی کاٹ اور تیزی کسی بھی موڑ پر کند نہیں لگتی۔

ہمارے دفتر میں تین افراد پر مشتمل ایک بھانڈ گروپ ہے جس کا کام بقول شخصے بلا انصاف تمام لوگوں کی لباس دری کرنا ہے۔ اِن تینوں بھانڈوں کو نقالی پر اس قدر عبور حاصل ہے کہ دیکھا چاہیئے ۔اہلِ مجلس کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے ہیں،اُن کی اِس قدر پُر لطف محفل سے کوئی بھی اُٹھ کر جانا نہیں چاہتا۔محفل سے اُٹھ کر جانے کا مطلب ہے کہ محفل کا موضوع بننا یا ''جگتوں کا نشانہ'' بننا، جس کے لئے کسی کا بھی ظرف راضی نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس طرح وہ کچھ دیر قبل دوسروں کی ''لباس دری'' پر ہنستا رہا ہے، دوسرے بھی اُس کا ٹھٹھا اُڑانے میں اِسی خشوع و خصوع کا مظاہرہ کریں گے۔یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کی کمزوریوں پر تو خوب لطف اندوز ہوتا ہے لیکن جب خود اُس کی کمزوریوں کا مذاق اُڑایا جائے تو اُس کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔

خادم حسین مجاہد اِس کا قطعاً قائل نہیں۔ وہ دوسروں کی طرح خود اپنے آپ پر بھی ہنسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔خود اپنی برادری ''ادیبوں'' پر قلم آرائیاں میں ایک پورا مضمون ملتا ہے جو اُنہوں نے غالباً آئینے کے سامنے بیٹھ کر لکھا ہے۔ اپنی قلمکاریوں پر اِس قدر نفاست سے خنجر آزمائی کی ہے جیسے اکبرالہ آبادی نے اپنے ایک شعر میں اپنے آپ کو لہولہان کیا ہے:

بھیا رنگ یہی ہے اچھا
ہم بھی کالے یار بھی کالا

اپنے مضمون قلم قبیلہ میں ''ادیب'' کی تعریف میں خادم حسین مجاہد لکھتا ہے:

''خود کو جینئس سمجھنے والا ایک کھسکا ہوا انسان جو اس خوش فہمی کا شکار ہوتا ہے کہ معاشرے کو بذریعۂ قلم سدھار لے گا لیکن یہ بیچارہ خود کو بھی ساری عمر سدھار نہیں سکتا۔''

بہت سے مزاح نگاروں کا طریقۂ واردات ہی الفاظ سے کھیلنا ہے۔ وہ کسی بھی بات سے یوں بات نکالتے ہیں جیسے سیاستدان خیر کے کاموں سے بھی اپنی آف شور کمپنیوں کے لئے سرمایہ۔محض اِسی ہتھیار کو استعمال کر کے بہت سے مزاح نگاروں نے خود کو مشفق خواجہ، یونس بٹ، انور مقصود، گلِ نوخیز اختر وغیرہ بنا ڈالا ہے۔خادم کا ترکش بھی رعایت لفظی کے اِن تیروں سے خالی نہیں۔ وہ باتوں ہی باتوں میں انتہائی معصومیت سے ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ بندہ بیساختہ ہنس دیتا ہے۔مثلاً اپنے ایک مضمون ''انگریزی اور ہم دیسی'' میں وہ یوں چٹکیاں بھرتے ہیں۔

مجھے ایک دفعہ ان کا انگریزی اردو مکس میسج ملا تو میں نے سر پیٹ لیا۔ لکھا تھا'' کل میری میرج marriage کی برتھ ڈے birthday ہے آپ کی دعاؤں کا ویٹ weight کروں گا۔'' شادی کی سالگرہ کا ترجمہ جو انہوں نے اپنی ورسری کی بجائے برتھ ڈے (یوم پیدائش) سے کیا اس کی صحیح داد تو کوئی انگریز ہی دے سکتا ہے۔ہم تو حیران تھے کہ شادی کی پیدائش کا دن بھی ہوتا ہے اور پھر انتظار کرنے کے لئے weight واہ۔

الفاظ کے اُلٹ پھیر سے نئے مضحک و ظریفانہ مفہوم نکالنے کو پیروڈی یا تحریف کہا جاتا ہے۔اُردو ادب میں مزاحیہ شاعروں نے کثرت سے تحریفیں لکھی ہیں لیکن ہماری نثر کا دامن بھی تحریف سے خالی نہیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، عطاالحق قاسمی، یونس بٹ وغیرہ نے تحریف نگاری کے کامیاب تجربے کئے ہیں۔خادم حسین مجاہد بھی اس میدان کا مجاہد ہے۔اُن کی کتابوں قلم آرائیاں اور دست و گریبان میں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔''قلم آرائیاں'' کی تحریر ''ادبی اجلاس'' اس سلسلے کا ایک عمدہ نمونہ ہے، جس کا ایک ابتدائی

قاشہ پیشِ خدمت ہے۔

''خواتین و حضرات! بزمِ ادب کے زیرِ انہدام اس یتیم الشان ادبی محفل میں بادل صحرائی بجلی پوری پورے زور سے کڑکتے ہوئے آپ کو خوش آمدید کہنے کی جسارتِ عالیہ کی جسارت کر رہا ہے۔امید ہے کہ آپ ہمیشہ کی طرح آج بھی کانوں میں روئی دے کر پُر امن طریقے سے تشریف فرما رہیں گے اور ہمیں ہماری حماقت کا احساس نہیں دلائیں گے۔''

عموماً طنز و ظرافت کا استعمال ایک ساتھ ہوتا ہے اور اِن دونوں میں امتیاز نہیں برتا جاتا حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ظرافت خالص مزاح ہوتا ہے جس سے پڑھنے والوں کو ہنسانا مقصود ہوتا ہے،اس میں کسی پر چوٹ نہیں کی جاتی جبکہ اس کے برخلاف طنز تیز اور چبھتے ہوئے خفتہ معنی رکھتا ہے لیکن اس میں ہجو کی طرح کثافت اور زہر بھرا ہوا نہیں ہوتا۔اسے تنقید کی جڑواں بہن بھی کہا جا سکتا ہے،تاہم یہ اُس کی خاصی لڑاکا بہن ہوتی ہے اس لئے اس میں کاٹ اور بے اعتدالی بھی زیادہ ہوتی ہے۔خادم حسین مجاہد کے ہاں طنزیہ اندازِ فکر جا بجا ملتا ہے۔اُن کی ایک تحریر''از نوابی تا قصابی'' کی اختتامی سطور اس اسلوب کی ایک عمدہ مثال ہے۔

''آج ہمارا ایک عالیشان گھر ہے۔ایک قصاب مارکیٹ ہے اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔بیسیویں گریڈ کے افسر ہم سے قرض لینے آتے ہیں۔ہماری بیٹی کسٹم میں آفیسر ہے،ایک بیٹا پولیس میں ہے اور دوسرا ڈاکٹر ہے۔یوں ہماری اولاد جدید بنیادوں پر ہمارے پیشے کو آگے بڑھانے میں مصروف ہے۔''

خادم کے مزاح میں ''تفنن'' کے اسلوب کی بہت اعلیٰ شکل موجود ہے۔اُنہوں نے بہت سے بزرگانِ سخن کے ساتھ چہلیں کی ہیں۔اس سلسلے میں اُن کا مضمون ''مرزا غالب'' بھی خاصے کی

خادم حسین مجاهد عوام میں سے هے اسی لئے اپنی تحریروں میں سیاست سے ''امتیازی'' سلوک کرتا هے۔ سیاست کے نالے کی ''بهل صفائی'' کرتے هوئے اس کے چهرے پر بڑی قاتل مسکراهٹ هوتی هے۔ نوجوان مزاح نگاروں میں اس جیسا بیباک ادیب اور کوئی نهیں۔

ارشاد العصر جعفری

چیز ہے۔اس میں وہ رقم طراز ہے۔

جب اُنہوں نے دیوان مرتب کیا تو اپنی رنگین جوانی کی سنگین شاعری کا بیشتر حصہ حذف کر دیا۔ اس کے باوجود ان کا چھوٹا سا دیوان دوسرے شاعروں کے بڑے بڑے دیوئوں کو ناک آؤٹ کر دیتا ہے،کیونکہ غالب کے معیار پر پرکھا جائے تو کئی لوگوں کے دیوان کے دیوان حذف کرنا پڑیں گے،مگر مرزا کا انکسار ملاحظہ فرمائیں کہ پورا اردو دیوان مومن کے ایک شعر کے بدلے دینے کو تیار ہوگئے،وہ تو شکر ہے مومن صاحب اس تبادلے پر راضی نہیں ہوئے ورنہ آج ہمیں غالب کے بجائے مومن کو جھیلنا پڑتا اور پھر نجانے ہمارا کیا انجام ہوتا۔

خادم حسین مجاہد پیشے کے لحاظ سے ہی اُستاد نہیں،ادیب بھی بڑا اُستاد قسم کا ہے۔اپنی نصابی اوزار کو مزاح نگاری میں بھی کھینچ لانا اُنہیں کا بودا ہے۔اپنے بالغ شاگردوں کے لئے نمونے کی عرضی نویسی،خطوط نویسی،معاشرے کے مختلف طبقات کے لئے امتحانی پرچے وضع کرنا اُنہیں کا کمال ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اگر آپ بیک وقت قہقہہ،زیرِ لب تبسم،بدیہہ گوئی،موشگافیوں،ٹھٹھابازیوں،چٹکلے،خندۂ استہزا اور اسی طرح کی دوسری ظرافت نگاریوں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں خادم حسین مجاہد کی کسی بھی تحریر کا مطالعہ آپ کی صحت کے لئے ازحد مفید ہوگا۔

خادم حسین مجاہد

شاعر

قلم آرائیاں کے مضمون "قلم قبیلہ" کا ایک حصہ

تعارف

کسی دلی یا دماغی چوٹ کے باعث منہ اور قلم کے راستے کسی موزوں کلام اُگلنے والی توپ کو ''شاعر'' کہتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اس کا وجود ثابت ہے اور یہ واحد پیداوار ہے جس کا کبھی قحط نہیں پڑا، ہمیشہ افراط ہی رہی ہے۔ سقوطِ غرناطہ مغلوں کے آخری دور اور عربوں کے زمانہ جاہلیت اور سکھوں کے آخری دنوں پر نظر دوڑائیں تو یہ بات ٹیوب لائٹ کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ جب بھی کوئی قوم تباہی کے دہانے پر پہنچی، اس میں شاعر حد سے زیادہ بڑھ گئے، جنھوں نے کار پردازانِ سلطنت کو شاعری پر لگا کر کاروبارِ سلطنت سے غافل کر دیا اور دشمنوں کا کام آسان کر دیا شائد یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے جنگِ آزادی کے بعد دوسرے درباریوں کو تو پھانسی دے دی مگر مرزا غالب اور دوسرے شاعروں کو انعامات سے نوازا۔

اسباب

کوئی انسان اچانک شاعر کیسے بن جاتا ہے، اِس بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال اِن سب کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ دماغ چلنے کی طرح اس کے بھی کئی اسباب وعوامل ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ ہر انسان زندگی میں ایک بار شاعر ضرور بنتا ہے۔ جب وہ دل کا تبادلہ کرتا ہے، بعد میں بے شک بندہ بن جائے۔

پہچان

یوں تو اہلِ نظر شاعر کو دور سے اور ''باادب'' گفتگو سے پہچان لیتے ہیں، پھر بھی آسانی کے لئے موٹی موٹی نشانیاں بتائے دیتا ہوں کہ شاعر بننے کے بعد یہ اپنے نام میں کسی عجیب وغریب لفظ کا اضافہ کر لیتا ہے جسے تخلص کا نام دیتا ہے۔ بعض دور اندیش شاعر بننے سے قبل ہی کوئی تخلص الاٹ کر لیتے ہیں مبادا کوئی دوسرا قبضہ نہ کر لے۔ یہ تخلص عموماً ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بار سننے والا چونک اٹھتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک بھولا بھالا لڑکا جسے آپ عبدالرّشید کے نام سے جانتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ''شیدا'' کہہ کر سگریٹ بھی منگواتے ہیں، اچانک پتہ چلتا ہے کہ وہ عبدالرّشید اب بھولا بھالا شیدا نہیں رہا بلکہ عبدالرّشید آزردہ ہو کر رہ گیا ہے۔ آپ لاکھ اس کی آزردگی کا سبب جاننے کی کوشش کریں، وہ وضاحت نہیں کرتا۔ کسی کے شاعر ہونے کی دوسری بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ جو کرے گا وہ کہے گا نہیں۔ یہ عملی زندگی میں انتہائی بے عمل ہونے کے باوجود شاعری میں بہت باعمل ہوتا ہے۔ اس کے ارادے خواہشات اور مقاصد عموماً ممکنات کی سرحد سے پار واقع ہوتے ہیں مگر جب قلم قرطاس اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو وہ اس کو صحیح معنوں میں خنجر کی طرح استعمال کرتا ہے اور وہ کارنامے سرانجام دیتا ہے کہ

شریف اداکارہ

ایک وقت تھا جب ''شریف'' اداکارہ فلمی دنیا میں پورے ۱۰۰۰ واٹ کے مرکری بلب کی طرح جگمگا رہی تھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے فلامنٹ کی طاقت کم ہوتی گئی تو اس نے وولٹیج پورے کرنے کے لئے جسمانی بجلی کا بھرپور استعمال شروع کر دیا، جس سے کئی منچلوں کے دِل شارٹ سرکٹ ہو کر جل گئے۔ بیشمار ہیروئنیں اس کے فیوز (fuse) ہونے کی دعائیں مانگتے مانگتے ایکسپائر (Expire) ہو کر بچوں کو کہانیاں سنانے پر مجبور ہو گئیں مگر شریف اداکارہ نے کسی نیوٹرل سے بندے کیساتھ تعلقات کی تاریں جوڑ کر زندگی کی ہائی سپیڈ موٹر چلانے کی کوشش نہ کی۔ دراصل وہ اس ڈر سے فلم انڈسٹری سے کنکشن نہ کاٹ رہی تھی کہ بیرونی دنیا کی گرم ہوا اس کے ٹرانسسٹر نہ جلا دے حالانکہ پوری دنیا میں اس کے اِتنے پنکھے (Fans) موجود تھے کہ وہ گرمیوں میں فل ائرکنڈیشنڈ زندگی گزار سکتی تھی لیکن اس نے حُسن کا فیوز اُڑنے تک فلموں میں جلوؤں کی تھری فیز سپلائی جاری رکھی۔ ''عجب آزاد عورت تھی۔''

''قلم آرائیاں'' از خادم حسین مجاہد

بڑے بڑے سورما چیں بول جاتے ہیں، یہ چاہے تو آہ سے آندھی چلوا دے، جنگل جلا کر راکھ کر دے، پوری دنیا آنسوؤں کے سیلاب میں غرق کر دے اور اس میں تیراکی کرتا در محبوب تک پہنچ جائے۔ چاہے تو محبوب کا جلوہ دکھائے اور صور پھونک دے، محبوب کی جھلک دکھا دے اور مرتے ہوؤں کو قبر سے کھینچ لائے۔ موڈ میں آ جائے تو سمرقند و بخارا بادشاہ سے پوچھے بغیر محبوب کے ایک تل کے بدلے ہدیہ کر دے اور بعد میں سزائیں بھگتا پھرے۔ چاہے تو محبوب کی کمریوں غائب کر دے جیسے ممبران اسمبلی سے شائستگی، دل چاہے تو محبوب کے ماتھے پر صرف ستارے ہی نہیں پورا نظام شمسی سجا دے اور چاہے تو محبوب کو باغ میں پھرا کے پھولوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دے۔ بڑے سے بڑا عالمی تنازعہ جب ایک شاعر کے سامنے آتا ہے تو وہ محض ایک شعر یا نظم میں حل ہو کر رہ جاتا ہے۔

حلیہ/ عادات

پرانے زمانے میں شاعروں کا حلیہ خاندان والوں سے کم اور نفسیاتی مریضوں سے زیادہ ملتا تھا۔ مہینوں غسل خانوں، نائی اور آئینے کا منہ نہ دیکھتے تھے جس کی وجہ سے اِن کی داڑھی، مونچھوں اور سر کے بالوں میں خطِ علیحدگی کھینچنا کار دارد ہوتا تھا۔ وہ عموماً۔۔۔ دانت خراب کرنے کیلئے پان کی خدمات حاصل کرتے تھے اور میسر ہوتی تو انگور کی بیٹی سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیا کرتے تھے۔

آج کل شاعر۔۔۔ شاعر کم اور بیوروکریٹ زیادہ لگتے ہیں اکثر گورنمنٹ سروسز کے شوقین ہوتے ہیں کہ افسری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت مشقِ سخن جاری رہے۔ یہ دانت، معدہ اور دل تباہ کرنے کے لئے سگریٹ، پائپ، کافی اور چائے کا استعمال تھوک کے حساب سے کرتے ہیں۔

معاشرتی مقام

معاشرے میں جو مقام شاعر کو حاصل ہے، اُسے معزز تو کیا، مقام بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اکثریت شاعر کو چور ڈاکو سے بھی زیادہ مشکوک سمجھتی ہے کیونکہ ان کے خیال میں چور ڈاکو پھر بھی اپنا کنبہ پالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور تو اور افلاطون نے بھی اپنی خیالی جمہوریہ Eutopia میں شاعروں کو فالتو مخلوق گردانتے ہوئے نمائندگی نہ دی۔

عمومی رویہ

شاعر عموماً ایک شریف جانور ہے۔۔۔ سوری انسان ہے اور اس کا مشقِ سخن کرنے کا عمل نہایت پُرامن ہے۔ نقصِ امن کا مسئلہ تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ شاعری سنانے پہ تُل جائے اور اُس وقت اسے شاعری سنانے سے روکنا کسی طوفان کو روکنے کی حماقت کرنے کے برابر ہے۔ یہ صورت حال اس وقت مزید گھمبیر ہو جاتی ہے جب شاعر نیا نیا ہو اور آس پاس کوئی مشاعرہ ہو اور نہ سامع۔ اس وقت اس کی حالت اس مرغی کی سی ہوتی ہے جس نے انڈہ دینا ہو اور اُسے مناسب جگہ نہ مل رہی ہو۔ اس وقت کچھ تو پتھروں کو غمِ دل سنا لیتے ہیں اور کچھ کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا

ہے۔

دماغ اور شاعری

شاعر دماغ رکھتے ہیں یا نہیں یہ قصہ بحث طلب ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ کے بغیر کوئی شاعری کیسے کر سکتا ہے جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی دماغ کے ہوتے ہوئے شاعری کیوں کرے گا۔

خوراک

شاعروں کی خوراک کے بارے میں بھی پہلوانوں کی طرح خاصی مبالغہ آرائی آمیز حکایات مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعروں کی خوراک محض "داد" ہے یعنی واہ واہ سبحان اللہ۔ اگر ایک شاعر سے آپ تین ٹائم اس کی شاعری سن کر واہ، واہ کہتے رہیں تو وہ لمبا عرصہ کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر آپ اسے دنیا جہان کی ہر چیز کھلا دیں اور داد نہ دیں تو وہ بھوکا رہے گا۔ اگر آپ کسی شاعر سے انتقام لینا چاہتے ہیں تو اکثر و بیشتر اُس کی شاعری سنتے رہا کریں لیکن اسے داد نہ دیں۔ کسی نہ کسی دن اُسے ضرور اختلاج قلب ہو جائے گا۔ ویسے ہم نے چند ایسے شاعروں کو دیکھا ہے جنہوں نے واہ واہ سبحان اللہ کی آوازوں کی کیسٹ ریکارڈ کی ہوئی ہے جنہیں وہ تنہائی میں داد کی بھوک مٹانے کے لئے سنتے ہیں۔

اقسام

دنیا میں ہر مخلوق لاتعداد اقسام میں پائی جاتی ہے شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں مزاج، انداز اور طریقہ واردات میں اختلاف کے باوجود ان کی کئی اقسام ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا حال آپ کی عبرت کے لئے دیا جا رہا ہے۔

نرا شاعر: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ سوائے شاعری کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ چونکہ اِسے اکثر و بیشتر فاقے سے لطف اندوز ہونا پڑتا ہے اِس لئے اس کی شاعری میں بلا کا سوز اور درد پایا جاتا ہے۔ یہ باآسانی کوئی بھی مشاعرہ لوٹ لیتا ہے لیکن محلے کے دوکاندار سے اُدھار تک نہیں لے سکتا۔ بعض اوقات اسے اپنی شاعری فروخت کرنی پڑتی ہے۔ اِن کی ازدواجی زندگی مرثیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ غالبؔ، اقبال ساجدؔ اور ساغرؔ صدیقی اِس قسم کے نمائندہ شاعر ہیں۔

"تم کیا کرتے ہو؟"
"بس لڑکیوں کی شادی کروا رہا ہوں۔"
"کیا کوئی میرج سینٹر۔۔۔؟"
"نہیں بھئی، تم سے بچھڑنے کے بعد سے فی سبیل اللہ یہ فرض سر انجام دے رہا ہوں۔"
"وہ کیسے؟"
"ایک کلومیٹر کے دائرے میں جو لڑکی شادی کے قابل ہوتی ہے، اُس کے ساتھ شادی کا پروگرام بنانا شروع کر دیتا ہوں اور پھر اُس کی شادی ہو جاتی ہے۔"
"میں سمجھا نہیں، پاکستانی عوام کی طرح۔"
"ارے گھامڑ، جب ہمارے چرچے ہر زبان پر پہنچتے ہیں تو اُس کے گھر والے فوراً اُس کی شادی کر دیتے ہیں۔"
"یہ چرچے تمھارے والدین تک نہیں پہنچے کہ تمھارا بھی کریا کرم کر دیتے؟"
"بالکل پہنچے، ایک دن شکایت وصول کرنے کے بعد ابو نے انتہائی جارحانہ انداز میں مجھے طلب کیا اور آہستہ سے بولے یار! لڑکی پٹائی کیسے تھی؟"
"ہیں؟ پھر کیا ہوا؟"
"میں نے کچھ جدید فارمولے اُن کو بتا دیئے۔"
"اوہ۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"
"محبوبہ نمبر ۴۵ اب ہماری دوسری ممی ہے۔"

قلم آرائیاں از خادم حسین مجاہد

عاشق کم شاعر: یہ عموماً بے روزگار ہوتے ہیں اور پارٹ ٹائم عشق سے ٹائم پاس کرتے ہیں۔ عشق کی منازل طے کرتے کرتے جب یہ رانجھے یا مجنوں کے انجام کے قریب پہنچتے ہیں تو ترقی کر کے شاعر بن جاتے ہیں۔ اِن کی شاعری عموماً بے وزن ہونے کے باوجود کلو گراموں میں ہوتی ہے۔ یہ نوکری یا چھوکریوں کے

پلے پڑنے کے بعد تائب ہو جاتے ہیں اور ادب کو بخش دیتے ہیں۔

سمگلر شاعر: عام شاعروں کی طرح سمگلر شاعروں کے بھی کئی گروہ ہیں۔ اِن کا ایک گروہ کسی انتقال شدہ گمنام شاعر کے اہلِ خانہ سے اس کی شاعری ردی کے بھاؤ خرید کر صاحب دیوان بن جاتا ہے۔ دوسرا گروپ پرانے شعراء کی تلخیص اور الٹ پھیر سے کام چلاتا ہے۔ تیسرا گروہ کسی دوسری زبان کی شاعری سے خیالات اڑا کر اپنی زبان میں باندھ لیتا ہے۔ چوتھا اور آخری گروہ کسی لمبی جھنجھٹ میں پڑے بغیر شارٹ کٹ استعمال کرتا ہے اور کسی بھی ''نرے شاعر'' سے شاعری خرید لیتا ہے۔ اچھی سے اچھی غزل پندرہ بیس روپے میں مل جاتی ہے۔ اس چوتھے گروہ میں عموماً بیورو کریٹ اور سماجی شخصیات ہوتی ہیں جو اس طریقے سے خود کو ''انٹی لیکچول'' (INTELLECTUAL) ثابت کرتے ہیں۔

عظیم شاعر: اس گروہ کی عظمت میں ان کی دولتمندی، عہدے اور پریس پروری کے علاوہ ان کے کاسہ لیسوں کے خوشامدی مضامین کا بھی دخل ہوتا ہے۔ یہ اپنے تئیں غالبؔ سے کم عظیم نہیں ہوتے اور اسی زعم میں اساتذہ کے کلام پر خصوصی شفقت فرماتے ہیں۔ وہ اُنہی کا پڑھتے اور اُنہی کا کھاتے ہیں۔ علاوہ ازاں ایسے عظیم شعراء ان خواتین شاعرات کی سرپرستی بھی فرماتے ہیں جو شاعری بیشک نہ کر سکتی ہوں لیکن شاعر بننا ضرور چاہتی ہوں۔ یہ ایسی شاعرات کے مجموعے اپنے خرچ اور مواد پر چھپوا کر اپنی عظمت کا ثبوت دیتے ہیں۔

سیاسی شاعر: اِن کے دو گروہ ساحرؔ، فیضؔ، جالبؔ اور شورشؔ جیسے شاعروں پر مشتمل ہے۔ یہ کلمۂ حق کسی جابر سلطان کے سامنے کہہ کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ عوامی ہے جو سیاسی جلسوں میں اپنا لوہا اور فولاد منواتا ہے۔ یہ کسی امیدوار یا پارٹی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے جلسوں میں اس کے قصیدے اور مخالفین کی ہجو پڑھتے ہیں، یوں یہ عوامی شہرت کے ساتھ ساتھ شاعروں کے سب گروہوں سے زیادہ کماتے ہیں۔

> درختوں کی چھاؤں اور زلفوں کی چھاؤں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ آپ درختوں کی چھاؤں میں سرِ عام بیٹھ سکتے ہیں۔
>
> قلم آرائیاں از خادم حسین مجاہد

موبائل شاعر: اِن کے بھی دو گروہ ہیں۔ پہلے گروہ والے شہر میں گلی گلی گھومتے ہیں۔ کہیں کسی شادی، منگنی، مہندی، ختنہ یا سالگرہ کی بھنک ملتی ہے تو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ عموماً معززین کا لباس زیب تن کیے ہوتے ہیں، اس لیے تقریبات میں باآسانی گھس جاتے ہیں۔ پھر مہمانوں سے باتوں باتوں میں تقریب کے مرکزی کرداروں کے نام معلوم کر کے پہلے سے تیار شدہ سہرے اور دعا اُس میں فٹ کر لیتے ہیں۔ حاضرین کی بڑی تعداد تب تک انہیں ایک معزز مہمان ہی سمجھ رہی ہوتی ہے کہ اچانک یہ بلائے ناگہانی کی طرح تقریب کے مرکزی کردار کے سر پر پہنچ کر اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں اور تمام شرکاء کا موڈ خراب کر دیتے ہیں۔ یہ تب تک چپ نہیں ہوتے جب تک پیسے یا کسی اور چیز سے ان کا منہ بند نہیں کر دیا جاتا۔ دوسرا گروہ چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کی صورت میں شاعری چھاپ کر بسوں اور تعلیمی اداروں میں گا گا کر فروخت کرتے ہیں۔

پینٹر شاعر: اکثر پینٹر شاعرانہ ذوق کے حامل ہوتے ہیں جس کا ثبوت وہ گاڑیوں کو پینٹ اور ڈیکوریٹ کرتے وقت دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر بسوں، ویگنوں اور رکشوں کے پیچھے کبھی غالبؔ یا اقبالؔ کو بغل گیر ہوتے دیکھا ہوگا تو کبھی فیضؔ اور جوشؔ کو اور کبھی ایسے ذاتی اشعار بھی پڑھے ہوں گے جن کا ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے متفق نہیں ہوتا۔ یہ سب کارنامے اور شاہکار پینٹرز کے ہوتے ہیں۔ اگر ان پینٹرز کے ہتھے کوئی ہوائی جہاز بھی چڑھ گیا تو یہ وہاں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائیں گے اور شاعری کو نیا بین الاقوامی انداز دیں گے۔ پینٹر شاعر کی اتنی خدمات کے برعکس آج تک کسی ادبی جائزے میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی ایسی عوامی شاعری پر ان کو کوئی ایوارڈ دیا گیا ہے حالانکہ یہ لوگ تو

دنیا کی تمام عورتوں سے اگر فرمائش کا عطر نکال لیں تو چاروں بِراعظم ڈوب جائیں گے۔

قلم آرائیاں از خادم حسین مجاہد

اس قابل ہیں کہ ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کرنا چاہیے، لیکن یہ صابر شاکر لوگ ان تمام حق تلفیوں کے باوجود شکوہ کناں ہوئے بغیر اپنے فرائضِ منصبی نہایت دیانتداری، محنت اور مہارت سے انجام دے رہے ہیں اور شاعری میں نت نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ایک شنید یہ بھی ہے کہ آزاد شاعری کے موجد بھی یہی لوگ ہیں۔

آزاد شاعر: یہ آزادی پسند ہوتے ہیں۔ شاعری میں بھی کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں ہوتے۔ نثری عبارتوں کو اوپر تلے مبہم انداز میں لکھ کر آزاد شاعری کا نام دیتے ہیں اور لہو لگا کر شہیدوں میں ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن کو بھی ابھی تک باقاعدہ شاعر تسلیم نہیں کیا گیا۔ بعض غضبناک بزرگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آزاد شاعری کرنے کا حق صرف اور صرف پابند شاعری کرنے والوں کو ہونا چاہیے، لیکن ان کے غضب کے باوجود مارکیٹ آزاد شاعری کے مجموعوں سے بھری پڑی ہے اور کوئی طوفان نہیں ٹوٹا۔ جہاں تک سیل کی بات ہے تو یہ بھی پابند شاعری کی طرح ردی میں سیل ہو رہی ہے۔ یوں نتیجے کے لحاظ سے ان میں زیادہ فرق نہیں۔

فوائد

''نہیں ہے نکمّی کوئی چیز زمانے میں'' کے مصداق شاعروں کے بھی کچھ فوائد ہیں۔

☆ شاعر کے حال سے کسی بھی وقت ٹٹوں کے حساب سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆ شاعری سننے کے وعدے پر شاعر سے ہر کام کرا سکتے ہیں۔

☆ ضرورت کے وقت ان سے اپنی محبوبہ کا قصیدہ لکھوا کر اپنے درجات بلند کیے جاسکتے ہیں۔

☆ شادی کے مواقع پر سہرا لکھوایا جا سکتا ہے اور بیگم کے مرنے پر قطعۂ تاریخِ وفات بھی لکھوا کر لوحِ مزار سجائی جاسکتی ہے۔

☆ شاعر کی موجودگی میں گھر میں چوکیدار کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔

☆ شاعر گھر پر ہو تو کسی بھی وقت اس کے ردی جلا کر اور بیچ کر ہاتھ اور جیب گرم کیے جاسکتے ہیں۔

☆ کسی بھی دشمن پر شاعر کو مسلّط کر کے اس سے بدلہ لے سکتے ہیں۔

☆ شاعروں کو تار چر سیلوں پر ملازمت دینے سے کم وقت میں آسانی سے مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

☆ ایک شاعر کو دوست بنا کر سب دوستوں پر رعب رکھا جا سکتا ہے۔

☆ ضخیم شعری دیوان اچھے ہتھیار کا کام دے سکتا ہے۔

نقصانات

☆ یہ گھر یا گھر سے باہر کا کوئی عملی کام نہ کر سکنے کے باعث والدین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

☆ ان کے اشعار بعض اوقات خاندان کی لڑائی کا باعث بنتے ہیں۔

☆ شاعر کے رات دیر تلک جاگنے سے محلے والے مشکوک ہو جاتے ہیں۔

☆ شاعر جہاں بھی رہتا ہے کباڑ خانہ قائم کر دیتا ہے۔

☆ گھر میں موجود کوئی بھی صاف کاغذ، حساب کتاب کی کاپیاں حتیٰ کہ ٹوائلٹ کی دیواریں اور بستر کی چادریں بھی اس کے مشقِ سخن سے محفوظ نہیں ہوتیں

☆ شاعر اور اس کے دوستوں کو چائے پلا پلا کر گھر کا بجٹ غیر متوازن ہو جاتا ہے۔

☆ شاعر زیادہ تر تنگ دست رہتے ہیں اس لئے اوّل تو کوئی لڑکی ان سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی اور اگر شادی ہو جائے تو تمام عمر روتی ہے

☆ اگر آپ کے حلقۂ احباب میں کوئی شاعر ہے تو آپ کا موڈ ہو یا نہ ہو اس کی شاعری سے محظوظ ہونا پڑے گا۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ